امام الہند

صدی جلد چہارم
انتخابات مضامین
مولانا ابوالکلام آزاد

امام الہند

ابوالکلام آزاد

مرتبہ

سیدہ سیدین حمید

معاون

صغرا مہدی

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز
وکاس پبلشنگ ہاؤس پرائیوٹ لمیٹڈ



Maulana Abul Kalam Azad at the age of sixteen in 1904.

اظہار تشکر

میں اپنے ان سب دوستوں اور ساتھیوں کی ممنون ہوں، جنھوں نے ان جلدوں کی تیاری میں میری مدد کی۔

میں شکر گزار ہوں، جناب محمد یونس کی جنھوں نے سب سے پہلے مجھ میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ میں اس بڑے اور اہم کام کو کر سکتی ہوں۔ جناب شاردا پرشاد نے ہر قدم پر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں موصوف کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

مشہور ادیب اور محقق اور ادیب جناب مالک رام جنھوں نے مولانا کی متعدد اہم تصانیف کو ایڈٹ کیا ہے، کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی کہ اس کام میں سب سے زیادہ رہنمائی ہمیں آپ ہی سے ملی۔

اردو جلد کے سلسلے میں جناب شاہد علی خاں جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے جو مدد کی اور گرانقدر مشورے دیے اس کے لیے میں ان کی ممنون ہوں۔

میں پروفیسر مجیب رضوی کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی بیحد مصروفیات کے باوجود جلد سوم (ہندی) کے معاون ایڈیٹر کی ذمہ داری قبول کی اور ہر ممکن تعاون دیا۔ میں ڈاکٹر صغرا مہدی کی مشکور ہوں جو اردو جلد کی ترتیب میں معاون رہیں۔

جناب ریحان عباسی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے کہ انھوں نے اردو جلد کی پروف ریڈنگ کی ذمہ داری قبول کر لی اور کتاب کی تیاری میں ہر ممکن مدد کی۔

اپنے اس کام کے دوران مجھے آئی سی سی آر کے لوگوں کے درمیان رہنے کا موقع ملا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ سب قابل، مستعد اور دوست نواز لوگ ہیں۔ فرداً فرداً میں ان سب کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

امام الہند

پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰

وینا سیکری، ڈائرکٹر جنرل انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، آزاد بھون، اندر پرستھ اسٹیٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ نے وکاس پبلشنگ ہاؤس پرائیویٹ لمیٹڈ، ۵۷۶ مسجد روڈ،
جنگ پورہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴ کے اشتراک سے شائع کی۔

سرورق : پریم ناتھ
کتابت : محمد ذکیر الدین ذکی

ISBN 81 - 85434 - 00 - X (SET)
81 - 85434 - 04 - 2 (VOL.IV)

ہندوستان میں NU - TECH فوٹو لیتھو گرافرس، شاہدرہ، دہلی ۳۲ میں طبع ہوئی

مجلس ادارت

میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں اس پُرجوش تعاون کے لیے محترمہ وینا سیکری ڈائرکٹر جنرل آئی سی سی آر کا شکریہ ادا کروں۔

میں اشوک شری نواسن کا کیسے شکریہ ادا کرسکتی ہوں، جو پہلے دن سے آخر تک میری ہر مدد کو تیار رہے اور جن کی مدد کے بغیر یہ کام ہونا بہت مشکل تھا۔

میں مشکور ہوں جناب ادیپ مدان کی جنھوں نے اس مسودے کی تیاری میں بیحد مدد کی۔

میں آزاد بھون کی لائبریری کے سب اراکین کی ممنون ہوں جن کی مدد سے میں یہ کام کرسکی۔ ان جلدوں کی تیاری کے لیے جس مواد کی ضرورت ہوئی ان حضرات نے مستعدی سے مجھے فراہم کیا۔ خاص طور سے چیف لائبریرین جناب گلزار نقوی اور ان کے رفیق کار جناب منیر احمد اور محترمہ پاکیزہ سلطان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان حضرات نے میری ہر طرح مدد کی۔ میں محترمہ امر جیت کی ممنون ہوں کہ وہ بیحد مستعدی اور خوش مزاجی سے دفتری کاموں میں میری مددگار رہیں۔

اور سب سے آخر میں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ذکر کروں اپنے مرحوم شوہر ڈاکٹر سید محمد عبدالحمید کا، جن کی حوصلہ افزائی کی بدولت میں یہ بڑا کام شروع کرسکی۔

میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنا چاہتی ہوں اپنے مرحوم والد خواجہ غلام السیّدین کی یاد کو جنھوں نے بچپن ہی میں میرا تعارف مولانا صاحب سے کرایا۔ میرے دل میں ان کی محبّت اور عقیدت پیدا کی اور جس کے اظہار کا موقع مجھے برسوں بعد اس کام کو کر کے ملا۔

صدر جمہوریۂ ہند آر وینکٹا رمن کا پیغام

सत्यमेव जयते
राष्ट्रपति
भारत गणतंत्र
PRESIDENT
REPUBLIC OF INDIA

یہ بہت اچھی بات ہے کہ مولانا آزاد کی پیدائش کی صدی کے موقع پر علماء کے مضامین کا مجموعہ بطور ہدیۂ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ مولانا کی تحریروں اور تقریروں کا انتخاب بیک وقت اردو، انگریزی اور ہندی میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انتخاب بنیادی طور پر اس تحریک سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ہوگا جس کا تعلق ہماری آزادی سے ہے اور جس کی گواہ انیسویں اور بیسویں صدیاں ہیں۔

گاندھی جی کی قیادت میں جدوجہد آزادی میں بہت سے بڑے لوگ شامل تھے، ان میں سے ہر شخص، ہر عورت و مرد نے اپنی بہترین صلاحیتوں اور شخصیت سے اس تحریک کو تقویت دی، کسی میں تنظیمی صلاحیت تھی تو کسی میں علمی صلاحیت اور کسی نے پورے خلوص سے خود کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا، مگر مولانا صاحب کی شخصیت میں دل و دماغ کا حسین امتزاج تھا۔ ان میں تخلیقی قوت تھی جو ایک طرف دانشوری سے اثر پذیر ہوتی تھی دوسری طرف جذبات سے اس کے ساتھ دماغ کے اشارے اور ضمیر کی آواز پر خود کو مقصد کے لیے وقف کر دینے کا جذبہ بھی۔

مولانا خلوص دل سے ہندوستان کو ایک قوم ہی نہیں ایک تہذیب تصور کرتے تھے، تاریخ کے مطالعہ سے ان کا ذہنی افق وسیع ہوا تھا اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ نے ان میں وسعتِ نظر پیدا کر دی تھی اور ان کی مدد سے انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد طے کر لیا تھا۔

لڑکپن ہی سے وہ غیر معمولی مطالعہ کے شوقین تھے، ابھی وہ نوعمر لڑکے ہی تھے کہ عالمانہ مضامین لکھنے لگے تھے اور بحیثیت مصنّف مشہور ہو گئے تھے۔ اور سولہ برس کی عمر میں ان مستقبل کے مولانا نے اسلامی تعلیمات کا نصاب مکمل کر لیا تھا۔

مولانا صاحب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان کی عظیم وراثت اس کی مشترکہ تہذیب ہے اور مستقبل میں بھی اسے اپنی اسی خصوصیت کے ساتھ ترقی پسند قوم کی حیثیت سے رہنا ہے۔ اور ان کی نظر میں یہ کمی بھی تھی کہ ہندوستان کی بڑی قوموں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے۔

مولانا کو لاتعداد مصیبتوں، قید و بند کی صعوبتوں اور حکومت کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر ان تکلیفوں سے مولانا کی قومی خدمت کی لگن اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ دینے کے جذبے میں شدّت پیدا ہو گئی۔

گاندھی جی کی جوہر شناس نگاہ نے یہ پہچان لیا کہ جس مقصد کی خاطر وہ لڑ رہے ہیں، اس میں مولانا ان کے بہترین مددگار ہوں گے۔ اور مولانا نے بھی یہ دیکھ لیا کہ اس وقت حالات کے چیلنج کو صرف گاندھی جی ہی قبول کر سکتے ہیں، اور وہ مہاتما جی کے ساتھ آئے اور ایسے ساتھ آئے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایک پیش قدمی کے بعد دوسری پیش قدمی ایک معرکے کے بعد دوسرا معرکہ، ہر جگہ مولانا گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کا ساتھ سنگم تھا گنگا کی قوت اور دریائے سندھ کے تیز بہاؤ کا، گیتا کی گہرائی اور قرآن کی طاقت کا۔

جب انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کا بوجھ مولانا پر پڑا تو اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔ اور یہ اس کا ثبوت تھا کہ ہندوستان کے سب طبقوں کے لوگوں کو ان پر کس قدر اعتماد تھا، ہندوستان جہاں مختلف مذہبوں اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں، وہاں مولانا کی آواز ہندوستان کے مشترکہ مفاد کی مستند آواز مانی جاتی تھی کہ رواداری ان کو ورثے میں ملی تھی، اس لیے ان کے دل میں سب مذہبوں اور سب عقیدوں کا احترام تھا۔

جب مولانا انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے اس میں ایک نئی روح پھونکی جب کہ یہ وہ نازک دور تھا جب ایک طرف جنگ چھڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف "ہندوستان چھوڑو" کی تحریک زوروں پر تھی۔

"ہندوستان چھوڑو" کے تاریخی رزلیوشن کے بعد گاندھی جی کو گرفتار کرکے پونا لے جایا گیا۔ مولانا صاحب جو کانگریس کے صدر تھے، ان کو اور پوری ورکنگ کمیٹی کو گرفتار کرکے

خدا پر کامل عقیدت اور اپنے ملک پر فخر و ناز کے احساس نے ان کے جذبۂ حب الوطنی کو تقویت بخشی، سول نافرمانی اور حکومت کے بائیکاٹ کے جو دوسرے طریقے تھے وہ ان کو پسند آ گئے۔ اپنے برادرانِ اسلام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہفتہ وار اخبار "الہلال" نکالا۔ تنگ نظر لوگوں نے ان کے متحدہ ہندوستانی نیشنلزم کے تصور کو ناپسند کیا مگر وسیع نظر دور اندیش لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

"الہلال" نے بیک وقت دو پیام دیے، اسلام اور وطن کی آزادی۔ وطن کی محبت کو مولانا نے ایک مذہبی فریضہ قرار دیا جس میں سنسکرت کے اس غیر فانی مقولے کی آواز سنائی دیتی ہے:

"ماں اور مادرِ وطن جنت سے افضل ہیں۔"

مولانا کی ہمت و جرأت ان کے علم و فضل سے کسی طرح کم نہیں تھی، جسے قوم نے مانا اور سراہا۔ ان کی شخصیت ہی ہر جہت اعلیٰ اور برتر تھی۔ مولانا نے جو رول ادا کیا ہے اس کو ان کے نامور ہم عصر آچاریہ کرپلانی نے یوں بیان کیا ہے: "وہ ایک مذہبی عالم تھے، اگر وہ اپنی روحانی وراثت کے ساتھ صرف اسی میدان میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھاتے تو ان کا شمار صفِ اوّل کے مذہبی علماء میں ہوتا، وہ بہترین مقرر تھے، اسی کو اپنا میدان بناتے تو قوم ان کو بہترین مقرروں میں گنتی، وہ ایک بڑے عالم تھے اگر وہ اپنی پوری زندگی علمی کاموں میں صرف کرتے تو وہ عالموں کے سرتاج ہوتے۔ مگر ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا کہ ان کی مذہبیت، فلسفہ، تاریخ اور علم و ادب کی کیا قدر و قیمت ہے اگر ملک آزاد نہ ہو۔"

اس لیے مولانا نے خود کو اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ تحریکِ آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی دور بین نگاہ آزادی کے بعد کے حالات پر بھی تھی۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ آزادی تو دیر سویر مل جائے گی مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس ملک کے سب لوگ متحد ہو کر اس کو مستحکم بنائیں۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہمیں آزادی کا بہت کم فائدہ ہوگا اگر ہم میں آپس میں اتحاد نہیں ہوگا۔ مولانا صاحب نے کسی موقع پر کہا تھا "اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو بدی کا پردہ فاش کرو، اگر تم خدا کی خوشنودی چاہتے ہو، تو شیطان کو ناخوش کرنے سے نہ ڈرو۔"

۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پاکستان کے قیام کو مان لیا گیا تھا، مولانا نے کہا تھا "یہ سیاسی شکست تو ہم ماننے پر مجبور ہیں مگر ہم کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہماری تہذیب کا بٹوارہ نہیں ہوا ہے"۔ گاندھی جی کی طرح مولانا صاحب نے بھی تقسیم ہند کو کبھی قبول نہیں کیا۔ تقسیم کے بعد انھوں نے نہ جناح کو برا بھلا کہا نہ ان کے ساتھیوں کو، جو امر ناگزیر تھا اس کے آگے وقار سے اپنا سر جھکا دیا۔ انھوں نے کہا تھا "جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو گیا مگر اب ہمیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے"۔

جب آزاد ہندوستان کی حکومت کا بوجھ جواہر لال نہرو کے کاندھوں پر آپڑا تو مولانا صاحب ان کے رفیقِ کار ہو گئے۔ نئی حکومت کی ترقی پسند پالیسیوں کو بنانے اور ان کے نفاذ میں وہ نہرو کے معتمد رفیق تھے۔ ان کو وزارتِ تعلیم کا عہدہ ملا، جس پر وہ اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک رہے۔ ان کے زمانے میں وزارت تعلیم نے کئی میدانوں میں رہنمائی کی۔ انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں یہ بتایا کہ تعلیم محض کتابی علم کا نام نہیں ہے۔ اس زمانے میں سائنٹیفک اور ٹیکنیکل ایجوکیشن، ٹیچرز ٹریننگ اور زبان کو پڑھانے کی ٹریننگ، شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبیلوں کے لیے اسکالرشپ کا سلسلہ شروع ہوا۔ پسماندہ طبقوں کی ترقی کی مختلف اسکیمیں مولانا ہی کے سامنے بھی شروع ہوئیں۔ اگرچہ مولانا نے اس اصطلاح کو خود کبھی استعمال نہیں کیا مگر انھوں نے وزارت تعلیم کی کچھ اسی طرح تنظیم کی تھی کہ حکومت ہند کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ کا ذریعہ ہونا چاہیے۔

خوش قسمتی سے جن لوگوں کو مولانا کے زمانے میں وزارتِ تعلیم کو دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس فضا کو اب بھی یاد کرتے ہیں، اس زمانے میں مولانا کی دانشورانہ فکر کا افق وسیع رہا ان کے زمانے میں کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کو تسلیم کیا گیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ دوسرے اور معلمین ڈاکٹر رادھا کرشنن اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر انھوں نے ادب آرٹ اور میوزک کی مشہور اکیڈمیوں کے قیام کا منصوبہ بنایا، انھیں قائم کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی۔

ابتدا سے مولانا کی تربیت اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ سب مذاہب کی خوبیوں پر

قلعۂ احمد نگر میں قید کر دیا گیا۔

قید خانے کی تاریکی میں ان کے انقلابی جوش نے ان کی علم و فضل کی شمع کو روشن کر دیا اور اسیری کے دوران، مولانا صاحب یا تو مطالعہ میں غرق رہتے یا پھر تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ جواہر لال جی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ ان دنوں اپنی مشہور تصنیف "تلاشِ ہند" کے مسودے پر کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں خاص طور سے مغلیہ تاریخ کے بارے میں وہ مولانا سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔

اسی دوران مولانا کی اہلیہ زلیخا بیگم سخت علیل ہوئیں۔ ایک دن جیل کے سپرنٹنڈینٹ نے مولانا کو تار دیا جس میں ان کی رفیقۂ حیات کے انتقال کی خبر تھی۔ اس تار کو پا کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی اس کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے "میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔" اس کے بعد مولانا قریب ایک سال جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد جب وہ کلکتہ پہنچے تو ایک بڑا مجمع ان کے استقبال کو موجود تھا، کار کے ساتھ ان کے عقیدت مند چل رہے تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "تین سال پہلے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی روانہ ہو رہا تھا، میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھی اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا، مگر وہ قبر کی آغوش میں تھی اور میرا گھر خالی تھا مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا ؎

مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے ہائے
میری دنیا کیسی بدل گئی ہے

اس عبارت میں شاہجہاں اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا سا جذبات انگیز شاعرانہ بیان ہے۔

مولانا صاحب محمد علی جناح کے سیاسی فلسفے اور تقسیم ہند کے مخالف تھے، اس کا اظہار وہ بہت صاف گوئی اور بے باکی سے کرتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان میں سیکولرزم کے وجود کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ تقسیم ہند ان کے لیے ایک شکست تھی، جس کو روکنے کے لیے وہ اس پر بھی تیار تھے کہ ملک کی آزادی کچھ دنوں کو ملتوی ہو جائے۔

فہرست

ان کی نظر تھی اور وہ ان سب کا احترام کرتے تھے اسی لیے وہ بین الاقوامی مفاہمت اور امن عالم کے زبردست حامی تھے۔ ان کے بین الاقوامی نظریہ کا سب سے بڑا ثبوت انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز ہے۔ جس کے وہ بانی بھی تھے اور پہلے صدر بھی۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا صاحب کی وفات پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا اُنھوں نے ذہن کی آزادی کی ہمیشہ حمایت کی، وہ ذہن جو نسل، زبان، بولی، ذات پات اور مذہب کے تعصّبات سے آزاد ہو۔ مولانا صاحب تربیت یافتہ مہذّب دماغ کے مالک تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جیسی دوسری ہستی ملنا مشکل ہے۔ عظیم اور پُرجلال شخصیت۔ وہ ارادے کے اٹل اور بے خوف تھے۔

خدا کرے مولانا آزاد صدی کے موقع پر یہ یادگار صحیفہ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اور اُجاگر کرے اور ہماری قوم، تہذیب اور سوسائٹی اس سے فیض حاصل کرے۔

R.VENKATARAMAN

April 26, 1989

مقدمہ

ایسی اہم شخصیتوں کی تصانیف کا انتخاب کرنا بہت کٹھن کام ہے جن کی تصانیف نے ملک کی تاریخ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو۔ جنگِ آزادی میں مولانا صاحب کی حیثیت مرکزی تھی۔ ان کی شعلہ بار تحریروں اور تقریروں نے جو ان کی اصابت رائے کا مظہر بھی ہیں، لوگوں کو مسحور کر لیا تھا۔ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں مولانا کی تصانیف بہت کم ہیں۔ تعداد میں کم ہیں مگر ان کی تحریریں علمیت، بصیرت اور مقصدیت کا خوبصورت سنگم ہیں۔ مولانا کو کم سے کم لفظوں میں مکمل اظہار پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ کم لفظوں میں زیادہ معلومات بہم پہنچانے کا گر بھی جانتے تھے۔ ان کی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ہم ان میں سے کیا شامل کریں اور کیا چھوڑ دیں۔ ایک طرف ہمیں اپنی نارسائی کا احساس تھا دوسری طرف یہ فکر کہ اس اہم ذمہ داری سے صحیح طور پر کس طرح عہدہ برآ ہوں۔ مولانا کی تحریروں کا ایک ایسا انتخاب کرنا جو تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہو اور وہ بھی اس طرح کہ ان میں مولانا کی تمام تصانیف کا نچوڑ ہو، ایسا ہی تھا جیسے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ ہم نے پہلے تو ان کی تمام تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ ان میں ان کی تقریریں بھی شامل ہیں۔[1] پھر ہم نے ان تحریروں کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ہم نے "شاندار ابتدا" رکھا ہے۔ اس میں صحافیانہ تحریریں ہیں۔ ۱۸۹۹ء سے (جب انھوں نے اپنا پہلا اخبار "نیرنگ عالم" نکالا تھا) ۱۹۱۶ میں الہلال پریس کے ضبط ہونے تک۔ اس میں کچھ فلسفیانہ، سیاسی اور ادبی تحریریں بھی ہیں۔ اس

۱؎ افسوس کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کا کوئی مکمل شائع شدہ سیٹ نہیں ہے۔

مولانا کی ہر طرز کی تحریر کا انتخاب کرنا آسان کام نہیں تھا مولانا کی سب تصانیف نثر میں ہیں اگرچہ اوائل عمر میں انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ مگر مولانا اسے اپنی نوعمری کا شوق کہتے تھے اور کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کچھ تحریریں اس انتخاب میں اس لیے شامل کی گئی ہیں کہ وہ زندہ جاوید ہیں اور ہر زمانے میں یکساں معنویت رکھتی ہیں، مثال کے طور پر "قول فیصل" لے لیجیے۔ یہ وہ تحریری بیان ہے جو مولانا نے ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کی عدالت میں پیش کیا تھا، جب ان کو انڈین نیشنل کانگریس کے ترپن۵۳ سالہ اجلاس میں صدارتی خطبہ دینے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا یہ رام گڑھ کی تقریر کے نام سے مشہور ہے۔ یا ان کی وہ تحریر جو انھوں نے اپنی بیوی کی موت پر ۱۹۴۲ء میں قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران لکھی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی ہر تحریر ادبی، تاریخی، سیاسی اور فلسفیانہ اہمیت کی حامل ہے بغیر کسی استثنا کے سب لوگ ان سے واقف ہیں، خاص طور سے اردو داں طبقہ۔ ان میں سے کچھ کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ مگر ابھی بہت سی ایسی تحریریں ہیں جن کو صرف محدود تعداد میں لوگ پڑھ سکتے ہیں۔

یہ انتخاب کیونکہ مولانا آزاد صدی کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے اس لیے ہم نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ اس میں مولانا کی زیادہ سے زیادہ مشہور اور نمائندہ تحریریں آجائیں۔ کہیں کہیں ہم نے یہ بھی کیا ہے کہ کسی طویل تحریر سے ایک اقتباس لے لیا ہے اور اس کو فٹ نوٹ کے ساتھ اس میں شامل کر لیا ہے تاکہ اس مخصوص موضوع پر مولانا کے خیالات معلوم ہو سکیں۔ مثال کے طور پر "غبارِ خاطر" سے ہم نے ایک عبارت لی ہے جو بظاہر دو غیر متعلق چیزوں کے بارے میں ہے یعنی چائے اور قید خانے کی زندگی۔ مولانا نے "خوشی" سے ان دونوں میں ربط پیدا کیا ہے، وہ جو ان دونوں سے حاصل کرتے تھے۔ اس سے مولانا کی شخصیت کے غیر معمولی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" میں مارک انتونی اپنی تقریر میں اس وقت کہتا ہے جب بروٹس مرا پڑا ہے " وہ ایک شریف النفس انسان تھا اور اس میں مختلف قسم کے عناصر اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ قدرت اس کے حضور میں کھڑے ہو کر پوری دنیا سے یہ کہہ سکتی ہے کہ دیکھو انسان یہ تھا،" اور یہ بات مولانا پر بھی صادق آتی ہے۔ جہاں تک پہلی صفت شریف النفسی کا تعلق ہے اس کا تعلق ان کی شخصیت سے ہے اور مختلف عناصر کے

زمانے میں مولانا نے متعدد رسالوں کی ادارت بھی کی جس میں الہلال سب سے مشہور ہے۔
دوسرے حصّے کا عنوان "عروج کے سال" رکھا ہے۔ اس میں مذہبی، سیاسی اور ادبی تحریریں ہیں۔ یہ تینوں دہائیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۷ء یعنی آزادی تک۔ اس میں ان کی مذہبی اور ادبی تحریریں ہیں۔ تیسرے حصّے کا عنوان ہے "خلاصہ"، جو آزادی کے بعد سے ان کی زندگی کے آخری دہے تک کا احاطہ کرتا ہے اس میں ان کی سرکاری تقریریں بھی شامل ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کی نوعیت سرکاری ہے ان میں زیادہ تر ایسی ہیں جو تعلیم، سائنس اور ثقافت کے موضوعات پر سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے بعد کے تین چھوٹے حصّوں میں مولانا کی خاص تحریریں اور متعلقہ مواد شامل ہے۔ جبکہ چوتھے میں خطوط اور تار وغیرہ، پانچویں میں زندگی کے تاریخ وار واقعات اور چھٹے میں کتابیات ہے۔

ان تحریروں کو سیاسی، مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ عنوانات کے تحت تقسیم کرتے میں ایڈیٹنگ کی ضرورتوں کے تحت کہیں کہیں ہم نے بے قاعدگی برتی ہے۔ اس لیے کہ مولانا کی تصانیف کو کسی ایک مخصوص عنوان کے تحت رکھنے میں کچھ قباحتیں تھیں۔ مثال کے طور پر ان کا وہ مضمون جو الہلال میں "جہاد فی سبیل اللہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کو مذہبی بھی کہا جاسکتا ہے، سیاسی اور ادبی بھی۔ دوسری تصنیف جو خالصتاً مذہبی ہے، ایک مستند ادبی شاہکار بھی ہے۔ ترجمان القرآن کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے کے آخر میں مولانا نے ایک فارسی شعر لکھا ہے جو اطاعت کی راہ کے بارے میں ہے اور عقیدے کے حصول کے لیے رہنمائی کرتا ہے وہ شعر یہ ہے ۔

چند آنکہ دست و پا، زدم آشفتہ تر شدم ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

اس تحریر کو مذہبی کہیں یا سیاسی یا پھر دونوں کا مجموعہ؟ بس اس سلسلے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مولانا کے طرح طرح کے طرز اظہار کی تخلیقیت کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا ہے۔ اس کے پیش نظر ہم نے جس تحریر میں جو غالب خصوصیات دیکھیں ان کو اسی عنوان کے تحت رکھ دیا۔ اس سے زیادہ مشکل سوال یہ تھا کہ ہم مولانا کی کن تحریروں کا انتخاب کریں؟

ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیے ہیں آؤ آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن کے صفحوں میں تلاش کریں۔"[1]

اپنی ساری تصانیف میں مولانا سب سے زیادہ اہمیت سورہ فاتحہ کی تفسیر کو دیتے تھے، جس سورۃ سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے یہ سات آیات پر مشتمل ہے چونکہ اس میں اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ ہے، اس لیے ہم نے سورۂ فاتحہ کے مقدمہ کو بھی اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ جو ابتدا ہی میں ہے۔ ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا آخری حصّہ بھی لے لیا ہے۔ ترجمان القرآن کے پہلے ایڈیشن کا مقدمہ بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن کا ترجمہ کرتے کے دوران، مولانا کو جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی تفصیل کو پڑھ کر مولانا کی مستند سوانح عمریوں سے زیادہ بہتر طور پر ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد کا دور خالصتاً سیاسی تقریروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہم نے سب سے پہلا اقتباس "قولِ فیصل" سے لیا ہے، جس کی تعریف مہاتما گاندھی نے ۲۳ فروری ۱۹۲۲ء میں "ینگ انڈیا" میں ان الفاظ میں کی تھی۔

"یہ فصیح و بلیغ خطبہ ہے جس میں مولانا نے بہت خوبی سے خلافت اور نیشنلزم پر اپنے نظریات بیان کیے ہیں اس کو لکھنے کے جرم میں وہ عمر قید با مشقت کے یقیناً مستحق ہیں۔"[2]

اپنے خلاف مقدمے کی کارروائی میں مولانا خود حصّہ نہیں لے سکے تھے مگر اپنی عادت کے عین مطابق انھوں نے ایک بیان دیا جو پورے تیس فل اسکیپ قریب قریب ٹائپ کیے ہوئے صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس بیان کے آخر میں مولانا نے براہِ راست مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے کہا تھا "مسٹر مجسٹریٹ! اب اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا دلچسپ اور عبرت خیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں، ہمارے حصے میں

---

[1] ترجمان القرآن کے پہلے ایڈیشن کا مقدمہ

[2] مہادیو ڈیسائی "مولانا ابوالکلام آزاد" ۱۹۴۰ء

ایک جگہ جمع ہونے کا تعلق ان کی تحریر و تقریر سے ہے۔ اور انھی مختلف طرزوں کو ہم نے اس انتخاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے تین مضامین وہ ہیں جو ان کی نوعمری کی تحریروں کی نمائندگی کرتے ہیں اور بلند آہنگ نثر کا نمونہ ہیں جن میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ ان تحریروں کا مقصد لوگوں کو ان کے قومی فرض کا احساس دلانا ہے اور اُسے پورا کرنے کے لیے اکسانا تھا جو مولانا کے نزدیک قومی فریضے کے ساتھ مذہبی فریضہ بھی تھا۔ ان تینوں تحریروں "الہلال کے مقاصد" "آزادی کے لیے جہاد" "اسلام اور نیشنلزم" میں بھی مذکورہ باتیں نمایاں ہیں۔

دوسرا یعنی سیاسی دور اور مذہبی دور اس میں ان کی بہت اہم تحریریں شامل ہیں اسی دور میں انھوں نے قرآن شریف کا عالمانہ اور مفکرانہ ترجمہ کیا ہے جو ان کی اس دور کی تحریروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

مولانا نے اس کام کو کرنے میں اپنی زندگی کے پندرہ سال صَرف کیے۔ یہ زمانہ اس کڑی آزمایش سے عبارت ہے جس سے ایک محبّ وطن عالم کو گزرنا پڑا۔ جس کو بیک وقت وہ دونوں کام انجام دینا تھے جن میں سے ایک کے لیے یکسوئی اور گوشۂ تنہائی درکار تھا اور دوسرے کے لیے میدان جنگ کی ہنگامہ خیزی[1]۔ مولانا نے قرآن شریف پر تین رسالے لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلے رسالے میں وہ قرآن شریف کا ترجمہ اور اس کی ایسی تفسیر چاہتے تھے کہ جو لوگ بغیر کسی دخل اندازی کے خود سمجھ لیں۔ دوسرے رسالے میں وہ قرآن کی مدلّل اور مفصل تفسیر چاہتے تھے۔ اور تیسرے رسالے میں وہ مقدمۂ تفسیر جس میں وہ قرآن شریف کے مقاصد اور اصولوں سے بحث کرنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مولانا کو یہ رسالے الگ الگ لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی ایک کتاب ترجمان القرآن کے نام سے شائع ہوئی جو مذکورہ بالا تینوں رسالوں کا خلاصہ تھا۔ اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں "اب اگر چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل اور نوعیت میں دیکھیں تو

---

[1] سید عبداللطیف "AN UNFINISHED MASTER PIECE" ابوالکلام میموریل، مرتبہ: ہمایوں کبیر

دماغی لعنت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمّت کا نام تقدیر ہے[1]"۔

مولانا کی اس دور کی تحریروں اور تقریروں میں ایک چھوٹا سا مضمون بھی ہے "مہاتما گاندھی کی اٹھترویں سالگرہ پر"۔ اصل میں یہ ایک تقریر ہے جو ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوئی تھی۔ یہ پہلی بار شائع ہو رہی ہے اور ٹیپ سُن کر لکھی گئی ہے۔ اس موقع پر اُن کی آواز میں درد و غم کی جو کیفیت ہے اس نے اِسے اور بھی پُر اثر بنا دیا ہے۔ اسی طرح اگر ان کی طویل تقریروں کو بھی ریکارڈ کر لیا جاتا تو ان کی شخصیت کے نہ جانے کتنے اور پہلو ہمارے سامنے آتے۔ مندرجہ ذیل عبارت میں جو تلخی ہے وہ مولانا کی آخری زمانے کی تقریروں اور تحریروں کی خصوصیت ہے۔ "پنجاب میں پانچ دریا پانی کے ہزاروں برس سے بہہ رہے تھے اب ایک چھٹا دریا انسان کے گرم گرم خون کا بھی بہنے لگا ہے۔ پانی کے دریاؤں پر ہم نے اینٹ، پتھر اور لوہے کے پل بنا دیے تھے۔ چھٹے دریا کا پُل اب انسانی لاشوں سے چُنا جا رہا ہے"[2]۔ مولانا کی ادبی تحریروں میں ہم نے چار تحریریں شامل کی ہیں۔ تین "غبارِ خاطر" سے اور ایک "تذکرہ" سے۔ غبارِ خاطر اردو میں ادبی نثر کا شاہکار مانا جاتا ہے یہ وہ گنجینہ ہے جس میں ادبی جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں۔ اس میں زبان و ادب کی خوبیاں ہیں اور مختلف اسالیبِ بیان کو برتا گیا ہے۔ اس میں سے تین اقتباسات لیے گئے ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جو انھوں نے اپنی بیوی کی علالت اور انتقال پر لکھا ہے۔ دوسرا "موسیقی" پر اور ایک اقتباس ہے "چائے سے لطف اندوزی اور قید خانے کی زندگی" پر۔ پہلے اقتباس سے مولانا کی نزاکتِ احساس، نیز ذاتی غم کے اظہار میں وہ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ "اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی، ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے"[3]۔ دوسرے مضمون میں مولانا نے موسیقی سے

---

[1] خطبہ جامع مسجد
[2] ریڈیو کی تقریر، ۱۹۴۷ء آئی سی سی آر، آزاد بھون
[3] غبارِ خاطر صفحہ ۲۴۱، ساہتیہ اکیڈمی

یہ مجرموں کا کٹہرہ ہے اور تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے یہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں مؤرخ ہمارے انتظار میں ہیں اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو، ابھی کچھ دنوں یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے، یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے وقت اس کا جج ہے یہ فیصلہ وہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔"[1] دوسرے دور میں ان کی تین مشہور تقریریں شامل ہیں، دو تو وہ ہیں جو مولانا نے بحیثیت کانگریس کے صدر اس کے اجلاس عام میں دہلی میں ۱۹۲۳ء اور رام گڑھ میں ۱۹۴۰ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مسلمانوں کے مجمع میں کی تھیں۔ مولانا کی اس زمانے کی تقریریں بہترین خطابت کا نمونہ ہیں۔ ضروری معلومات اور دلائل کے ساتھ ان کا خطاب اپنے ہم وطنوں ہندو و مسلمان سے ہے کہ وہ اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف ہو جائیں۔ دہلی اور رام گڑھ کی تقریریں مولانا کے اس جہاد کی جو وہ زندگی بھر کرتے رہے بہترین مثال ہیں۔

اس کے بہت دنوں بعد انھوں نے جامع مسجد میں جو تقریر کی ہے اس کے انداز میں بدلے ہوئے وقت کا عکس صاف نظر آتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ذاتی غم، مایوسی اور ناامیدی کے جذبوں پر قابو پاکر ان سیکڑوں ہزاروں بے گھر، بے در لوگوں کی ہمت بندھائی جو یکایک اپنی سیاسی شناخت کھو بیٹھے تھے۔ "ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا کہ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو یہ ستون جس پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں تم نے سُنی ان سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہاری

---

[1] "مولانا ابوالکلام آزاد" "فکر و فن" از ملک زادہ منظور احمد صفحہ ۶۰۴ سے ۶۰۵۔

لو لیا ہے جو انھوں نے مولانا کی پرندوں کی دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اب یہاں انھیں کے الفاظ میں یہ اقتباس دیں: ''وہ سیاسی کاموں سے اپنا وقت بچا کر فطرت کا مطالعہ کیا کرتے تھے، قلعۂ احمد نگر کے کوارٹر میں مضمحل پڑے رہنے کی بجائے وہ مزے سے محویت کے عالم میں چڑیوں کو دیکھا کرتے تھے۔''[1]

تذکرہ سے جو انتخاب کیا گیا ہے اس کی نوعیت ادبی ہے اور یہ ایک خود نوشت سوانح ہے لیکن اس کو مذہبی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں سوانحی حالات تو آخری باب میں بیان کیے گئے ہیں، بالکل آخر میں مولانا نے کتاب کے محرک کا ذکر کیا ہے: ''یہ اوراق پریشاں دوست عزیز مسٹر فضل الدین احمد کے بے حد اصرار سے قلم بند ہوئے۔'' ہمیں فضل الدین احمد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی بدولت یہ بے حد غیر معمولی خود نوشت سوانح لکھی گئی۔ وہ انجینئر تھے ظاہر ہے وہ مشاہیر پرست تھے اور ایسے عقیدت مندوں کے اظہار عقیدت سے سب ہی مشاہیر گھبراتے اور الجھتے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مولانا سے اس موضوع پر گفتگو کی تو مولانا نے مذاق میں اسے اڑا دیا۔ بہت سی عظیم ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے بہت بڑے کارنامے انجام دیے مگر کسی نے ان کے حالات قلم بند نہیں کیے ان لوگوں کو نظر انداز کر کے خود اپنے بارے میں لکھنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے بقول پروفیسر مجیب ''شکر ہے کہ فضل الدین احمد میں احساسِ ظرافت نہیں تھا وہ مولانا سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ مولانا کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ہر ہفتے ان کو اپنے حالات بھیجیں گے۔ مرتب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کم و بیش تین سو صفحات سے کیا منتخب کرے۔ یہ بات تو طے ہے کہ جب تک ''تذکرہ'' کے آخری حصے کو نہ پڑھا جائے کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا نے اپنے بارے میں اس حصے میں کیا لکھا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات بغیر تکلف کے بے ساختگی سے بیان کیے ہیں مگر واقعات کو مسجع زبان اور شاعرانہ علامتوں کے پردے میں بیان کیا ہے۔ اپنی روحانی مہم جوئی پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اس میں غیر ضروری تفصیلات آگئی ہیں۔ ''تذکرہ'' میں بیک وقت دو متضاد

---

[1] MALCOM MACDONALD "MAULANA AZAD AND THE SPARROWS." مولانا ابوالکلام آزاد میموریل، مرتبہ ہمایوں کبیر

اپنی گہری دلچسپی اور شغف کا حال لکھا ہے ۔ اپنے والد سے چھپ کر ان کے ایک مرید مسیتا خاں سے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا، پھر نئے نئے اور عجیب عجیب مقامات پر ستار بجانے کی مشق کرنا۔ مثلاً تاج محل میں ستار بجانا ان کے ذوق جمالیات کی سب سے اچھی مثال ہے ۔" وہ نور و ظلمت کی ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلیوں کے زخموں سے نغمے۔"[1] غبار خاطر مولانا نے جیل میں انتہائی تکلیف دہ حالات میں لکھی، قید کی مصیبت، رفیق زندگی کی جدائی، سیاسی بحران، جبکہ بہت سے لیڈر جیل میں تھے اس کے باوجود کتاب میں امید و رجائیت کا انداز غالب ہے ۔ ۱۹۴۰ء کے اوائل کی مولانا کی تحریروں کا مقابلہ جب ہم ۱۹۴۰ء کی آخر کی تحریروں سے کرتے ہیں تو وہ ہمیں کسی اور زمانے کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں ۔کتاب میں جگہ جگہ انھوں نے مسرت کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ حالات خواہ کیسے ہی خراب ہوں انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے ۔" خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں نہیں کھپ سکتے جو نقاش فطرت کے موئے قلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہوسکتے۔"[2] ہم نے دوسرے مضمون کے انتخاب میں قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھا ہے ۔مولانا کی پرندوں سے دلچسپی کا حال سب کو معلوم ہے ۔ انھوں نے اپنے دو خطوں میں " چڑے چڑیا کی کہانی" میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے ۔

ہم نے ان خطوط کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا ہے اس لیے کہ اس کا بہترین ترجمہ انگریزی میں موجود ہے۔[3] بلکہ ہم ایک نیچرلسٹ میکڈانلڈ سابق برٹش کمشنر آف انڈیا کے اس مضمون

---

[1] غبار خاطر صفحہ ۲۵۹ ساہتیہ اکیڈمی [2] غبار خاطر صفحہ ۲۶ ساہتیہ اکیڈمی

[3] چڑے چڑیا کی کہانی کا ترجمہ خشونت سنگھ نے کیا ہے جو السٹریٹیڈ ویکلی میں شائع ہوا تھا

۱۹۴۸ء میں سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن میں دیا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خطبہ ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس کا سرکاری طور پر انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے تعلیمی پالیسی بنانے کے جو دو نہایت نازک مسئلے تھے ان کو چھیڑا تھا۔ ایک اسکولوں میں مذہبی تعلیم دوسرا ہندی بحیثیت قومی زبان کے ۱۹۵۶ء میں انھوں نے یونیسکو کے نویں سیشن کو خطاب کیا تھا جو دہلی میں پہلی بار منعقد ہو رہا تھا، جناب محمد یونس جو اس وقت جلسے میں ایک نوعمر ڈیلی گیٹ کے طور پر شریک تھے ان کا کہنا ہے کہ مولانا نے یہ خطبہ بہت رواں اردو میں بغیر نوٹس کی مدد کے پڑھا تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا خطبہ ڈیلی گیٹوں کے ہاتھوں میں تھا جو مولانا کی تقریر کے ساتھ اس کے صفحے پلٹتے جا رہے تھے۔" اس جلسے کے آخر میں پنڈت نہرو نے مجھ سے کہا کہ اس شخص کی کیا غضب کی یاد داشت ہے کہ ایک لفظ بھی اصل متن سے ہٹا ہوا نہیں ہے[1]"

مولانا کی ثقافتی بصیرت اور ذوق جمالیات کا ثبوت تین اکیڈمیاں ہیں ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی اور ان ہی کی تحریک پر قومی حدود سے اٹھ کر انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشن کا قیام ہوا۔ ان تینوں اکیڈیمیوں کے افتتاحیہ جلسوں میں جو خطبات مولانا نے دیے ہیں ان کے اقتباسات اس انتخاب میں شامل ہیں[2]۔ اس خیال سے کہ مولانا کی شخصیت کا یہ غیر معمولی پہلو بھی لوگوں کے سامنے آئے، جس سے ان کی علمی اور انتظامی قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کے ذوق جمالیات و فنون لطیفہ کی قدر شناسی کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ریاستی سطح پر فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی ہونا چاہیے۔ برٹش حکومت کے زمانے میں ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں اس کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا اور ملک اس سے بالکل محروم تھا۔

ان کی پارلیمانی تقریروں میں وہ تاریخی مباحثہ شامل کیا گیا ہے جو ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو پرشوتم داس ٹنڈن، ولبھ گووند داس اور مولانا کے درمیان ہوا تھا۔ انڈین ایکسپریس کے خاص نمائندے نے لکھا ہے کہ مولانا نے جب اپنی وزارت کی تنقید کے جواب میں تقریر کی تو ۱۹۳۰ء

---

[1] جناب یونس نے ایک ملاقات میں یہ واقعہ خود خاکسار سے بیان فرمایا تھا۔

[2] اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اسلوب بیان ملتے ہیں جب فضل الدین احمد نے چاہا کہ وہ صرف اپنے سوانحی حالات ہی لکھیں تو مولانا نے جواب دیا "میری طبیعت میں رکاوٹ پیدا نہ کرو، جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے جمع کرتے جاؤ، ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا"[1]

تیسرا آزادی کے بعد کا دور مولانا کی ان تحریروں، بیانات اور خطوط پر مشتمل ہے جو انھوں نے بحیثیت وزیر تعلیم ۱۹۴۷ء سے اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک اس منصب پر رہ کر لکھے ہیں[2]

یہ بہت مشکل مسئلہ تھا کہ ان کی اس طرح کی تحریروں کو آسانی سے سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ اور ادبی عنوانات کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تحریریں اس زمانے کی ہیں کہ جب جنگ آزادی ختم ہو چکی تھی اس کے بعد ملک میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی اور اس وقت کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو لوگوں کی رہبری کر سکے۔ آخری دور کی تحریروں میں زیادہ تر اسی کے متعلق ہیں۔ مولانا نے مختلف موضوعات پر تقریریں کی ہیں اور ان موضوعات پر لکھا ہے جو بحیثیت وزیر تعلیم و قدرتی وسائل اور سائنٹفک ریسرچ کے لیے ضروری تھیں۔ وہ جب بھی بولتے اپنے چبھتے ہوئے فقروں، خوبصورت زبان اور عمیق خیالات سے حکام بالا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے تھے۔ اس زمانے کی زیادہ تر تقریریں جو دستیاب ہیں وہ انگریزی میں ہیں، اور حکومت کے پبلیکیشن ڈویژن نے ان کو ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس زمانے میں مولانا کی زبان پر فارسی اثر کم ہے بلکہ انھوں نے وہ اردو لکھی ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے مگر ان کے اسلوب کی جو خصوصیات ہیں، اس کی چھاپ اس پر موجود ہے۔ آزادی کے مقصد کے لیے حیرت انگیز طور پر خود کو وقف کرنے کا عزم اور اس کے پُر جوش اظہار کا رُخ اب نوزائیدہ حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں کی مستقلال اور عزم کے ساتھ وضاحت کی طرف مُڑ گیا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں اُن کی آواز کا ٹیپ اب بھی محفوظ ہے جس میں ان کی جوانی کے زمانے کی تقریروں کا جوش و خروش اور عوام کو جوش دلانے والی خصوصیات ہیں۔ اس انتخاب میں ان کا وہ خطبہ شامل ہے جو انھوں نے

---

[1] صفحہ ۱۸ تذکرہ [2] ان میں سے زیادہ تر کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا گیا ہے۔

— BEEN LOST. IT IS NO LONGER POSSIBLE TO SAY HOW THE BOOK BEG-
—AN NOR DO WE KNOW HOW IT IS LIKELY TO END.

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبریم
اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است

مولانا کا شمار صف اوّل کے خطوط نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا سب سے مشہور خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" ہے یہ خط انھوں نے اپنے دوست صدر یار جنگ کو لکھے تھے جن کو "صدیق مکرم" سے مخاطب کرتے ہیں۔ ان خطوط میں مولانا نے اپنی ذات کی توضیح و نظریات کی تشریح کا کام لیا ہے۔ قید خانے میں مولانا یہ خط لکھ لکھ کر ایک فائل میں جمع کرتے رہے۔ اور یہ مکتوب الیہ کو اس وقت پہنچے جب جون ۱۹۴۵ء میں مولانا قید سے رہا ہوئے۔ کچھ اور خطوط بھی ہیں جو شائع ہو چکے ہیں "مکاتیب ابوالکلام" کو ابوسلمان شاہجہانپوری نے مرتب کیا تھا۔ اور خطوط ہیں جو شائع نہیں ہوئے اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کے سیکڑوں خطوں میں سے ہم نے اس انتخاب کے لیے ان خطوں کو چُنا ہے جو ان حضرات کے نام ہیں جن کا مولانا کی زندگی پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ایک ان کے رہنما گاندھی جی اور دوسرے ان کے دیرینہ دوست پنڈت جواہر لال نہرو۔ ان خطوط میں ان لوگوں کے دل میں جو ایک دوسرے کے لیے عزت اور خیال تھا، اس کا سیدھا سادہ اظہار ہے۔ ۲۷ جون ۱۹۴۶ء کو مولانا نے گاندھی جی کو ایک بہت نازک مسئلے پر لکھا تھا جب مہاتما گاندھی کے بیٹے ہری لال نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ "آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ اس قسم کی تبدیلی اسلام میں جائز ہے؟ کیا یہ اسلام کی اشاعت کا مناسب طریقہ ہے؟ اور اسے روا رکھنا چاہیے؟ اسلام میں مذہب کا معاملہ خالص روح اور دل سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی اس وقت تک صحیح طور پر اسلام قبول نہیں کر سکتا جب تک اس میں کسی دنیاوی غرض کا ذرا سا شائبہ بھی ہو۔ پیغمبر اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انسان کے اعمال کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی نیت کیا ہے؟ اور خدا صرف الفاظ اور دکھلاوے کے کاموں کو نہیں دیکھتا وہ تو دل اور اس نیت کو دیکھتا ہے جس سے وہ کام کیے گئے ہیں۔"

اور ۱۹۴۷ء کا زمانہ یاد آگیا جب کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا نے اپنی معرکۃ الآرا تقریر کی تھی اور اپنی خطابت سے ہزاروں لوگوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ مہمانوں کی گیلری میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ معترضین کی حالت غیر تھی، مولانا کے ان الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا تھا۔ اور سب سے زیادہ نازک لمحات وہ تھے جب مولانا نے کہا "میں نے چالیس سال پہلے اپنی زندگی کا پروگرام ملک کی خدمت کا بنایا تھا۔ اور جب میری عمر انیس سال سے زیادہ نہ تھی، اس وقت سے لے کر آج تک میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے جو دنیا کے سامنے ہے۔ کوئی خواہش اب میرے اندر نہیں ہے۔ زندگی کا بہت بڑا حصہ ختم ہو گیا، جو تھوڑا باقی ہے نہ معلوم کب ختم ہو جائے۔ جب ایک شخص نے اپنے اندر سے غرض نکال دی تو وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔"

مولانا نے بحیثیت وزیر تعلیم کئی کنووکیشن ایڈریس دیے ہیں۔ آزادی کے بعد والے دور میں ہم نے اس کنووکیشن ایڈریس کو انتخاب میں شامل کیا ہے جو اس منصب کو قبول کرنے کے فوراً بعد دیا تھا جس کا عنوان ہے "نیشنلزم اور علی گڑھ"۔ اس خطبے کی یہ اہمیت ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ مولانا نے اپنے اور سرسید احمد خاں کے درمیان جو اختلافات تھے ان کو صاف صاف بیان کیا ہے پہلے ان سے اپنی عقیدت اور اس کے بعد جو اُن سے مایوسی ہوئی۔ مولانا اور سرسیّد کے اختلافات کے متعلق مختلف فرقوں میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس خطبے میں جو کہا گیا تھا اس سے ان سب کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ تقریر صرف انگریزی میں دستیاب ہے۔ ظاہر ہے اس لیے اس کا ترجمہ اردو میں کرنا پڑا یہی معاملہ مولانا کے اس "پیش لفظ" کے ساتھ ہے جو مولانا نے رادھا کرشنن کی کتاب "ہسٹری آف فلاسفی" پر لکھا تھا۔ اور ۱۹۵۲ء میں الائن اینڈ انون نے شائع کیا تھا۔ اس پیش لفظ سے مولانا کی علمی اور فلسفیانہ طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فلسفے کا تقابلی مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ انگریزی میں بھی مولانا کے اسلوب کی چھاپ صاف نمایاں ہے۔ مثلاً اس کی ابتدا دیکھیے:

A PERSIAN POET HAS COMPARED THE UNIVERSE TO AN OLD MANUSCRIPT OF WHICH THE FIRST AND THE LAST PAGES HAVE—

DEMANDS OF GRANDS 1954, ARCHIVES OF LOK SABHA, NEW DELHI.

نے ان میں سے ایک سوال کا جواب بھی براہِ راست نہیں دیا اور فضل الدین احمد نے اسے ویسے ہی قلم بند کر دیا۔ اسی لیے "تذکرہ" بالواسطہ خوبصورت انداز بیان کی وجہ سے ایک غیر معمولی خود نوشت سوانح عمری بن گیا۔ دوسری طرف ہمایوں کبیر نے "انڈیا ونز فریڈم" میں واقعات کو لکھتے وقت مولانا کو تاریخی ترتیب میں رہنے پر مجبور کیا۔ اس کا ایک واقعاتی اور دلچسپ باب "کوئٹ انڈیا" اس انتخاب میں شامل ہے۔

اس مقدمے میں شامل انتخابات کا جائزہ لینے کے بعد اب اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس ترتیب اور پس منظر کا ایک سرسری جائزہ لے لیں جس کی وجہ سے مصنّف نے بہترین چیزیں لکھیں۔ فاطمہ بیگم جو مولانا آزاد کی بڑی بہن تھیں، نے مولانا آزاد کے بچپن کے بارے میں خواجہ احمد فاروقی کو بتایا "مرحوم مولانا آزاد مجھ سے چار سال چھوٹے تھے۔ ہم دونوں کی پیدائش مکہ میں ہوئی تھی۔ جب آزاد کی عمر دس سال کی تھی، ہمارے والدین ہمیں کلکتہ لے آئے جہاں ان کے بہت سے مرید رہتے تھے۔ میرے بھائی جن کا نام محی الدین احمد تھا اور آزاد تخلص، ان کی تعلیم گھر پر والد کے زیر نگرانی ہوئی۔ آزاد اچھی شاعری کرتے تھے۔ جب چودہ سال کے تھے تو انھوں نے ایک شعر کہا تھا جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی "[1]

مولانا آزاد کے بزرگوں میں سے جمال الدین الیاس "شیخ بہلول"، مغل شہنشاہ اکبر کے ہم عصر تھے وہ ان علماء میں سے تھے جنھوں نے اس بیان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ نئے مذہب کا بانی ہوسکتا ہے اور جمال الدین شیخ کے بیٹے شیخ محمد کو اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر گوالیار کے فرماں روا کے سامنے حلف وفاداری اٹھانے سے انکار کرنے کے جرم میں قید کر دیا گیا تھا۔ "تذکرہ" میں مولانا نے شیخ جمال الدین کے حالات بیان کرتے ہوئے اس پر بہت اطمینان کا اظہار کیا ہے

---

[1] آجکل آزاد نمبر ۱۹۵۹ء

خطوط، ٹیلی گرام اور میمورنڈم ہیں جن میں ان تینوں لیڈروں نے متعدد اہم موضوعات پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ ہم نے کچھ متفرق خطوط، میمورنڈم اس کتاب میں شامل کیے ہیں، کیونکہ یہ اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہیں۔

"INDIA WINS FREEDOM" سب سے پہلے جنوری ۱۹۵۹ء میں مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب علاوہ اس کے کہ مولانا نے ہمایوں کبیر کو بول کر لکھوائی ہے یعنی مولانا جو بولتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔ یہ واحد تصنیف ہے جو انگریزی میں مولانا کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو "ہماری آزادی" کے نام سے پروفیسر محمد مجیب نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان متنازعہ تیس صفحات سے قطع نظر بدقسمتی سے جنھیں مولانا کی صدی میں سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اس پوری کتاب کے اسلوب کے بارے میں ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ علاوہ اردو اور انگریزی زبان میں جو اختلافات ہیں ان کو اور اس امر کو نظر میں رکھ کر یہ کتاب خود لکھی نہیں گئی ہے بلکہ بول کر لکھوائی گئی ہے تب بھی اس کے اسلوب اور مولانا کی دوسری تصانیف "تذکرہ" "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کے اسلوب میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ پیش لفظ جو مولانا نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب "ہسٹری آف فلاسفی" پر لکھا تھا جو اصل میں اردو کی بجائے انگریزی میں ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے اس سے بھی مولانا کے اندازِ فکر کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس پر بھی ان کے فلسفیانہ اور ادبی اسلوب کی چھاپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "انڈیا ونز فریڈم" میں مولانا اور ہمایوں کبیر کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس کو جس انداز میں اس کتاب میں قلم بند کیا گیا ہے وہ رپورٹ کا سا ہے جو ہمایوں کبیر کے اندازِ بیان سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت مولانا کے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات یاد آتی ہے کہ فضل الدین احمد صاحب جنھوں نے بہت کوشش اور محنت سے مولانا کی سوانح عمری ان سے لکھوائی اور خود مرتب کی ہے وہ پندرہ سوالات جو مولانا کی زندگی اور تاریخ وار واقعات سے متعلق تھے لے کر مولانا کے پاس رانچی گئے مولانا

ے ان کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اپنے خاندان کے ساتھ کلکتہ آگئے۔ یہاں پندرہ سال کی عمر میں آزاد نے درس نظامی ختم کرلیا جو طالب علم شاذونادر ہی اس سے زیادہ عمر میں ختم کر پاتے ہیں۔ بس یہی عرصہ ہے جس میں آزاد کی باقاعدہ تعلیم ہوئی۔ یہ عام خیال کہ آزاد کی تعلیم قاہرہ میں جامعۃ الازہر میں ہوئی صحیح نہیں ہے۔ یہ سہو مہادیو ڈیسائی سے مولانا کی سوانح عمری "مولانا ابوالکلام آزاد" میں ہوا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کے انتقال کے ایک دن بعد پارلیمنٹ میں جو تقریر کی اس میں اس غلط فہمی کو اور تقویت دے دی۔ مولانا نے تو جامعۃ الازہر کی تعلیم پر کڑی تنقید کی ہے۔ غبار خاطر میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہاں جدید ہندوستانی یا RATIONAL SCIENCE کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ جمال الدین افغانی کو اپنے لکچر کی تیاری کے لیے وہاں کتابیں دستیاب نہیں ہوئی تھیں اور عبدہٗ نے اسی لیے بیزار ہو کر یونیورسٹی کو چھوڑ دیا تھا۔"[1]

آزاد کے والد ان کی تعلیم پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ مولانا خیر الدین بہت سخت آدمی تھے۔ آزاد نے اس کا ذکر "غبار خاطر" میں کیا ہے۔ ان کو جو سبق دیا جاتا وہ پہلی بار میں یاد کر لیتے تھے۔ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ ایک دفعہ جو بھی پڑھتے یاد ہو جاتا تھا۔ ان کے والد روز صبح اپنے دونوں بیٹوں کو پڑھاتے تھے، مگر اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ سبق کے دوران سوال کریں لیکن ان کا سبق اس قدر مکمل ہوتا تھا کہ سبق کے آخر میں بھی کسی سوال کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کے ہر چیز کو ازبر کرنے اور غیر معمولی یادداشت کے بارے میں عبدالرزاق ملیح آبادی نے خود آزاد کے حوالے سے لکھا ہے "میں نے اپنے دماغ میں خانے بنا رکھے ہیں۔ سیکڑوں، ہزاروں خانے۔ یہ خانہ قانون کا ہے، یہ خانہ بین الاقوامی سیاست کا، یہ علم تاریخ کا، یہ ریاضی کا، یہ فوج کا۔ میں اپنی معلومات سلیقہ مند ماہر اسٹور کیپر کی طرح نظم و ترتیب کے ساتھ ساتھ الگ الگ خانوں میں جمع

---

[1] IAN HANDERSON DOUGLAS, "MAULANA ABUL KALAM AZAD : AN INTELLECTUAL AND RELIGIOUS BIOGRAPHY."

کہ ان کے بزرگ دنیاوی چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔" یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب و کیف و دماغ کا باعث ہوا کہ الحمدللہ علمِ حدیث وسنت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا اور "برنگ محدثین" ذوقِ سنت اور "باہلِ دنیا کارے نہ داشتن" کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینانِ فقر و نامرادی کے حصے میں آئی ہے ۔"[1]

مولانا منورالدین جو آزاد کے پردادا تھے انھوں نے ۱۸۵۵ میں ہندوستان کے حالات سے بیزار ہوکر حجاز کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھیں بمبئی سے روانہ ہونا تھا۔ بمبئی جاتے ہوئے وہ بھوپال سے گزرے، اس زمانے میں وہاں کی فرماں روا نواب سکندر بیگم تھیں، انھوں نے اصرار کرکے مولانا منورالدین کو بھوپال میں روک لیا۔ لیکن آخرکار مولانا منورالدین نے بمبئی کا رُخ کیا وہاں ان کے مریدوں نے انھیں روکا اور وہیں ۱۸۵۸ یا ۱۸۵۹ میں ان کا انتقال ہوگیا منورالدین کے پوتے (جو مولانا کے والد تھے) خیرالدین نے اس سفر کو جاری رکھا اور اکیلے ہی حجاز پہنچ گئے۔ یہاں وہ علماء اور صوفیاء کی صحبت میں رہے اور ۱۸۷۰ء یا ۱۸۷۱ء میں انھوں نے ایک عرب خاتون سے شادی کرلی جو ان کے ایک استاد شیخ محمد زاہد وطری کی بھانجی تھیں۔ مولانا خیرالدین کے پانچ بچے ہوئے۔ تین لڑکیاں، زینب، فاطمہ اور حنیفہ اور دو بیٹے ابونصر غلام یاسین اور ابوالکلام محی الدین احمد۔ بڑی بہن کے علاوہ اور سب بچے شاعری کرتے تھے۔ دونوں لڑکیوں کا تخلص آرزو اور آبرو تھا اور دونوں بھائیوں کے تخلص آہ اور آزاد تھے۔

آزاد کی پیدائش مکے میں ذی الحجہ میں ۱۳۰۵ ہجری اور سنہ عیسوی کے مطابق ۹ اگست یا ۱۸ ستمبر ۱۸۸۸ کو ہوئی۔ ہمایوں کبیر نے COMMEMORATION میں اُن کی تاریخ پیدائش ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء لکھی ہے مگر اس تاریخ کے صحیح ہونے کی شہادت اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کے والد نے ان کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا خیرالدین

---

[1] "تذکرہ"، صفحہ ۳۲۰، ساہتیہ اکیڈمی

اور خوشامدانہ انداز بُرا لگنے لگا اور وہ جب ان سے وہ انداز اختیار کرتے تو اچھا نہیں لگتا تھا:
"زیادہ سے زیادہ میری عمر تیرہ برس تھی کہ میرا دل اچانک اپنی موجودہ حالت اور اردگرد کے منظر سے اُچاٹ ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کسی اچھی حالت میں مبتلا نہیں ہوں۔۔۔ حتیٰ کہ مجھے ان ساری باتوں سے جو لوگوں کی نظروں میں انتہا درجہ عزت و احترام کی باتیں تھیں ایک طرح کی نفرت ہو گئی۔۔۔۔ اب جو لوگ میرا ہاتھ پاؤں چومتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ گویا ایک بہت ہی سخت برائی کا کام ہو رہا ہے۔"[1]

یہی نہیں ان کے دل میں ان عقائد کے بارے میں شک و شبہات پیدا ہونے لگے جن میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی جو صرف قدیم رسم ورواج سے محبت اور آبا و اجداد کی تقلید کا نتیجہ تھے۔ حقیقت کو پانے کی طلب اور جستجو تیرہ سال کی عمر میں شروع ہوئی تھی۔ جسے ایک عرصے کے بعد انھوں نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے۔ "میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں۔ اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔"[2]

اس جلد میں مولانا کی جو تحریریں شامل ہیں ان کو ابتدائی زمانے کے پس منظر کو سامنے رکھ کر پڑھنا چاہیے۔ جس کی تیاری انھوں نے بچپن سے شروع کر دی تھی۔ ان کے بچپن کے سلسلے میں ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے "کیا واقعی آزاد کبھی بچہ تھے؟" یقیناً ان کے ننھے منے کاندھوں پر ایک بالغ دماغ تھا۔ ان کی ہم عصر جیسے سروجنی نائیڈو کے بقول کہ وہ جب پیدا ہوئے تو ان کی عمر پچاس سال

---

[1] ذکرِ آزاد صفحہ ۲۵۶

[2] ترجمان القرآن دیباچہ طبع اول صفحہ ۵۲، ساہتیہ اکیڈمی

کرتا ہوں اور جس وقت جس معلومات کی ضرورت پڑتی ہے اسی کا خانہ کھول لیتا ہوں اور باقی خانے بند رکھتا ہوں"[1]

ڈوگلز نے اس بیان کو پوری طرح سمجھے بغیر اظہار خیال کیا ہے کہ آزاد کے اس بیان سے ان کی تربیت کی خامی کا اندازہ ہوتا ہے" اصل میں ان کی تربیت ان کی تعلیم کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اس لیے ایک علم کا دوسرے علم سے کوئی تال میل نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد نے اپنی ذہانت سے اپنی ابتدائی تربیت کے اثرات سے خود کو بچا لیا تھا"[2]

آزاد کی شدید خواہش تھی کہ انھوں نے جو پڑھا ہے اس کے بارے میں کسی سے بات کریں۔ ان کے لڑکپن میں ان کے یہاں کا یہ روزانہ کا معمول تھا کہ ان کے دیوان خانے میں پچاس ساٹھ لوگ جمع ہوتے تھے، اور نماز مغرب کے بعد وہ آزاد سے مختلف موضوعات پر سوال کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی یہ لوگ ان کو پیرزادہ کہتے تھے اور ان کی باتوں کو بہت توجہ سے سنتے تھے ان کے ایک ایک لفظ کی تعریف وتحسین کرتے۔ بعد میں وہ اپنی اس گفتگو کو "لغو" کہتے تھے جو وہ لڑکپن میں اپنے والد کے مریدوں سے کرتے تھے۔

آزاد نے جلدی ہی خود کو اس فوجی ڈسپلن کی زندگی سے نکال کر تلاش وجستجو کی آزاد فضا میں لا کھڑا کیا اور یہ متعدد باہری اثرات کا نتیجہ تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کے والد ان کو قواعد لکھواتے تو یہ چپکے چپکے اردو ادب کا مطالعہ کرتے جس سے ان کے ذہن کے سامنے نیا افق کھلا۔ اسی زمانے میں انھیں موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے ستار بجانا شروع کر دیا۔ تنہائی میں وہ اپنے باپ سے اس تعصّب کے بارے میں جرح کرتے جو ان کے والد کو وہابیوں سے تھا۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے والد کے مریدوں کا عاجزانہ

---

[1] ذکر آزاد صفحہ ۱۱۶

[2] DOUGLAS p.41

ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔ گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے الٹی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے پر کمر باندھ رہے تھے میں کھول رہا تھا"۔[1]

ہم نے مولانا آزاد کی زندگی کے حالات کا مختصر ذکر کیا ہے اس سے زیادہ تفصیل سے جاننے کی جن قارئین کو خواہش ہو۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کے لیے اشاریہ اور ان کی زندگی کے واقعات کا تاریخ وار نقشہ دیکھیں جو اس انتخاب میں دیا جا رہا ہے مولانا کی تحریروں کو مختصراً پیش کرنا ایک طلسم ہے۔ ایک کائنات اصغر ہے جس میں ایک منشور ہے جو بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہوئے واقعات کا خلاصہ ہے۔ مولانا آزاد کی صدی میں یہ انتخاب جو ان کا ادبی اور علمی ترکہ ہے تین زبانوں انگریزی، اردو اور ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دنیا کے دوسرے حصّوں کے لوگ اس صدی کے بہترین ذہن و دماغ کے انسان سے واقف ہوں۔ کیا مولانا اس انتخاب کو پسند کرتے جو اقبال کے ساقی نامہ کے اس شعر کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر؛ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

---

[1] غبارِ خاطر صفحہ ۱۰۳، ساہتیہ اکیڈمی

تھی۔ اندرا گاندھی کے نام کے خط میں پنڈت نہرو نے بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے "شاید وہ بہت جلدی بڑے ہو گئے۔ وقت سے پہلے ان میں بالغوں جیسی ذہانت تھی۔ اب بھی وہ بوڑھے نہیں لگتے، ان میں ہمیشہ سے ایک بالغ نظری ہے۔ ان کے بارے میں یہ سوچنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی سر پھرے نوجوان رہے ہوں گے۔"[1]

مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اپنے بچپن کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے " لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں مگر بارہ تیرہ سال کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا، جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت، اندر اچھی خاصی جگہ ہے۔ اور ایک بینچ بچھی ہوئی ہے جب میں سیر کے لیے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا۔ اور جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادم خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے "اگر تجھے کتاب پڑھنی تھی تو گھر سے کیوں نکلا ؟"[2] ان خیالات کی صداقت مسلّم ہے۔ مگر مولانا کی زندگی کا ایک پہلو اور بھی ہے جس پر ان کے کسی ہم عصر نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ان کے محرم راز نہیں تھے۔ یہ بات خاص طور سے فرض کرلی گئی کہ کیونکہ مولانا کا بچپن عام بچوں جیسا نہ تھا اس لیے ان کی جوانی بھی پُر جوش اور دیوانی نہیں تھی۔ مولانا نے خود اس کو بیان کیا ہے مگر استعاراتی انداز میں "تذکرہ" کا آخری باب ان کی اس زندگی کا کھلا اعتراف ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے بعد اپنے ایّام جوانی کے سرپھرے پن کے بارے میں غبارِ خاطر میں لکھتے ہیں " چوبیس سال کی عمر میں جب لوگ عشرت و شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں

---

[1] SELECTED WORKS OF JAWAHARLAL NEHRU,EDITED BY S.GOPAL p.39

[2] غبارِ خاطر صفحات ۸۰، ۸۱، ساہتیہ اکیڈمی

شاندار ابتدا

صحافیانہ تحریریں

(۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۶ء تک)

لسان الصدق

"لسان الصدق کا فرض ہے کہ قوم کو کذب سے بچائے، اور
راستی پر لائے"!

میل جول سے پڑی مسلمانوں نے جب ہندوستان فتح کیا تو مفتوح قوم کے رسم ورواج سے واقف ہونے کی انھیں ضرورت ہوئی۔ واقفیت کے ساتھ جب میل جول بڑھا تو خود بخود مفتوح قوم کے رسم و رواج نے فاتح قوم کے افعال پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ادھر "اکبر اعظم" کی غیر متعصبیت نے یہاں تک ترقی کی کہ ہندوؤں کے رسم ورواج پر مائل ہوکر مسلمانوں میں غیر محسوس طریقہ پر میلان پیدا کردیا، مذہبی کمزوری نے بھی بہت سے توہمات پیدا کردیے اوران سب باتوں نے مل کر مسلمانوں کے افعال پر یہاں تک اثر کیا کہ" انیسویں صدی" میں مسلمانوں کے خاص رسم ورواج نظر آنے لگے۔ان کی اس عربی سادگی اور ایرانی تکلّف کی جگہ ایک خاص ہندوستانی مخلوط رنگ نظر آنے لگا۔ ان کے رسم ورواج نے انھیں اپنے قدیم سرچشمہ سے ایسا جُدا کردیا کہ کوئی دیکھنے والا انھیں کبھی وہ قدیم مسلمان نہیں سمجھ سکتا جنھوں نے ہندوستان کو فتح کیا تھا۔اسی رسم ورواج کی بدولت انھوں نے اپنی تمام قدیم صنعتیں کھودیں وہ جو کچھ اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے اُسے برباد کرکے ہندوستان کا سرمایہ تباہ کردیا۔ جس کی جانب حالیؔ نے شکوۂ ہند میں کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

رخصت اے ہندوستان! اے بوستانِ بیخزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں
تونے ثروت دی، حکومت دی ریاست دی ہمیں
شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا
نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطر داریاں
جو دیا تھا تونے وہ آخر کو سب رکھوالیا
خیر اپنے مال کا تو ہر طرح تھا اختیار
جس سے چاہا لے لیا اور جس کو چاہا دیدیا
پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ
وہ بھی تونے ہم سے لے کر کردیا بالکل گدا

سب سے بڑی وجہ ان بیہودہ رسم ورواج کی طبیعت ثانیہ ہونے کی یہ ہوئی کہ مذہبی توہمات

لسان الصدق*

"الصدق ینجی و الکذب یہلک" لسان الصدق کا دستور العمل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے۔ جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید اس قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ انھیں ایسے ترانے سُنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر "سچائی کی زبان" کیونکر شیریں معلوم ہوگی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سُنائے گا جو اگرچہ تم کو ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اُس زمانہ کو دور نہ سمجھو جبکہ صدق کا "ینجی" ہونا اور کذب کا "یہلک" ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔ اس رسالہ کے خاص مقاصد حسب ذیل ہیں:

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

۲۔ ترقی اردو۔ یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت۔ بالخصوص بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید۔ یعنی اُردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

سوشل ریفارم

اس امر سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے موجودہ رسم و رواج کی بنا ہندوؤں کے

---

* ۱۹۰۳ء میں پندرہ سال کی عمر میں مولانا آزاد نے ایک پندرہ روزہ اخبار "لسان الصدق" نکالا تھا۔ اپنا اخبار نکالنے کی یہ ان کی پہلی کوشش تھی۔ اس مضمون میں، جو ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے سے لیا گیا ہے اس میں انھوں نے "لسان الصدق" کے مقاصد بیان کیے ہیں۔ اس میں سے جو حصہ لیا گیا ہے اس میں تفصیل سے سماجی اصلاح کا مقصد بیان کیا گیا ہے مولانا کی تحریر، جو انہوں نے ۱۵ سال کی عمر میں لکھی ہے اس میں سماجی بیداری، جرأت اور تجزیاتی انداز بیان موجود ہے اور مقصد کی وضاحت بھی۔ مولانا کے اسلوب نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اس لحاظ سے اس تحریر کا مقابلہ ان کی نو سال بعد کی الہلال کی تحریر سے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ الہلال جس نے صحافت کا اعلاترین معیار قائم کیا ہے۔

اکثر اس خیال میں رہے کہ ہم جن ضروری اصلاحوں میں مشغول ہیں وہ اس اصلاح سے بدرجہا زیادہ ضروری ہیں اس لیے اگر اس اصلاح سے قوم کو وحشت ہوئی اور رسم ورواج کی محبت نے ہمیں ان کا مخالف سمجھ کر ہم سے بدظن کرا دیا، تو ہماری اصلی کوشش میں خرابی پیدا ہو جائے گی اور اس اصلاح کی بدولت اور ضروری اصلاحیں بھی رہ جائیں گی۔

بعضوں نے یہ خیال کیا کہ جب قوم میں تعلیم عام ہو جائے گی اور جدید اثرات ہر دماغ تک پہنچ جائیں گے تو خود بخود اصلاحِ مراسم کا خیال طبیعتوں میں پیدا ہو جائے گا اس لیے اس وقت کوشش کرنی قبل از وقت ہے، یہ خیالات آج تک اس ضروری اصلاح سے مانع رہے، اور حکیم کا بے جا سکوت اور مریض کی بے خبری نے مرض کو لاعلاج ہونے کے قریب کر دیا، اگر اس وقت بھی ہم اسی قسم کی دُور اندیشیوں میں مست رہیں گے تو اس زمانے کو کچھ دور نہیں سمجھنا چاہیے جبکہ مرض کلیتہً لاعلاج ہو جائے گا اور تمام مسیحائے وقت اس کے علاج سے عاجز ہو جائیں گے۔

وہ پہلی جماعت جسے ہم نے اکثر کے ساتھ تعبیر کیا ہے بیشک بہت سی ضروری اصلاحوں میں مشغول ہے اور بلاشبہ ان کا قوم میں ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اصلاحِ رسومات دراصل ایسی ضروری اصلاح ہے کہ ہر قسم کی اصلاح اس اصلاح پر مبنی ہے، تعلیم کو مسلمانوں میں آج تک جو ناکامیابی ہوئی وہ بہت کچھ رسم ورواج کی پابندی سے ہوئی، اکثر خاندانوں میں اب تک انگریزی اس لیے نہیں پڑھائی جاتی کہ ان کے یہاں ایک خاص نصاب تعلیم کی رسم پڑ گئی ہے اور رسم ورواج کے لحاظ سے اس کا پڑھانا ضروری ہے۔ انگریزی اگر اولاد کو پڑھائی جائے تو اُس تعلیم کا وقت نہ ملے اور یہ رسم رواج کے خلاف ہو اسی قسم کی بہت سی رکاوٹیں ہر قسم کی اصلاحوں میں ان رسومات کی پابندی نے پیدا کر دی ہیں جو بلا اصلاح مراسم کے دور نہیں ہو سکتیں اس لیے اس جماعت کا اور اصلاحوں کو اس سے ضروری سمجھ کر ادھر توجہ نہ کرنا دراصل ایک بیّن غلطی ہے اب رہی دوسری بات کہ رسم ورواج چونکہ غایت درجہ کی قوم میں وقعت رکھتے ہیں، اس لیے اگر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی تو قوم کو ہماری طرف سے تنفر بڑھے گا

اور علماء کی غفلت نے عوام کو اچھا موقع دے دیا کہ وہ انھیں داخل مذہب سمجھ کر ہر مسلمان کے لیے لازمی سمجھ لیں بعض رسومات ایسی تھیں جن سے علماء اور واعظین کو بالخصوص مالی منفعت ہوتی تھی اور اس لیے یہ منفعت انھیں اعلان حق سے باز رکھتی تھی، ایک مدت تک جب کسی سسٹم کی اصلاح نہ کی گئی تو اُن کے طبیعت ثانیہ ہونے میں کیا دیر تھی؟ اسلامی حکومت کا آخری دور بالکل عیش وعشرت کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ میں تموّل اور بے فکری نے خود بہت سے نئے رواج پیدا کردیے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی و غمی کی بے جا رسمیں زیادہ تر لکھنؤ ہی کی بے فکرانہ زندگی سے پیدا ہوئی ہیں! جب ہندوستان میں زمانہ نے دوسرا دور شروع کیا اور وہ ایک متمدّن سلطنت کے قبضہ میں آیا تو یہ غیر ممکن تھا کہ ہر شخص قدیم روش کی طرح بے فکری کی زندگی بسر کرتا۔ اسباب کا پیدا کرنا اور تعلیم کا حاصل کرنا لازمی ہوگیا۔ لیکن رسم ورواج میں باوجود تعلیمی انہاک کے کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ ہر ایک رسم اُسی طرح ہر متعین وقت کے لیے ضروری رہی اور قدیم روش کی تقلید اسی طرح ہر شخص کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ لیکن چونکہ وہ بے فکری اور فوری تموّل ایک متمدّن سلطنت کے زیر سایہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس لیے یہ قدیم روش سینکڑوں خاندانوں کے لیے بربادی کا باعث ہوئی معمولی معمولی تقریبوں پر ہزاروں روپے صرف ہونے لگے اور سوسائٹی کے دباؤ سے کسی کو ہمّت نہ ہوئی کہ وہ ان ظالم رسومات سے ذرا بھی مخالفت کرسکے۔ ہمارے ایک ترکی دوست نے ہندوستان کی یہ حالت دیکھ کر ہم سے بیان کیا کہ ہندوستان کی غربت کی ایک بڑی وجہ یہاں کے رسم ورواج ہیں جو سوسائٹی کا زور لے کر ہر شخص سے مجبوراً سینکڑوں روپے صرف کرا لیتے ہیں۔ لکھنؤ میں تمھیں اکثر یہ آوازیں سننے میں آئیں گی کہ ببّن میاں کی شادی میں پانچ ہزار کا قرضہ ہوگیا اور چھٹّن میاں کے ختنے میں دو مکان گروی ہوگئے، اب اور آمدنی کی کوئی صورت تو ہے نہیں، خاندان کا خاندان فاقوں مر رہا ہے اور سود کا خیال خون خشک کررہا ہے اگر اصلی معنوں میں سادگی کے ساتھ شادی کردی جاتی اور صرف ختنہ کردیا جاتا تو ببّن اور چھٹّن خاندانوں کے تباہ ہونے کا باعث نہ ہوتے۔ رسم ورواج کی پابندی نے یہ کچھ خرابیاں ہندوستان میں پیدا کررکھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی اصلاح کی جانب آج تک کسی نے توجہ نہیں کی اور یہ مرض اسی طرح قوم میں ترقی کرتا گیا،

یہ کوشش ضرور کوئی نتیجہ پیدا کرے گی۔

کانفرنس نے اصلاحِ تمدّن کا علیٰحدہ صیغہ قائم کیا ہے جس کے سکریٹری علی گڑھ کالج کے مشہور تعلیم یافتہ جناب خواجہ غلام الثقلین ہیں اور جو واقعی اس اہم عہدہ کے پورے لائق ثابت ہوئے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اسی مقصد کے لیے "عصرِ جدید" نامی ایک رسالہ بھی شائع کیا ہے اور ایسے ممبروں کے بڑھانے کا ایک عمدہ ذریعہ پیدا کرلیا ہے جو اس امر کا عہد کرلیں کہ آئندہ کسی رسم کی پابندی نہیں کریں گے۔ ہم خواجہ صاحب کی اس کوشش کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور امیّد کرتے ہیں کہ جب وہ کانفرنس بمبئی میں اپنا سالانہ کارنامہ پبلش کریں گے تو تمام قوم بھی ان کی خدمت کو ہماری طرح قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔ انھیں ضرورتوں کو دیکھ کر "لسان الصدق" کے مقاصد میں یہ مقصد داخل کیا گیا لیکن چونکہ سب سے زیادہ مضر رسومات وہ ہیں جن کا تعلق معاشرت سے ہے اس لیے اصلاحِ معاشرت پر اس کی توجہ زیادہ رہے گی۔

ہماری اور اصلاحوں میں رکاوٹ پیدا ہوجائے گی لیکن ہمارے نزدیک تو ہم نے کون سی ایسی اصلاحی کوشش کی ہے جسے قوم نے بلا کسی تنفّر کے قبول کر لیا ہو؟ انگریزی تعلیم کی اشاعت پر جو کچھ ہمیں خطاب ملے اور جس قدر ہم سے تنفّر ظاہر کیا گیا وہ ہمیں ابھی بھولا نہیں ہے۔ ایک ایسی قوم کی (جس میں ایک مدّت سے غایت درجہ کی جہالت پھیلی ہوئی ہو) جب اصلاح کی جائے گی چاہے وہ جس قوم کی ہو اور جس طرح کی ہو مصلحین سے اس کا متنفر ہونا ایک ضروری امر ہے، صرف اسی خوف سے اصلاحِ مراسم جیسی ضروری اصلاح سے چشم پوشی کرنی کتنی بڑی غلطی ہے۔

دوسری جماعت کا اس توقع میں رہنا کہ جب تعلیم عام ہو جائے گی تو خود بخود قوم کو اصلاح کا خیال پیدا ہو جائے گا، کس قدر بیجا توقع ہے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم رسم و رواج جو خاندانوں میں نسلاً بعد نسلٍ قائم ہوتے چلے آتے ہیں کبھی تعلیم سے دور نہیں ہو سکتے ہیں، سوسائٹی کا دباؤ، قدیم خاندانی اثر تعلیمی اثر پر غالب آجاتا ہے اور ایک تعلیم یافتہ شخص جو گھر سے باہر آزاد اور مہذّب نظر آتا ہے گھر کی چار دیواری کے اندر آکر پھر رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا دیا جاتا ہے اور وہ تعلیمی اثر جس نے اُسے گھر سے باہر مہذّب اور آزاد دکھلایا تھا خاندانی اثر سے ناشائستہ رسومات کا پابند ہو جاتا ہے۔ تعلیم بیشک ایک قسم کا خفیف احساس پیدا کر دیتی ہے لیکن ایک زبردست تحریک کی محتاج ہوتی ہے، جب تک وہ تحریک طبیعت میں آمادگی پیدا نہ کر دے طبیعت کسی چیز کے ترک کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ اسی تحریک کا نام اصلاح کی کوشش ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اُس کی کوشش کی جائے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ فضول گفتگو اور بحث میں وقت ضائع کیا جائے بلکہ جو کچھ کرنا ہے اسے شروع کر دینا چاہیے۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء نے اصلاحِ تمدّن اور اصلاحِ مراسم پر توجہ شروع کر دی ہے، ندوۃ العلماء نے آج تک جو کچھ کیا ہے اس پر ہمیں اس وقت بحث مقصود نہیں ہے: لیکن دہلی کے جلسہ سے جو علمی کارروائی کانفرنس نے شروع کی ہے وہ واقعی قابلِ توجہ ہے اور اسے دیکھ کر امیّد بندھتی ہے کہ

الہلال کے مقاصد اور پولیٹکل تعلیم

مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے، اپنے حصولِ مذہبی کی خاطر، چین نہ لیں۔

طرح الہلال کے صدہا ناظرین کو بھی یہی خلجان پریشان کرتا ہوگا۔ پس آپ کو چاہیے کہ سب سے پہلے آپ اپنی پالیسی کی تشریح کر دیں اور کم از کم پولیٹکل تعلیم کو مذہبی تعلیم سے الگ کر کے صاف صاف بتلادیں کہ آپ قوم کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں؟ ایک راستہ تو وہ ہے جس پر آج تک چلتے رہے، دوسرا راستہ اعتدال پسند ہندوؤں کا ہے جو برٹش شہنشاہی کو قائم رکھ کے اپنے حقوق طلب کرتے ہیں۔ تیسری جماعت ان ہندی انارکسٹوں کی ہے جو بم کے گولے اور ریوالور چلا کر بھارت ماتا کو اجنبیوں سے خالی کرنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم آپ بتلادیں کہ آپ کس جماعت میں ہیں اور کس کے ساتھ ہم کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ ...... اس وقت ہم یا تو آپ کا ساتھ دیں گے اور یا مذہبی تعلیم میں شریک رہیں گے اور راور صینیوں سے الگ ہو جائیں گے ..... میرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے نہیں معلوم کس قدر دقتیں اٹھا کر ایک ایسا بڑا کام شروع کیا ہے ..... آپ کی صداقت اور خلوص نیت میں بھی شک نہیں اور علم و فضل علی الخصوص، مذہبی معلومات کا درجہ تو میری تعریف سے بھی بلند ہے۔ یہ چیزیں ہمیشہ ہماری بد قسمت قوم کو میسّر نہیں آتیں، ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ یہ تمام قوتیں ضائع جائیں اور قوم آپ کی قابلیتوں سے محروم ہو جائے ....“

ہمارا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے الہلال کے مقاصد پر ایک جامع سلسلۂ مضمون شروع کریں گے اور ایک مرتّب صورت میں بتلادیں گے کہ ہمارے سفر کے حدود و مقاصد کیا کیا ہیں؟ لیکن بعض مسائل درمیان میں ایسے آگئے جن پر بے اختیار قلم کو حرکت ہوئی اور تمہید سے پہلے اصل کتاب شروع کر دینی پڑی۔ لیکن ہم اپنے مکرم دوست کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس ضروری سوال کو چھیڑ دیا۔

انھوں نے جن الفاظ میں میرے مذہبی افکار و تحریرات کی تعریف کی ہے، یہ ان کا بزرگانہ حسن ظن ہے لیکن بلا شائبہ انکسار عرض کرتا ہوں کہ اس کی اہلیت کسی طرح اپنے اندر نہیں پاتا۔ ممکن ہے کہ مذہبی باتیں تھوڑی بہت مجھے معلوم ہوں لیکن قرآن کریم کے معارف تو اتنے ارزاں نہیں جس کو میں اپنی حرف شناسی دے کر خرید سکوں۔ میں تو ان کے خط میں اپنی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کر بے اختیار کانپ اٹھا۔ اگر اس کے حقائق و اسرار

الہلال کے مقاصد

اور

پولیٹکل تعلیم

اس ہفتہ ہمارا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھیں گے، لیکن ایک بزرگ دوست کی تحریر نے اور زیادہ ضرورت پیدا کر دی۔ وہ لکھتے ہیں:

"....ان سات نمبروں کو بغیر ایک حرف چھوڑے ہوئے پڑھ لینے کے بعد بھی صاف صاف معلوم نہیں ہوتا کہ آپ قوم کو کس قسم کی پولیٹکل تعلیم دینا چاہتے ہیں، ایک بہت بڑا بنیادی اصول جو آپ کا معلوم ہوتا ہے اور اسی نے آپ کی بے انتہا عزت میرے دل میں پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے تمام امراض کا علاج مذہب اور قرآن کو سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان میں اسلام کی اصلی نہ کہ رسمی روح پیدا کی جائے۔ اس اصول کو اور بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں، کہتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ آپ سے بڑھ کر اس کو کوئی عمل میں نہیں لا سکتا۔ ابھی صرف چند تحریریں ہی آپ کی نکلی ہیں، لیکن انھی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی نظر قرآن مجید اور اس کے حقائق و معارف پر کیسی وسیع اور گہری ہے؟ لیکن معاف کیجیے گا آپ اپنے مذہبی رنگ میں پالیٹکس کو بھی غلط ملط کر دیتے ہیں اور اس طرح ملا دیتے ہیں کہ پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری

---

* الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء: الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ کو منظر عام پر آیا تھا۔ ایک مصور ہفتہ وار رسالہ تھا۔ پہلے شمارے میں آزاد کے تینوں مرشدوں، سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور سید محمد رشید رضا کی تصویریں تھیں۔ یہ مضمون جلد اوّل، شمارہ ۸ میں شائع ہوا تھا۔

کان بہرے ہیں، اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو "سراج منیر" کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے اسے ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہوجائیں گے

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ — قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لیے کہ

النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ — انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کردیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت سے نہیں دیکھا مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ اور نہ پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدار کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے، جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں، مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہوسکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں اِمَامٌ مُّبِیۡنٌ، حق الیقین، نور و کتابٌ مبین، تبیاناً لکل شیٔ، بصائر للناس، ھادی واھدی الی السبیل، جامع اضراب و امثال، بلاغ للناس، حاوی بحر و بر،

کے فہم کے لیے عربی دانی کی ضرورت ہوتی تو میں عربی میں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں اگر مذہبی معلومات کی ضرورت ہوتی تو ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اگر کتب تفاسیر کے مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کتابوں کی میرے پاس کمی نہ تھی، لیکن اس کے لیے یہ تمام باتیں بے کار ہیں، پہلی شرط اتقا اور تزکیۂ قلب ہے اور ساری محرومی اسی میں ہے کہ اس سے محروم ہوں۔ جو دل زادِ تقویٰ سے محروم اور ہوائے نفسانی و آلائش دنیا پرستی میں گرفتار رہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کے حقائق و معارف کا تجلّی گاہ نہیں بن سکتا۔ علم و فضل اس کے لیے بالکل بیکار ہے اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔ ذَالِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب
اینہا ہمہ آرائش افسانۂ عشق است

یقین فرمائیے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں بالکل سچ ہے۔ قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں گو وہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کر لے۔ انصاف فرمائیے کہ جب حالت یہ ہو تو پھر میری اس مقام میں کیا ہستی ہے؟

ان کے خط میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ پولٹیکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں۔

۲۔ ہندوستان میں اس وقت جو پولیٹکل گروہ ہیں ان میں سے الہلال کس کا ساتھ دیتا ہے۔

امر اول کی نسبت گزارش ہے کہ یہ تو جناب نے اس بنیادی اصول کو چھیڑ دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کہیں کہ محراب خوشنما نہیں تو ممکن ہے کہ ہم بدل دیں، لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے تو معاف فرمائیے اس کی تعمیل سے ہم مجبور ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے

دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولیٹکل گمراہیاں صرف اس لیے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست رہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا، ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ "صراط مستقیم" پر لے جانے والی ہے اور "صراطِ مستقیم" کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع و مانع ہے کہ ساری دنیا اُسی کے اندر سمجھیے۔

افسوس ہے کہ طول بیانی کا موقع نہیں، ورنہ اس بحث نے سیکڑوں آیتیں دماغ کے سامنے کر دی ہیں، ایک جگہ فرمایا:۔

اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؕ	(اے پیغمبر) ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی ہے اور نیز ہدایت بخش اور رحمت ہے صاحبانِ ایمان کے لیے۔

سورہ یوسف کے آخری رکوع میں فرمایا:۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؕ	قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ جو صداقتیں اس سے پہلے کی موجود ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں اربابِ ایمان کے لیے ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت و رحمت ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ؕ	ہم نے انسان کے سمجھانے کے لیے اس قرآن میں سب طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

ان آیات میں قرآن کا دعویٰ بالکل صاف ہے وہ ہر طرح کی تعلیمات کے لیے اپنے تئیں ایک کامل معلم ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی تعلیم صاف اور غیر پیچیدہ ہے بشرطیکہ اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ	تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے

اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے، اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو، خواہ سیاسی۔

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ وَيَهْدِيهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵:۱۵)	بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنیوالی کتاب آئی ہے اللہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے اس کو جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔

دنیا کی کونسی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنی نسبت ایسے عظیم الشان دعوے کیے ہوں؟ اس آیت میں صاف بتلا دیا ہے کہ قرآن مجید روشنی ہے اور روشنی ہے تو تمام انسانی اعمال کی تاریکیاں صرف اسی سے دور ہو سکتی ہیں۔ پھر کہا کہ وہ ہر بات کو کھلے کھلے طور پر بیان کر دینے والی ہے اور انسانی اعمال کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کے لیے اس کے اندر کوئی فیصلہ نہ ہو۔ اس ٹکڑے کی تائید دوسری جگہ کر دی کہ:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُم بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ	بے شک ہم نے ان کو کتاب دی جس کو ہم نے علم کے ساتھ مفصّل کر دیا ہے وہ ہدایت بخش اور رحمت ہے ارباب ایمان کے لیے۔

اس کے بعد پہلی آیت میں قرآن کو سبل السلام کے لیے ہادی بتلایا کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اگر آپ کے سامنے پولیٹیکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن سے نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتی ہے اور ہم

تھے یا کعبہ کے اندر شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے تھے کہ اس کی آواز کسی کے سننے میں نہ آئے تو آج خود مسلمان کانوں کی جگہ دلوں کو بند کیے ہوئے ہیں اور شور مچانے کی جگہ گو خاموش ہیں مگر ان کے نفس نے انسانی ہنگاموں کا ایسا غل مچا دیا ہے کہ خدا کی آواز کسی کے کان میں نہیں پڑتی:-

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا	اے پیغمبر جس وقت تم قرآن پڑھتے ہو' ہم تم میں اور ان لوگوں میں جنھیں آخرت کا یقین نہیں ایک چھپا دینے والا پردہ ڈال دیتے ہیں' نیز اُنسے کے دلوں پر غلاف ڈال دیتے ہیں تاکہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ سُن نہ سکیں۔

(۱۷: ۴۶)

پس اگر آپ کو یہ غلجان پریشان کیے ہوئے ہے تو افسوس ہے کہ ہم اسے دور نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کو اپنے مقاصد بالتفصیل بیان کرنے کی مہلت نہیں ملی تو مضائقہ نہیں وہ نہایت مختصر لفظوں میں آج بھی سنائے جاسکتے ہیں۔ ہم بالاختصار عرض کر دیتے ہیں کہ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدّنی، خواہ سیاسی ہوں خواہ کچھ اور وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا صرف یہی ہے کہ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۳: ۵۷) اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقادًا انکار نہیں۔ مگر عملاً یہ حال ہے کہ:-

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵: ۴۵)	انھوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن ان کے دلوں میں

عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا (۱۸:۱) — اپنے بندہ پر قرآن اتارا اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہ رکھی۔

پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے ایک ضروری شعبہ یعنی سیاسی اعمال کے لیے دوسروں کے دروازوں کے سائل بنیں، حالانکہ خود قرآن اُن کے پاس ایک حکم اور ایک امام مبین ہے۔

وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۱۲:۶) — اور ہر شے کو ہم نے اس کتاب واضح (قرآن) میں جمع کر دیا ہے۔

دوسری جگہ اس کو تمام امور کے لیے قولِ فیصل بیان کیا:

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (۸۶:۱۳) — بیشک یہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے، تمام اختلافات و اعمال کے لیے اور کوئی بے معنی اور فضول بات نہیں۔

مسلمانوں کی ساری مصیبتیں صرف اسی غفلت کا نتیجہ ہیں کہ انھوں نے اس الٰہی تعلیم گاہ کو چھوڑ دیا اور سمجھنے لگے کہ صرف روزہ و نماز کے مسائل کے لیے اس کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ اپنے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی اعمال سے اسے کیا سروکار؟ لیکن وہ جس قدر قرآن سے دور ہوتے گئے اتنا ہی تمام دنیا ان سے دور ہوتی گئی اور جس راہ میں قدم اٹھایا گمراہی کی ظلمت سے دوچار ہوئے۔ اس وقت کی پیشین گوئی پہلے ہی قرآن نے کر دی تھی:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (۲۵:۳۰) — قیامت کے دن رسول اللہ عرض کریں گے کہ خدا میری امت نے اس قرآن کو ہذیان سمجھا (اور اس پر عمل نہ کیا)

ہم نہیں سمجھتے کہ اگر نزولِ قرآن کے وقت مشرکانِ مکہ اس سے اعراض و اغماض کرتے تھے تو ان میں اس سے زیادہ کیا تمرد و سرکشی تھی، جتنی آج صدیوں سے تمام مسلمانانِ عالم اور ان کا ہر طبقہ خواہ وہ مدعیانِ ریاستِ دینی کا ہو، یا مسند نشینانِ تختِ دنیوی کا، بلا استثناء کر رہا ہے؟ وہ اگر قرآن کی تلاوت کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ؕ

ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ اس دین کے راستہ کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہی وہ راہ ہے جس کی نسبت یوسف صدیق نے قیدخانہ مصر میں یہ کہہ کر اپنا وعظ ختم کیا تھا۔

ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲:۴۰)

یہی سیدھا راستہ ہے مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے۔

اور جس کی نسبت داعیِ اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہہ دے:

ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲:۱۰۸)

میرا راستہ یہ ہے، تم سب کو اللہ کی طرف بُلاتا ہوں، میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی دین کے راستہ پر ہیں۔

الحمدللہ کہ ہم "وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ" کے زمرے میں داخل ہیں اور اسی لیے جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بلکہ اس چوتھی راہِ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی بتلائی ہوئی راہ صراط المستقیم ہے۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا ۣ وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ۚ

مسلمانوں کے سامنے خود ان کی پولیٹکل راہ موجود ہے۔

آپ پوچھتے ہیں کہ "آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹکل گروہ موجود ہیں آپ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟" گذارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں

ایمان نہیں۔

خدا تم کو اپنے کلام کے آگے سربلند کرتا ہے، تم کیوں اس سے گردن موڑ کر انسانوں کے آگے ذلّت کا سر جھکاتے ہو؟ اس کے سوا الہلال کی تعلیم کا اور کوئی مقصد نہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا	اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی تھی
اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ	جو خدا کی طرف دعوت دے اور عمل اچھے
اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۱ : ۳۳)	کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولیٹکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے؟ پھر آپ نے ان کو گنوا بھی دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے۔ یہ تین راستے تو آج آپ کے سامنے نمودار ہوتے ہیں مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر ہزاروں ہستیاں منزل مقصود تک پہنچ چکی ہیں۔ آسمان و زمین کے فاطر نے جس وقت انسانوں کو آنکھیں دیکھنے کے لیے عطا فرمائیں اسی وقت اس کے سامنے یہ راہ بھی کھول دی تھی۔ آدم نے اس پر قدم رکھا اور نوح نے پتھروں کی بارش میں اس کا وعظ کہا، ابراہیم نے اسی کی نشانی کے لیے قربان گاہ بنائی اور اسمٰعیل نے اس کے لیے اینٹیں چنیں، یوسف نے مصر کے قید خانے میں جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اس نے راہنمائی کی، اور موسیٰ جب وادی ایمن میں روشنی کے لیے بیقرار ہوا تو اسی راہ کی تجلّی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی، گلیل کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اسی راہ پر تھی اور پھر جب خداوند سعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اس نے دنیا کو دعوت دی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا	اللہ نے تمھارے دین کا وہی راستہ
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ	ٹھہرایا ہے جس پر چلنے کا اُس نے
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا	نوح کو حکم دیا، اور اے پیغمبر وہی
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	تمھاری طرف اُتارا گیا اور اسی کا ہم نے

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیر الامم بنایا اور دنیا میں اپنی نیابت اور خلافت بخشی، پس اپنے درجہ کو ہر مسلمان محسوس کرے اور افسردگی، بے ہمتی، خوف و مرعوبیت کی جگہ اپنے اندر بلندی، خودداری، طاقت اور استحکام پیدا کرے۔

۳۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک عادلانہ قوت قرار دیا اور فرمایا کہ "جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" ان کا ہر کام عدل و اعتدال پر مبنی ہوگا، پس مسلمانوں کو ہر موقع پر میانہ روی اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۴۔ مسلمان دنیا میں صلح و امن کا پیام ہیں، انھوں نے تلوار بھی اٹھائی ہے تو صلح کی حمایت میں، پس فتنہ و فساد اگر اوروں کے لیے معیوب و جرم ہے تو ان کے لیے تو معصیت و فسق ہے۔ دنیا میں جن قوموں نے فتنہ و فساد اختیار کیا وہ قہر الٰہی سے مغضوب و مردود ہو گئے۔

۵۔ قرآن ان کو سکھلاتا ہے کہ:۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى	ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ	پرہیزگاری کے کاموں کے لیے، گناہ اور
وَالْعُدْوَانِ ۔	فساد کے لیے نہیں۔

وہ دنیا میں خدا کے پاس اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ نیکی کی حفاظت کریں اور فساد کو روکیں، پس ہر اچھی بات کرنے والوں کے وہ مددگار ہوں خواہ وہ گورنمنٹ ہو یا کوئی اور قوم۔

۶۔ قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استبداد و اقتدار کی مخالفت کرے اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جو انسانوں کو محض اپنی رائے اور خواہش کے بنائے ہوئے احکام کی تعمیل پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ	یہ حق کسی بشر کو نہیں پہنچا کہ اللہ تعالیٰ
اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	اسے کتاب اور عقل اور حکم اور نبوت
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا	عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ
لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳: ۷۹)	اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو

جس چیز کا اختیار انبیاء کرام کو نہیں اس کا حق کسی دنیوی طاقت و حکومت کو بھی

اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیم کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں؟ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت (والغیرۃ من شان حضرۃ الربوبیہ) اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں:۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

مگر وہ کس راہ پر لے جانا چاہتی ہے

پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالیٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوجیے صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔

۱۔ اسلام کا اساس اولیں اصول توحید ہے، وہ سکھلاتا ہے کہ صرف خدا کو مانو اور صرف خدا کے آگے جھکو، اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور اسی کی اعانت پر اعتماد کرنا چاہیے (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) جس طرح خدا کی ذات کو ایک ماننا توحید میں داخل ہے اسی طرح اس کی صفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرنا جزوِ توحید ہے۔ پس خدا کے سوا کوئی نہیں جس کا حکم انتہائی حکم ہو، کوئی نہیں جو عاجزی و تذلل کا مستحق ہو، کوئی نہیں جس کی جبروت و عظمت کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ ہو، اور کوئی نہیں جو ڈرنے اور خوف کرنے کے لائق ہستی ہو۔

نفس کے لیے مفید ہوں گے اتنا ہی گورنمنٹ کے لیے، نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لیے اس کو بھولنا نہ چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا۔ البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی، اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اسی میں یقین کرتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور یورپ خود اسی اصول پر کاربند ہو کر آزاد ہو چکا ہے۔ ہم انگلستان سے آج اسی چیز کے طالب ہیں جس شے کے لیے وہ خود کل تک بے قرار تھا۔ بے شک اگر اسلام کی بتلائی ہوئی پالیٹکس کی راہ ہمارے سامنے ہوگی تو ہم ایک طاقت ور گروہ ہوں گے، بے خوف ہوں گے، اظہارِ حق میں بے باک ہوں گے، کیونکہ ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن اسلام ہی کے بتلائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے قانون اور حکومت بھی ہماری طرف سے بے خطر ہوگی۔ چونکہ ہماری راہ صاف اور غیر مشتبہ ہوگی اس لیے ہماری نیت اور ہماری زبان بھی ایک ہوگی ہم جوش میں بھی آئیں گے لیکن ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر ہوگا، کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ فساد مت کرو۔ اب تک مسلمانوں کے جو پیشوا قوم کو چپ اور غافل رکھنے کی سعی کرتے رہے اور اندر ہی اندر پھوڑے کو پکانا اور راکھ کے اندر چنگاریوں کو دبانا چاہتے تھے لیکن اگر ہم اس راہ پر آئے تو ہمارے زخم دل پر نہیں بلکہ کھلے ہوئے چہروں پر ہوں گے، ہماری خواہشوں اور شکایتوں کے پھوڑے اندر پک کر امن کے جسم کو نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ پھوٹ کر بہہ جائیں گے۔ ہم شور ضرور مچائیں گے مگر پھر دل میں کچھ باقی نہ رہے گا، فریاد ضرور کریں گے مگر اندر شکایتوں کی آگ کو نہیں پالیں گے۔

پس گورنمنٹ کی بھی مصلحت یہی ہے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دے، کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لیے، نیز تمام عالم کے لیے یکساں طور پر مفید ہستی ہو سکتے ہیں۔

یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں

نہیں مل سکتا۔ البتہ وہ ملت اور جماعت کے اندر اپنی عقل کو مخفی بتلاتا ہے اور کہتا ہے (یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ) "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے"، پس اس کے نزدیک وہی حکومت جائز ہو سکتی ہے جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو، اسی بنا پر اس نے مشورے کا حکم دیا ہے۔

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ	اور ان کو حکم دیا کہ آپس میں مشورہ کر کے تمام کام انجام دیں، اپنے پیغمبر تمام امور سلطنت کو مشورے کے ساتھ انجام دیا کرو۔

پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں۔

یہ اصول ہیں جن سے ہم اپنی پولیٹیکل پالیسی تیار کر سکتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی کاسہ لیسی کی ضرورت ہے نہ اکسٹریمسٹ کی۔ اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند مگر بے خوف جماعت ہوں گے اور ہم سے کسی فریق کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہوگا۔ ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے سعی کریں گے۔ لیکن ہماری سعی فتنہ و فساد اور شورش و بغاوت سے بالکل پاک ہو گی قرآن نے ہم کو سکھلایا ہے کہ (لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا) امن کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہے اور اس امن میں ہم آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں، پس اب باغیانہ شر و فساد اور مغویانہ قانون شکنی اصلاح کے بعد زمین کو آلودۂ فساد کرنا ہوگا اور یہ یقیناً خدا کا جرم اور عصیان ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ پس جو لوگ ملک میں فساد پھیلاتے ہوں خواہ وہ ہندو انارکسٹ ہوں یا جرائم پیشہ جماعتیں ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ان سے دوری ڈھونڈیں اور بن پڑے تو ان کے دفعیے کے لیے کوشش کریں۔

گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے

الجہاد فی سبیل الحریت

"کسی سے مت ڈرو۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو" (۱۷؛ ۱۳ قرآن شریف)

یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے بلکہ اس رب العلمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے سامنے کھول دی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اس کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوتِ حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ، نہ صلہ کی توقع نہ داد کی امید، اس راہ کے داعی کریم کو جو حکم دیا تھا وہ ہمارے سامنے موجود ہے:-

فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ط اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ط لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ط اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ط

(اے پیغمبر) تو ان کو دعوت دے اور جو حکم دیا گیا ہے اس پر قائم ہو جا، ان کی خواہشوں پر نہ چل اور ان کو کہہ دے کہ تمام اتری ہوئی کتابوں پر میرا ایمان ہے اور مجھ کو حکم ملا ہے کہ عدل کروں۔ وہی اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے ہمارا عمل ہمارے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، اللہ نے ہم سب کو ایک جا جمع کر دیا اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

مسلم لیگ مسلمانوں کی پولیٹیکل راہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ط

ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کیلیے ایک پتھر بن کر رہی۔

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ" جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اُٹھا سکتی تھی ایک معمول، جو مسمرائزر کے ارادہ پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل، جو صرف زمین کے لیے بار ہو۔ ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو ایک پتھر، جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ، جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔

اسلام کی تذلیل کا ایک دردناک منظر

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جو آہ تم آہ! کہ مسلم تھی جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی، جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی۔ جو دنیا میں اس لیے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگان الٰہی کو آزاد کرائے۔ جو اس لیے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے، نہ اس لیے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے۔ جو اس لیے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں یہی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں پڑی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دے، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے۔ جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی۔ تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے، نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے۔ جس کے قدموں پر قوموں کا گرنا تھا تاکہ وہ اٹھائے، نہ یہ کہ وہ خود خاک مذلت

الجہاد فی سبیل الحرّیت*

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وقت سحر
اک نعرہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

تاریخ آزادی ہند، جو لکھی جائے گی

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا، جب کہ ہندوستان کا آخری انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حرّیت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کیجیے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ جانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر

---

* یہ مضمون الہلال کی جلد اول شمارہ ۲۳ میں شائع ہوا تھا۔ پہلے صفحے پر اس میں ایک تصویر ہے جس میں پوپ بلغاریہ کے فرماں رواکو صلیبی جنگوں میں فتح کی خوشی میں اعزاز دے رہے ہیں۔ اس کے نیچے ایک تصویر میں ایک مشین گن ہے جس میں ترک بلغاریہ کی فوج کے پہلے دستے پر حملہ کر رہے ہیں۔ ان دونوں تصویروں کا آپس میں اس مضمون سے تعلق ظاہر ہے۔

تاکہ نڈر ہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خود مختار ہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں کی آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استعباد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لیے ہو کہ تم جان فروش ہو، تاکہ راہِ حق میں سر بکف ہو۔ پھر یہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں، لیکن اے بدبختو! تم ان سے محروم ہو۔

تاریخِ ہند کا ایک خاص باب

اگر تم کہو کہ تاریخِ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو، اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بیشک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منھ اور زبان پر قفل چڑھا دیے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا، ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چھپ رہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

افسانہ استبدادِ ہند

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے تھے، ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جارہی تھی، اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیے جارہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے، مگر آبپاشی کے لیے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ تم وفادار ہو، مگر اسلحہ کو چھونے کی اجازت نہ تھی

وغلامی پر لوٹے اور ٹھکرائے جائے۔

جو اُس ملتِ حنیفی کی پیرو تھی، جو دنیا میں صرف اس لیے ہے کہ حاکم ہو، نہ اس لیے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے، جو اس اللہ کے منھ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب واقدس میں نہیں ہے؟ جو "مسلم" تھی، اور اس لیے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی، جو اوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجودِ ذلیل سے اس نے روکا۔ جو مسلم تھی، پس چاہیئے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں، کیونکہ اس کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لیے ہے پیچھے رہنے کے لیے نہیں۔ وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی وجسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہے۔

دماغ سوچنے کے لیے ہے نہ کہ غفلت کے لیے، پس تمہارے پاس دماغ ہے تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو کہ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے، میری روح بے چین ہے، میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں، اور میرے ہیجانِ افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آگیا ہے، یہ کیا ہے کہ میں ایک شئے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آرہی ہے، میں سُن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے؟ آہ! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں۔ مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دینِ قویم کے پیرو، خطابِ اسلام سے متّصف، اور امانتِ الٰہی کے حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لیے ہو

فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو "مسلم" تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلّت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے، لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصّہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومتِ خود اختیاری ملی، تو صرف ہندوؤں قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے، کیونکہ انھوں نے پالٹیکس کو شروع کیا اور پھر پالٹیکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے یہ سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں، یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں، اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں، بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔

مسلم لیگ

بے شک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا، لیکن کیوں کر؟ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے؟ نہیں بلکہ

آں ہم بسعی غمزۂ مردم شکار دوست

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے، اب انھیں کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جاکر ان کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے تو

کہ تم غدّار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار (۷۰،۰۰۰) سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی، مگر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور حفظ صحت کے انتظام سے محروم تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیزِ رنگ و زبان اور امتیازِ حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں، اور جو راہ اپنے لیے باز ہے، وہی سب کی آمد کی منتظر، لیکن جب پاؤں اٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی، تو تمام دروازے بند تھے اور امتیازِ حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے، جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے وقف کر دیا لیکن عین اس وقت جب کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے، بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لولہ لنگڑا بنا دیں۔ جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لیے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں جادو کا ایک منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "وقت نہیں آیا" اور یہ اسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، بس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روگ بن کر پڑے تھے۔

مسلمانوں کے ملکی کارنامے

اس کے بعد وہ آنے والا مورّخ، جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی، چنگیز خاں کا تختِ قہر نہ تھا۔ بس ملک آزاد ہوا، اور انگلستان نے اپنا

کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے، لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہوگی، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان و کرم پر اعتماد ہوگا۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوقِ قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیئے، لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہیئے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو۔

ملک کی غلامی کے لیے مسلمانوں کی قربانی

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال کہ "تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی، اس لیے تمہارا پالٹیکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنا غصب کردہ حقوق چھین لو" غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت کی چال تھی؟

وہ رہزن اور پھر ایسے کمیں سے

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے، جب کہ تم اس قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو؟ یاد ہوگا کہ ہم نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہندوستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ کو اپنے فوائد کے استحکام کے لیے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی، کہ کوئی ایک قوم ملک کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی اُمیدوں کی قربانی کے خون سے اس کے اغراض کے درختوں کو سینچے۔ مسلمانوں نے خود اپنے تئیں اس قربانی کے لیے پیش کر دیا، اور جس بوجھ کے اُٹھانے سے ہندوستان کی تمام قوموں نے انکار کر دیا تھا، اس کے لیے اول روز خود ہی اپنی گردن پیش کر دی۔

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند نہ کر دیا ہوتا، تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسوں روتے۔ وہ دیکھتے کہ یہ کیسا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے "ہندو مسئلہ" ہو گیا ہے،

کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لے کر اس کے سینے کی پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے، تا کہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے، تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟ نادانو چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالٹیکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہو گی، جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے اسے چاندی اور سونے کے پوجنے والو! تم نے کی۔ تمہارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر، اور تمہارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بُت کدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدہ کا سَر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔ تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کود رہے تھے تا کہ اور خسف و غرق ہو، لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے، پر اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا۔

سوال چھت کا نہیں بلکہ ان اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے، دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں پالیٹکس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اولین گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی امنگ، اپنے جوش، اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارۂ چشم، اور جنبش دستِ دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالٹیکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا۔ اور راہِ مقصود سے باز رہنے کے لیے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صَرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا۔ اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صَرف کیا جائے۔ یہ اس خمار کے لیے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا۔ اصل شئے قوم کا یہ محسوس

وہ اپنے تئیں اب امید کا مستحق ثابت نہ کر دے۔ قوم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ نہ صرف اہم امور سیاسہ کے لیے، بلکہ ادنیٰ درجے کی سیاسی ضروریات کے لیے بھی لیگ بے کار ہے اور اس لحاظ سے سخت مضر، کہ قوم کا آئندہ راستہ روک کر کھڑی ہے۔ پس عین اس وقت جب کہ صاف صاف یہ ہے کہ ہم لیگ کو کالعدم یقین کر کے اپنی راہ ڈھونڈھ رہے ہیں اور دل کے ایک نئے ٹھکانے کی فکر میں (الحمدللہ) کہ پہلے سے اچھی حالت میں ہیں، لیگ مکرر سامنے آئی ہے اور کہتی ہے کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ اور اب پھر مجھی کو دیکھو! اچھی بات ہے۔ پہلی پہر خواہ کیسی ہی بے مزہ گزری ہو، لیکن رات کا آخری حصّہ تو ابھی باقی ہے، اور گو مرغ سحر کی چیخیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہیں، مگر ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ جو کچھ گزر چکا ہے دن تھا، اور دراصل شبِ وصل اب سے شروع ہوئی ہے۔

وصال پر ہے جو وصل، امتحاں کر دیکھو
امیر، یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

اگر لیگ پھر ہمارے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ ہم میں اور اس میں ایک راضی نامہ ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اسے طلاق دے دی تھی لیکن اب پھر وہ آنا چاہتی ہے تو عقد رجعت سے انکار نہیں۔ البتہ اس کو تو اپنی غیرت کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ "حلالہ" کو منظور کر لیں۔

یہ راضی نامہ بالکل ایک منصفانہ معاہدہ ہوگا اور شرائط میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ لیگ پچھلی باتوں کو بھلا دے، اپنے گھر کو صحبت اغیار سے خالی کرے۔ اور ہم سے لگاؤ رکھنا ہے تو غیروں سے لگاوٹ چھوڑ دے۔ پھر ہم بھی دوسرے ٹھکانوں کی فکر چھوڑ کر اسی کے ہو رہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ معاہدہ آخری ہوگا، اگر پھر کبھی اغیار کی پرچھائیں بھی نظر آئی تو

بس لیجیے سلام، اپنا بھی وعدہ ہے کسی سے

اس کو بھی کھول کر کہہ دیں کہ صحبت غیر سے کیا مطلب ہے؟ ابھی اس کا

اور مسلمانوں کو بہ حیث القوم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاؤس آف کامنس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر "مسئلہ ہند" کے معنی ہندو مسئلہ کے ہیں۔ حالانکہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمے داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی، تو اے اپنے تئیں بھولنے والو! تمہارے سر تو خدائے ذوالجلال کی طرف سے تھی! دنیا میں صداقت کے لیے جہاد، اور انسانوں کی انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ پس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو، اور پھر اپنے آپ کو بھلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمہارے لیے جگہ نہیں۔

لیکن میں عرض کروں گا کہ ذرا صبر کیجیے اور زبانوں کو نہ روکیے کہ دراصل شکوے شکایت کا وقت پہلے نہ تھا، وقت تو اب آیا ہے۔ ہم بھی اسی روزِ آزمائش کے منتظر تھے۔

محض جستجو کے ارادے سے منزل نہیں مل سکتی، آپ سرخی اور چونا مہیّا بھی کر لیں، پھر بھی مکان نہیں بن سکتا جب تک کہ معمار نہ ہوں۔ شاید لیگ کی یہ نئی ادائیں تو بہ شکن ضرور ہیں، لیکن ابھی ایسی نہیں ہیں کہ واپس لیا ہوا دل پھر اس کے حوالے کر دیں۔

نظام ترکیبی کی اصلاح اور نصب العین کی جستجو یقیناً ازالہ مرض کے لیے اصلی علاج کی تلاش ہے۔ مگر تلاش کا ہونا ہی صحیح تشخیص اور مفید نسخے کے مہیّا ہو جانے کے لیے کافی نہیں، ضرورت ہے کہ تشخیص کی جستجو صحیح راہ پر ہو اور نسخہ جو تجویز کیا جائے وہ دفع مرض کا اصلی علاج ہو۔ لیگ اگر یہاں تک کے لیے راضی ہو گئی ہے تو زہے نصیب! لیکن ابھی یہ پوچھنا باقی ہے کہ

کہیے کچھ بڑھ کے بھی ہمت ہو گی

راضی نامہ

اصل یہ ہے کہ لیگ کی طرف سے پوری مایوسی تھی اور ہے، جب تک کہ

تاہم یہی بہتر ہے کہ آپ مسلف گورنمنٹ کو اپنا نصب العین سیاسی قرار دیں اور آج کے دن سے سفر شروع کر دیں۔ اگر ایک دلکش منزل آپ کے سامنے ہوگی تو پھر سفر کی تکلیفیں بھی بھول جایئے گا۔

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل است

تیس برس سے جو پیچ اس مسئلے کی نسبت پڑے ہوتے ہیں ان پر ادھر بار بار لکھا جا چکا ہے۔ ہندوؤں کی مجارٹی، مختلف عناصر کی باہمی رقیبانہ کشاکش، ہندو مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کے اثرات، ملک کی عدم تیاری، مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں باہر کی حکومت کی بہتری اور اسی طرح کے وہ تمام وساوس ونزعات نفسانیہ جو مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں کیے گئے تھے۔ ہمیں حسن ظن ہے کہ اب بھلائے جا چکے ہیں۔ سلف گورنمنٹ اسی لیے نہیں مانگی جاتی کہ ملک کی استعداد اور عدم استعداد کا افسانہ دہرایا جائے۔ مقصود ایک نصب العین کو سامنے رکھنا، اور بتدریج اس تک پہنچنا ہے۔ ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شئی قوموں کی معنوی قوت ہے، جو اس کے اخلاق اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد اور در اصل ہماری اصطلاح میں خشیۃ الٰہی، اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وَكَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسلام کی طاقت کبھی بھی وابستۂ دام قلت و کثرت نہیں رہی ہے اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ یہ تمام وساوس اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ اگر روز اول سے یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین اعلیٰ کی طرف دیکھنے لگتے تو اور کسی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں

وقت نہیں آیا ہے کہ آپ سے عزتِ عشق کے انتہائی مطالبات کیے جائیں۔ ہمیں اس سے کوئی چڑھ نہیں کہ گورنمنٹ سے پورے تعلقات رکھیے، کانگریس کی موجودہ حالت کی نظیر آپ کے سامنے ہے، اب تو گورنمنٹ خود امیدوں کی جرأت افزائی کر رہی ہے۔ لیکن تعلقات کے یہ معنی سمجھیے کہ اچھے وقتوں میں اپنے وقار اور متانت کے تحفظ کے ساتھ دو چار گھڑی ہنس بول لیا۔

شرائط صلح، نصب العین

سب سے مقدّم تر مسئلہ پولیٹیکل جد و جہد کے لیے ایک نصب العین کی جستجو ہے، اور اگر آپ کو زندہ رہنا ہے تو کسی مقصدِ بلند کی انگیٹھی سلگائیے جو ہر وقت آپ کے دل کو گرم رکھے۔ یہ بار بار کہا جا چکا ہے۔ کوئی قوم اپنی جد و جہد میں اصلی سرگرمی اور جذبات و قویٰ کا ایثار نہیں کر سکتی، جب تک اس کے سامنے ایک جاں طلب نصب العین نہ ہو، اور اب آپ کو کیا سمجھائیں کہ آزادی تو وہ مقصود ہے جس کا تصور بھی دل کی زندگی کے لیے کافی ہے۔

رہے پہلو میں وہ یا اس کا خنجر عرض دل ٹھہرتا ہے ہم نشیں سے

لیگ تلاش میں نکلی ہے تو اس کو بھٹکنا نہیں چاہیے۔ ہندوستان میں سیاسی نصب العین کا سوال ایک ہی ہے۔ گو اس بارے میں ہماری راہ عام شاہراہ سے الگ ہے، اور ہم اس چیز کو دوسری طرف سے آ کر لینا چاہتے ہیں، لیکن لیگ سے اس کی توقع لاحاصل ہو گی، پس اس کو چاہیے کہ اس ایک ہی نصب العین کا اعلان کر دے، کہ "انگلستان کے تحت ہندوستان کی حکومتِ خود اختیاری"۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یاد رکھو کہ یہ نصب العین جو ہم نے تجویز کیا، تو کوئی بہت اونچے درجے کی بات نہیں کہی کہ ہماری ہمّت کا آشیانہ اس شاخ سے بھی بلند تر جگہ ڈھونڈتا ہے۔

سجدے کر کے اپنے عیش کدوں میں چھپ جائیے گا، اور وہ آسمان سے ڈھونڈتی ہوئی آپ کے سامنے آموجود ہو گی! آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آئیے، لیکن آنے کا ارادہ ہے تو اپنے دل وجگر کی طاقت کو ٹٹول لیجیے کہ اس طریق عشق کی شرطیں آپ کو معلوم نہیں۔

ترکِ جان و ترکِ مال و ترکِ سر
در طریقِ عشق اول منزل است

غلامی کے پتلے اور سیاست کی روح کا دعوے

آپ کے گذشتہ اعمالِ سیاست سامنے آجاتے ہیں، تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی، آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تمسخر کیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے۔ ہر خوشامد و غلامی کی غلاظت کا کیڑا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا، نکلتا تھا، اور دعوے کرتا تھا کہ میں مردِ میدانِ سیاست ہوں اور قوم کے پولٹیکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف، اتنے کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی ذرا سی بے مہری بھی گوارا ہو، اس کا دعویٰ ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولٹیکل کارزارِ اعمال کے سپہ سالار ہیں، اور نکلے ہیں تاکہ اس معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں! اربابِ نظر ان ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے، ہنستے بھی تھے اور زمانے کی بوالعجبی پر روتے بھی تھے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اللہ اللہ! جس متاعِ یوسفی کے لیے زلیخائے آبادِ حریت میں تڑپتی ہوئی لاشیں اور کٹی ہوئی گردنیں بھی طلب کی جائیں تو اپنے اوجِ طالع پر ناز کریں کہ مفت ہاتھ آئی، اس کی قافلہ لیگ میں یہ ارزانی، کہ چند کھوٹے درہم ہاتھوں میں لے کر بولیاں بولی جاتی ہیں۔

ملتی، اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال و قتال میں صرف ہو رہی ہیں، اسی کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنیے کہ بہت بڑا نکتۂ عمل کہہ رہا ہوں اور اپنے طرز بیان کا شاکی ہوں کہ اسرار و رموز کی باتیں بھی حسن و عشق کی کہانی بن جاتی ہے۔ اپنے سامنے ایک جاں ستاں جلوہ گاہِ حسن پیدا کر لیجیے پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی، اغراض پسندی، باہمی جنگ و جدال، ایثار و فدویت فراموشی، اور ہر قسم کے اشغال ضلالت صرف اس لیے ہیں کہ سامنے کوئی کشش نہیں، اور جس بلائے عقل و ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں، آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔ جس دن ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی "آزادی" کے حسن پر پڑ گئی، پھر آپ خود بخود تمام قصے بھول جائیں گے۔

مشکلاتِ راہ

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب العین اپنے لیے تجویز کرنا چاہئے۔ مگر مشکلاتِ راہ سے گھبراتے ہیں۔

اے اخوانِ غفلت شعار! نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتلِ سیاست ہے، یہ مشہدِ آزادی و حریت ہے، آپ کا سی سالہ میدان لہو و لعب نہیں ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ یہ آپ سے کس کمبخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھیے؟ یہاں آیئے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے ہر لمحے مصائب کا نزول ہو گا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں، حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے۔ یہاں ہوس پرستوں کا گزر نہیں۔ اس میدان کے مرد وہ جاں فروشان الٰہی اور مجاہدینِ حق پرست ہیں، جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں۔ سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکر یہ کے

دے دی، یقیناً اس کی سزا بھگتنی تھی اور اچھی طرح بھگت لی۔ اب اگر آپ کے دفترِ تعزیرات میں چند سال سزا کے اور باقی رہ گئے ہیں ہماری قید کے پچھلے سالوں کے چال چلن پر نظر ڈالیے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ قیدی اطاعت شعار ہو تو آخر کے چند مہینے معاف کر دیے جاتے ہیں، بس آپ بھی رحم کیجیے۔ ہم کو چھوڑ دیجیے اور حکم دیجیے کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں۔ محض لیگ کے قواعد و ضوابط کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس مسئلے کا فیصلہ نہ ہو۔

فی الجہاد فی سبیل الحریت

مضمون بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس بارے میں ہم اپنے خیالات کے ہجوم کے آگے مجبور محض ہیں۔ بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں، لیکن جو باقی ہے اس کی ترجمانی کو اپنی زبان کی جگہ آپ کے دل کے سپرد کرتا ہوں، اور صرف چند لفظوں کے عرض کرنے کی اور اجازت چاہتا ہوں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں اب خدا کے لیے بسترِ مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ "مسلم" ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔ کب تک اس دینِ الٰہی کو اپنے اعمال سے شرمندۂ عالم کیجیے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسائیے گا؟ اور خود نہ روئیے گا؟ اور کب تک ہندوستان میں اسلام کی قوت کا خانہ خالی رہے گا؟ اگر مصائب کا تازیانہ غفلت کی ہشیاری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہو چکا ہے؟

یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرضِ دینی، اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق

اصلاح وتغیّر نظام

آخر میں ہم چند الفاظ لیگ کے نظام کی تبدیلی کی نسبت بھی کہہ دینا چاہتے ہیں، نہیں معلوم کارفرمایانِ لیگ نے اس کا کیا مطلب سمجھا ہے، مگر ہم نے مدتوں سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے سوا چارۂ کار نہیں۔ یاد رہے کہ لیگ کی اصلی بنیادی گمراہی اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔ دنیا میں تمام کاموں کے لیے تقسیمِ عمل کا اصول ہے، اور پھر ہر گروہ کے حالات مختلف، اور اس لیے ایک ہی کام کے لیے سب موزوں نہیں ہوسکتے۔

مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ پولٹیکل کاموں کے لیے بھی طبقہ خواص وامرا کی رہنمائی میں ہاتھ دیا جو سر سے لے کر پاؤں تک ہزاروں زنجیروں میں پڑا ہوا ہے اور آپ سے بھی ملے گا تو انھیں زنجیروں میں جکڑ بند کرکے چھوڑے گا۔ اس کے پاس یا دولت ہے یا زنجیریں۔ تیسری شے نہیں ہے۔

دراصل ان بزرگان خواص کا بھی اتنا قصور نہیں، جس قدر کہ آپ کا قصور ہے۔ آپ ان کو اپنے میں کھینچتے ہیں تو ان کو آنا پڑتا ہے، حالانکہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ ہم بھی ان کی جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو وہ کررہے ہیں پس لیگ کی زندگی کے لیے ایک قدم کام یہ بھی ہے کہ وہ اس امر کا قطعی فیصلہ کردے، اور اپنے پالٹیکس کی باگ دولت کے ہاتھ سے نکال کر دماغ کے سپرد کردے۔

قید کی بقیہ میعاد

وقت آگیا ہے کہ اشخاص کی جگہ قوم کے ہاتھ میں لیگ دے دی جائے اور طبقہ خواص کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا جائے کہ اب آئندہ کے لیے معاف کیجیے اور ہمارے قصوروں کو بخش دیجیے۔ ہمارے قصور واقعی بڑے سنگین ہیں، ہم نے آپ کی گاڑیاں کھینچیں، پھولوں کے ہار پہنائے، تو دجالور بنے۔ اور اپنی رسی آپ کے ہاتھ میں

اسلام اور نیشنلزم

"اسلام کی دعوت "انسانیت" اور "انسانی برادری" کی دعوت تھی، اس لیے اس کا رجحان ان تمام تعصّبات کے خلاف تھا جو نسل و وطن کے امتیازات سے پیدا ہو گئے تھے۔"

اور صداقت اور انسانی بندِ استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجیے وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لیے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔ پس اٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں، بیدار ہوں، اور اپنے فراموش کردہ فرضِ جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

بن گئی، اور فکر و خیال نے طرح طرح کی کاوشیں شروع کر دیں۔ جس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ قید خانے جا رہے تھے تاکہ ٹرکی کے ساتھ انصاف کیا جائے، اس وقت کسی کو بھی یہ بات نہ سوجھی کہ اس مطالبہ کا اس درجہ انہماک ہندوستانی قومیت کے ساتھ میل کھاتا ہے یا نہیں؟ لیکن اب ہر شخص اسی خیال سے متفکر ہے، اور کوئی قلم و زبان نہیں جس پر یہ سوال طاری نہ ہو۔

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو نکتہ چینی کے رنگ میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، دوسری طرف مسلمان اہلِ قلم ہیں، اور چونکہ خود ان کے سامنے بھی کوئی صاف اور واضح حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے کچھ عجیب طرح کے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اس قسم کی بحثیں دیکھی تھیں کہ اسلام کی وسعتِ نظر، وطنیت کی تنگ نظری کی متحمل نہیں، چونکہ بات کے محل اور موقع پر ان کی نظر نہیں ہے، اس لیے وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام "نیشنلزم" کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو "نیشنلسٹ" نہیں ہونا چاہیئے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مسلمانانِ ہند کی سیاسی بے حسی سے سخت نالاں ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ باہر کے اسلامی مسائل کے لیے ان میں جس قدر دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اُس قدر خود اپنے ملک کے لیے نہیں ہوتی تو وہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی وسعت علایق و احساس ہی اس صورت حال کے لیے ذمّہ دار ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب اسے خیر باد کہہ دینا چاہیئے۔

حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعتِ نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا نہ قومیت کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں، اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈھنی چاہیئے۔

وہ "وسط" کیا ہے؟

اس تحریر سے مقصود اُسی کی جستجو و تحقیق ہے۔ چونکہ مسئلہ کے اطراف وسیع ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انھیں چند حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔

اسلام اور نیشنلزم*

۱۹۲۰ء میں حالات کی رَو نے ذہن و تخیّل کو زیادہ بے لگام ہونے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت کو محض اس کی سادہ اور عملی شکل میں دیکھا اور اُٹھ کھڑے ہوتے۔ انھوں نے اس سے زیادہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ مسلمانوں کا مطالبہ حق و انصاف کے خلاف نہیں ہے، اور اگر ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا تو اس سے دونوں کے دل زیادہ قریب و متفق ہوجائیں گے۔ دراصل ملک کو اس کی موجودہ منزلِ حیات میں اس سے زیادہ کاوش کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ اٹھے اور قبل اس کے کہ ذہن و خیال کو چنیں و چناں کی مہلت ملے، کام شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ایک عام حرکت ظہور میں آگئی۔ مطالبۂ خلافت ہندو مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن گیا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں ہندوؤں نے اس میں ویسی ہی گہری اور بے ریا دلچسپی ظاہر کی جیسی خود مسلمان ظاہر کر رہے تھے، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض حالتوں میں خود مسلمانوں سے بھی ان کے قدم پیش پیش تھے۔

لیکن جب عملی مشغولیت کا دور ختم ہوگیا تو ردّ فعل کا عمل درآمد شروع ہوگیا۔ وہی چیز جو چند دن پہلے ملک کا سب سے زیادہ مقبول عمل تھی، اب ا[illegible] مشتبہ اور بحث طلب چیز

---

* یہ انتخاب "اسلام اور نیشنلزم" سے لیا گیا ہے جو الہلال کے دوبارہ جاری ہونے کے بعد (الہلال ثانی جون ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۲۷ء تک) شائع ہوا تھا۔ اس رسالے کی ادارت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کی تھی مگر مولانا نے اس میں کچھ بہترین مضامین لکھے تھے۔ یہ مضمون بھی اسی میں سے ایک ہے۔

مزید ترقی و وسعت ہوئی، بکثرت آبادیاں اور شہر بس گئے، اور انسان کے باہمی علائق بھی زیادہ وسیع ہوئے، تو "بلدیہ" کے جذبات میں بھی وسعت شروع ہو گئی، اور اب انسان نہ صرف اپنے مسکن و مولد ہی کو بلکہ اس تمام علاقے کو اپنا وطن محسوس کرنے لگا جس کے ایک گوشہ میں وہ آباد تھا۔ پھر بتدریج اس دائرہ میں اور وسعت ہوئی، چھوٹے چھوٹے علاقوں کی جگہ زمین کے بڑے بڑے حصے داخل ہو گئے، یہاں تک کہ اب ایک پوری اقلیم بھی مفہوم وطنیۃ میں داخل ہو جاتی ہے!

نسل کے اجتماعی احساس نے افراد کی کثرت، نسل کے نقطۂ وحدت میں سمیٹ دی تھی۔ اب مسکن و مکان کی وحدت نمایاں ہوئی اور اس نقطۂ وحدت نے نسلی دائرہ سے زیادہ وسیع و عام دائرہ اپنے گرد کھینچ لیا۔ یہ دائرہ مختلف قبیلوں اور نسلوں کو باہم دگر مربوط و متحد کر دیتا ہے۔

"وطنیۃ" کے بعد جذبۂ اجتماع کے لیے "جنسیت" کی منزل نمایاں ہوتی ہے۔ اس سے مقصود انسانی علاقہ کا ایک ایسا وسیع دائرہ ہے جو تمام پچھلے دائروں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، اور ان سب سے بالاتر رشتہ اشتراک پیدا کرتا ہے۔

بہرحال احساس اجتماع کا یہ ایک ایسا دائرہ ہے جو تمام پچھلے دائروں سے زیادہ وسیع ہے اور انسانوں کی بڑی بڑی تعداد اس میں سمٹ آتی ہے

جغرافیہ کی تقسیم پر پہنچکر اضافی وسعت کی تمام کڑیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے، جو حقیقت کے عموم و اطلاق کی آخری منزل ہے اور جہاں پہنچکر یہ سلسلہ ارتقاء درجۂ بلوغ و تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ منزل "انسانیت" اور "ارضیۃ" کی منزل ہے یہاں پہنچکر انسان محسوس کرتا ہے کہ رشتوں، علاقوں کی تمام حدبندیاں اور اضافی نسبتیں جو اس نے بنا رکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی حقیقی و فطری نہیں ہے۔ حقیقی رشتہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کرۂ ارضی انسان کا وطن ہے، تمام نسل انسانی ایک ہی گھرانے کے افراد ہیں اور ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے اس منزل پر پہنچکر انسان کے اجتماعی علائق کا سفر ختم ہو جاتا ہے اور وہ وحدتِ نسلی

حیات اجتماعیہ اور اس کا سلسلۂ ارتقاء

"قومیت" کیا ہے؟ انسان کی اجتماعی زندگی کے احساس و اعتقاد کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہ انسانوں کو کسی ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے ذریعہ اس کی ایک بڑی جمعیت باہم مربوط ہو کر زندگی بسر کرتی اور اجتماعی زندگی کے کشاکش سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس لیے قبل اس کے کہ اس بارے میں اسلام کی تعلیم و دعوت پر نظر ڈالی جائے خود انسان کی حالت پر نظر ڈالنی چاہئے کہ اس کے اجتماعی رستوں اور رشتوں کے احساس و اعتقاد کا کیا حال ہے؟

ایک مدت تک انسان جس مقام پر رہتا ہے قدرتی طور پر اس سے زیادہ مانوس ہو جاتا ہے اِس اُنس کے اسباب ایک سے زیادہ ہیں۔ اول تو اس مقام کی ارضی خصوصیات کے ساتھ اس کی زندگی کے حالات کچھ اس طرح مل جُل جاتے ہیں کہ وہاں کے ہر موسم اور ہر حالت کے ساتھ اس کی زندگی کی کوئی نہ کوئی حالت وابستہ ہو جاتی ہے، اور اس کے تصور میں اس کے لیے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ثانیاً، مشاہدہ کے استمرار و تواتر میں بجائے خود حیوانی دماغ کے لیے تاثیر ہے۔ جن چیزوں سے اس کا لگاتار واسطہ رہتا ہے قدرتی طور پر ان سے زیادہ مالوف ہو جاتا ہے۔ ثالثاً، مکان و قیام کے ساتھ نسل و رفاقت کے بھی تمام رشتے جمع ہو جاتے ہیں۔ جس مقام پر انسان پیدا ہوا ہو اور پرورش پائی ہو وہیں اس کے تمام عزیز و اقارب اور جانے پہچانے ہوئے آدمی ہوتے ہیں اور اس لیے ان کی محبتوں کی یاد وہاں کے چپّہ چپّہ میں بس جاتی ہے غرضیکہ انسان نے نسل کے بعد مکان و توطن کا رشتہ بھی محسوس کیا اور بہ تدریج اس کی گیرائیاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ یہ اس کے جذبات محبت کا مرکز اور مکانی دل بستگی کے ولولوں کا محور بن گیا۔

وطنیۃ "بلدیہ" کے رشتہ کی ایک خاص ترقی یافتہ صورت کا نام ہے جب تمدن میں

پڑھتے ہیں تو جذباتِ نسل و نسب کی شدت و حرارت سے دل و دماغ تنور کی طرح گرم ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی شاعری ان جذبات میں عرب جاہلیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عربی میں قبیلہ، خاندان نسل اور مکان کی اس حد بندی کے اعتقاد اور اس کے غلو کو "عصبیت" سے تعبیر کرتے تھے۔ اس عصبیت کی پہلی بنیاد عربیت پر تھی، یعنی غیر عرب کے مقابلہ میں عرب کی فضیلت، اور اس کے بعد عربیت میں بھی ہر قبیلہ اپنے نسلی امتیاز کے غرور سے سرگراں تھا۔

عرب سے باہر بھی دنیا کا تمام آباد حصہ قبیلہ اور وطن سے زیادہ وسیع دائرہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ رومی تمدن نے رومن قومیت کی بنیادیں استوار کی تھیں لیکن اس کی بنیاد بھی نسل اور وطن ہی پر تھی۔ سسلی کے حاکم نے جب ایک رومانی کو گرفتار کرکے دُرّے سے پٹوایا تھا تو وہ اس کی ہر ضرب پر چیختا تھا "میں رومانی ہوں" مشہور رومی خطیب سیسرو نے اس حاکم کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "ایک رومانی فورم کے وسط میں لٹایا جاتا ہے اور دُرّے سے پیٹا جاتا ہے۔ وہ نہ تو درد و اذیّت کی شکایت کرتا ہے۔ نہ روتا دھوتا ہے۔ صرف اس جملہ کی تکرار کرتا ہے کہ میں رومانی ہوں! اے مجلس قضاۃ! اس مظلوم کو یقین تھا کہ میں اپنے آپ کو رومانی کہہ کر ساری تکلیفوں اور بے عزتیوں سے بچا لے سکتا ہوں۔ کیونکہ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ رومانی ہونا کسی انسان کے لیے حفاظت و شرف کی سب سے بڑی ضمانت تھی" یہ سیسرو کی قانونی تقریروں میں سب سے زیادہ فصیح تقریر تسلیم کی گئی ہے۔ سیسرو نے صرف اس پر زور دیا کہ وہ رومانی تھا۔ یہ نہیں کہا کہ انسان تھا۔ اسے انسانیت کا نہیں، رومانیت کا استغراق تھا!

لیکن اسلام ان منزلوں میں رک نہ سکا۔ اس نے ان تمام رشتوں اور رشتوں کی بنیادوں سے انکار کر دیا جو انسانوں کے علم و نظر کی کوتاہیوں نے بنا رکھے تھے۔ وہ نسل، وطن، جنس، رنگ، زبان کسی غیر حقیقی رشتے کو تسلیم نہیں کر سکا۔ اس نے انسان کو صرف ایک ہی رشتے کی دعوت دی۔ انسانیت اور انسانی برادری کے فطری رشتہ کی۔

وحدتِ مکانی اور وحدتِ جنسی کی جگہ فاطر السماوات و الارض کی بنائی ہوئی ایک ہی وحدتِ انسانی اپنی کامل اور بے پردہ صورت میں آشکارا ہو جاتی ہے۔

اس نے پہلے زمین کے اس ٹکڑے کو سب کچھ سمجھا تھا جس میں پیدا ہوا تھا۔ اب بھی جب پیدا ہوتا ہے تو گھر کی چار دیواری ہی اس کی دنیا ہوتی ہے۔ اس نے زمین کی عام مخلوقات پر نظر ڈالی، اور اُن میں سے ہر قسم اور نوع کو مدتوں کے بعد پہچان سکا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، اور ہزاروں لاکھوں برس کے بعد یہ حقیقت معلوم کر سکا کہ سورج کا ایک نظامِ اجتماع ہے اور خود کرۂ ارضی بھی اسی کا ایک فرد ہے۔

اسلام اور عصبیتِ قوم و جنس

ان مقدمات کی تشریح کے بعد اب دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے اس بارے میں دنیا کو جس طرف لے جانا چاہا تھا، وہ کونسی منزل اور کونسا نقطہ ہے؟

وہ منزل "انسانیت" کی منزل ہے۔ وہ نقطہ اس سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ کمال ہے!

چھٹی صدی عیسوی میں جب اسلام کا ظہور ہوا، تو دنیا کے قدم "قبیلہ" اور وطنیت کی منزل سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا۔ اور عرب کی آبادی قبیلوں کا مجموعہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنی نسلی جنسیت کے دائرہ کے اندر محدود تھا، اور اس سے باہر کی کوئی وسعت قبول نہیں کرتا تھا۔ ان تنگ دائروں کے اعتقاد سے فخر و غرور، نسل انسانی کی تحقیر و تذلیل اور باہم دگر غلبہ و تسلّط کے جس قدر مہلک جذبات پیدا ہو جایا کرتے ہیں (جن کی تشریح آگے آئے گی) وہ سب کے سب اس شدت و قوت کے ساتھ ان کے خمیر میں سرایت کر چکے تھے کہ شاید ہی کسی قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر مل سکے۔ ان میں کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے انتساب سے بڑھ کر دنیا کی کوئی عظمت و کبریائی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں جانیں آن کی آن میں قربان ہو جاتی تھیں تا کہ قبیلہ کے شرف و عزور کو صدمہ نہ پہنچے یہ معاملہ اس درجہ معلوم و مسلّم ہے کہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ حماسہ میں آج بھی ان کے اشعار

کا ایک دائرہ بے شمار چھوٹے چھوٹے دائروں میں بٹ گیا تھا۔ اسلام نے نہ صرف اِن بچاروں سے انکار کیا، بلکہ ان کے خلاف اس درجہ واضح اور قطعی اعلان کر دیا کہ کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجایش باقی نہیں رہی۔ "نسل" کی نسبت صاف صاف کہہ دیا کہ سب کی نسل ایک ہی ہے۔ "وطن" کی نسبت کہہ دیا کہ عرب ہو یا عجم، سب ایک ہی خدا کی زمین کے باشندے ہیں "زبان" اور "رنگت" کی نسبت فیصلہ کر دیا کہ یہ خدا کی حکمت و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کسی جگہ کی آب وہوا ایک رنگ پیدا کرتی ہے، کہیں کی آب وہوا دوسرا رنگ۔ کہیں ایک خاص طرح کی زبان ادائے مطلب کے لیے وجود میں آگئی۔ کہیں دوسری زبان۔ لیکن یہ اختلافات انسان کے امتیاز اور تفرقہ کی بنیادیں نہیں ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اعمال کا جو نظام تیار کیا، اس کے ہر گوشہ کی وضع و قطع ایسی رکھی، جس کے ساتھ امتیازِ نسل و قوم جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ روزانہ اعمال وعبادات میں ایسی چیزیں رکھدی گئیں کہ ہمیشہ انسانی وحدت و مساوات کا عملی اعتراف ہوتا رہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سب میں یہ روح کام کر رہی ہے۔ انسانی اخوت کے کام ونفوذ کا ایک پورا انتظام ہے جو اپنے ہر فرد کو مجبور کر دیتا ہے کہ اس حقیقت کا اقرار کرے، اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دے، اس کے یقین و ایمان کی عملی تصویر بن جائے۔

عصبیتِ نسل و وطن

اسلام کی دعوت "انسانیت" اور "انسانی برادری" کی دعوت تھی۔ اس لیے اس کا رجحان ان تمام تعصّبات کے خلاف تھا جو نسل و وطن کے امتیازات سے پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مختصراً عصبیت نسل و وطن کی بھی تشریح کر دی جائے تاکہ واضح ہو جائے کہ اسلام کی روح جس چیز کی مخالف ہے وہ صاف اور معیّن صورت میں کیا ہے؟

دو چیزیں ہیں: ایک نسل و وطن کا تحفّظ ہے، ایک نسل و وطن کا تعصّب ہے اسلام کی روح تعصّب کی مخالف ہے۔ تحفّظ کی مخالف نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ

اب تمام نسلِ انسانی ایک سطح اور ایک صف میں کھڑی ہوگئی۔ حقیقت کسی کو بلندی نہیں نہیں دیتی، مگر اس کو جو اپنے عمل سے شرف و رفعت کا استحقاق ثابت کر دے۔

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے۔

تمام نوعِ انسانی ایک ہی نسل، ایک ہی خاندان، ایک ہی گھرانا ہے۔ پس جب فی الحقیقت نہ تو نسل میں امتیاز ہوا کہ نسل ایک ہی ہے۔ نہ وطن میں تفریق ہوئی کہ وطن بھی سب کا ایک ہی کرۂ ارضی ہے، تو پھر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ سے کیوں الگ ہو؟ کیوں ایک ہی خاندان اور ایک ہی گھرانے کے رشتہ دار ایکدوسرے سے کٹ کر غیر اور اجنبی بن جائیں؟

اس بارے میں اسلام کی بنیادی تصریحات اس درجہ مشہور و معلوم ہیں کہ یہاں ان کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مقصود صرف اشارہ ہے من جملہ اُن قرآنی تصریحات کے جو انسانی وحدت کا اعلان کرتی ہیں، وہ تمام آیتیں ہیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مجمع انسانی کی اصل وحدت تھی۔ تفرقہ گمراہی اور فطرتِ الٰہی سے دوری کا نتیجہ ہے۔

اسلام کی دعوت میں انسانی وحدت و اخوت کی حقیقت کو کس درجہ اہمیت حاصل تھی؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ آنحضرت (صلعم) سے جو دعائیں پانچ وقت کی نمازوں میں ثابت ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ ہے۔

"خدایا ہمارا اور ساری کائناتِ ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ صرف تو ہی پروردگارِ عالم ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ خدایا! ہمارا اور ساری کائناتِ ہستی کا پروردگار میں گواہ ہوں کہ محمدؐ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ تیرہ بندہ ہے اور تیرا رسول ہے! خدایا! ہمارا اور تمام کائناتِ ہستی کا پروردگار! میں گواہ ہوں کہ تیرے سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انھوں نے کتنے ہی تفرقے پیدا کر رکھے ہوں لیکن تو نے ان سب کو ایک ہی رشتۂ انسانیت میں جوڑ دیا ہے"!

انسان کی عالمگیر اخوت کی راہ میں سب سے بڑی روک چار چیزیں تھیں۔ نسل، وطن رنگت، زبان۔ انہی چار امتیازات کی بنا پر الگ الگ حلقے بنائے گئے تھے، اور انسانیت

شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نئے قسم کی اجتماعی زندگی بھی نشو ونما پانے لگی ۔ یہ وہ وقت تھا، جب ایک طرف علم اور آزادی کی روح تمام یورپ میں پھیل رہی تھی ۔ دوسری طرف شخصی حکومتوں کا استبداد اور اجنبی تسلّط کا ظلم اپنی تمام پرانی روایتوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم تھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی کش مکش شروع ہو گئی ۔ ایک طرف شاہی تاج وتخت اور اس کے غیر محدود دعوے تھے ۔ دوسری طرف علم و آزادی کے پیدا کیے ہوئے نئے نئے اصول اور نئے نئے ولولے تھے ۔ تاج وتخت کے مقابلے میں جب عوام کے جذباتِ آزادی جوش میں آئے تو خود بخود ایک نہایت مؤثر اور طاقتور لفظ وجود میں آ گیا ۔ یہ لفظ پہلے سے موجود تھا لیکن اس کے ساحرانہ معانی لوگوں کو معلوم نہ تھے ۔ اب ہر شخص کے سامنے آ گئے یہ لفظ "قوم" تھا، اور یہ انکشاف "قوم ہونے" یعنی "قومیت" کا انکشاف تھا ۔ شاہی تاج وتخت کا دعویٰ تھا جیسا کہ بدنصیب لوئیس شانزدھم نے بعد کو کہا: "حق اور طاقت میں ہوں" عوام اب اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ خود بخود سوال پیدا ہو گیا کہ اگر شاہی نسل اور تاج وتخت کی وراثت، حق اور طاقت کا جائز سرچشمہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ وہ کونسی قوت ہے جس کے سامنے شاہی تخت و تاج کو بھی سر جھکا دینا چاہئے؟ خود بخود جواب پیدا ہو گیا کہ "قوم" ہے ۔ صرف "قوم" ہی ہر طرح کے حق و طاقت کا سرچشمہ ہے ۔ صرف "قوم" ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے اوپر حکومت کرے ۔

یہ تو اس قومیت کے محاسن تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ۔

(۱) یہ جو کچھ بھی ہوا، صرف یورپ میں اور یورپ کے باشندوں میں ہوا ۔ یورپ کے حدود سے باہر کے لیے نہ تو انسانی آزادی کا اعلان مؤثر ہو سکا، نہ قومی حقوق کا اعتقاد ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم رومن اصول کے مطابق یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ دنیا برتر اور کم تر اقوام میں منقسم ہے ۔ آزادی اور حقوق کے تمام اصول برتر اقوام کے لیے ہیں نہ کہ کمتر اقوام کے لیے ۔ یورپ اور امریکہ دنیا کا نصف برتر حصہ ہے ۔ بقیہ دنیا کم تر حصہ ہے ۔ اس لیے اسے کوئی حق نہیں کہ انسانی آزادی اور قومی حقوق کا مطالبہ کرے جو برتر انسانوں کے لیے مخصوص ہیں ۔

جب کبھی کوئی اس طرح کا دائرہ بنتا ہے، تو گو اس کی ابتدا تحفظ کے جذبات سے ہوتی ہے لیکن آگے چل کر تحفظ تعصب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پہلے انسانوں کی ایک جماعت وطنیت اور قومیت کا دائرہ اس لیے کھینچتی ہے۔ تاکہ اس کے اندر رہ کر دوسروں کے حملے سے اپنی حفاظت کرے، یہ قومیت "دفاعی قومیت" ہوتی ہے۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک یہ دائرہ قائم رہتا ہے تو پھر قومی حفاظت کی جگہ قومی برتری اور وطنی گھمنڈ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور "دفاعی قومیت" اچانک "ہجومی قومیت" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب قومیت اپنا بچاؤ ہی نہیں چاہتی، دوسروں پر حملہ کرنا بھی چاہتی ہے۔ ساتھ ہی نسلی اور قومی برتری کا نشہ دوسرے انسانوں سے علیٰحدگی اور ان کی تحقیر و تذلیل کے جذبات بھی برانگیختہ کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختلف قومی حلقوں میں باہم دگر تصادم شروع ہو جاتا ہے، اور انسانیت کے تمام اعلیٰ جذبات افسردہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا علاج صرف یہی تھا کہ حتی الامکان تنگ دائروں کا قیام ہی روک دیا جائے۔ جب کبھی کوئی تنگ دائرہ بنے گا، تو چونکہ یہ حقیقی انسانی دائرہ کی وسعت میں قطع و برید ہوگی، اس لیے ضروری ہے کہ وسعت نظر و احساس کی جگہ تنگیٔ نظر و ضیقِ صدر کی بنیادیں پڑ جائیں۔ اسلام نے اسی لیے ان تمام تنگ دائروں کی ہمت افزائی کرنے سے انکار کر دیا۔

یورپ کی جدید قومیت

"قومیت" اپنے سادہ معنوں میں اگرچہ پہلے سے موجود تھی، لیکن موجودہ زمانے میں قومیت کے لفظ سے جن اجتماعی عقائد و جذبات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، یہ دراصل یورپ کے نئے عہدِ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی پیدائش انسانی آزادی و حقوق کی حفاظت کے لیے ہوئی تھی، لیکن اب انسان کی آزادی و حقوق کے لیے یہی چیز سب سے بڑی مصیبت بن گئی ہے۔

دفاعی قومیت کی پیدائش

ازمنۂ وسطیٰ (مڈل ایجز) کے بعد جب یورپ نے کروٹ بدلی اور نئے تمدن کی نشوونما

جس قدر پہلے تھی۔ تاہم جہاں تک انسانی آزادی و مساوات کا تعلق ہے، نوع انسانی اب بھی اس سے اسی طرح محروم ہے جس طرح پہلے تھی۔

اس سے بھی زیادہ یہ کہ سرمایہ داری کی طاقت نے اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ پہلے انسانوں پر جو اختیار و تسلط صدیوں کی شاہی نسل اور امیرانہ روایت حاصل کر سکتی تھی۔ اب وہ اختیار چند مہینوں اور برسوں کے اندر ایک سرمایہ دار محض روپیہ کے ذریعہ حاصل کر لیتا ہے اور دنیا کی صلح و جنگ اور ملکوں اور قوموں کی حکومت و محکومی کی باگ فوراً اس کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے "سوشلزم" کی تخم ریزی اسی ردّ فعل کا نتیجہ تھی۔ اب یہ بڑھتے بڑھتے "کمیونزم" تک پہنچ گیا ہے، اور نہ صرف یورپ کا نظام قومیت بلکہ ہیئتہ اجتماعیہ (سوسائٹی) کا پورا انظام الٹ دینا چاہتا ہے۔

عالمگیر جنگ یورپ اس نظام قومیت کی نامرادیوں کا سب سے بڑا اعلان تھا۔ پانچ سال تک خون اور آگ میں رہ کر جب دنیا نے دوبارہ سنبھالا لیا تو زندگی اور امن کی جستجو از سرِ نو شروع ہو گئی۔ اُن تمام لوگوں نے جن کی ذہنیت کسی قومی نظامِ حکومت کی غرض پرستیوں سے آلودہ نہ تھی، محسوس کر لیا کہ پچھلا نظام اب دنیا کو زیادہ عرصہ تک مطمئن نہیں رکھ سکتا۔ یورپ کے حکما اور مفکرین میں ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو قومیت کی اس عصبیت سے اکتا گیا ہے اور "قومیت" کی جگہ "انسانیت" کی وسیع فضا ڈھونڈ رہا ہے۔ طرح طرح کے نئے نظریے اور نئی تجویزیں دماغوں میں نشوونما پا رہی ہیں۔ "دنیا کے نظامِ اجتماع کی نئی تقسیم" اور "انسانی برادری کا غیر مشروط حلقہ" وقت کا سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ موضوعِ فکر ہے۔

اگر بحیثیت مجموعی دنیا کی موجودہ ذہنی فضا پر نظر ڈالی جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک موسم ختم ہو رہا ہے اور دوسرے کی آمد آمد ہے۔ جس زمانہ سے ہم گزر رہے ہیں، عجیب نہیں مستقبل کا مورخ اس میں عہد تداخل کے آثار کی جستجو کرے۔ نہیں کہا جا سکتا نئے موسم کا پیغام کیا ہوگا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ دنیا اس وقت تک جن اجتماعی

(۲) فرانس جس وقت اپنے ملک کے اندر تیسرے انقلابِ آزادی کی تیاریاں کر رہا تھا تو اس وقت کسی فرانسیسی کے ذہن میں اس بات کا خطرہ بھی نہیں گزرا کہ اسی آزادیاں کی امیر عبدالقادر جزائری اور اس کی بدبخت قوم کو بھی ضرورت ہے یا نہیں جسے فرانس نے اپنی فوجی طاقت سے غلام بننے پر مجبور کر دیا ہے؟ آج فرانس کی معلم حرّیت "قومیت" شام میں جو کچھ کر رہی ہے، دنیا کے سامنے ہے۔ انگلستان کہتا ہے وہ چھوٹی قوموں کا محافظ ہے آزادی کا پشت پناہ ہے۔ محب الوطنوں کے لیے گوشۂ امن ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کن حالات میں اور کن کے لیے ہے؟ بلاشبہ اس نے روس کے فراریوں کو پناہ دی، فرانس کے جلاوطنوں کے لیے دروازے کھول دیے۔ یونان کی آزادی کے لیے اپنا قومی شاعر بائرن پیدا کر دیا اٹلی کے میزینی کو اپنی آبادیوں میں جگہ دیدی، اور یورپ کے بیشمار انقلابی نقشے لندن کی گلیوں اور مکانوں ہی میں کھینچے گئے، مگر مشرق اور ایشیا کے لیے اس کی یہ "حریت پرور" قومیت کیا فیصلہ کرتی رہی۔ وہ روس اور اسٹریا کے مظلوموں کو پناہ دیتا رہا، لیکن خود اس کے ظلم و تسلّط کے مظلوموں کے لیے اس کے پاس پناہ دینے کا کیا سامان تھا ؟ جواب کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آج مشرق اور ایشیا کا ہر گوشہ زبانِ حال سے جواب دے رہا ہے۔

رَدِّ فعل

ضروری تھا کہ اس حالت کا رَدِّ فعل پیدا ہو۔

انیسویں صدی ابھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی کہ اس کے آثار شروع ہو گئے۔ سوسائٹی کے نچلے طبقوں نے دیکھا کہ آزادی اور مساوات کی اتنی ہنگامہ آرائیوں کے بعد بھی حقیقی آزادی اور مساوات بدستور مفقود ہیں۔ موجودہ نظامِ قومیت جو آزادی و مساوات کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا، اب خود آزادی و مساوات کی راہ میں روک بن گیا ہے۔ نئے دور سے پہلے دنیا کا استبداد اور غیر مساویانہ امتیاز چند افراد اور خاندانوں میں محدود تھا اب وہ بڑے گروہوں میں پھیل گیا ہے۔ اس لیے حق و مساوات کے مقابلہ میں طاقت اتنی سمٹی ہوئی اور مرکزیت کی حالت میں نہیں ہے،

عروج کے سال

مذہبی، سیاسی اور ادبی تحریریں

(۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۷ء تک)

دائروں میں محصور رہی ہے اس سے ایک زیادہ وسیع دائرے کی طرف قدم بڑھائے
کیا وہ "انسانیت" اور "انسانی برادری" کی منزل ہوگی؟ کیا دنیا اس نقطہ تک پہنچ گئی
ہے جس نقطہ تک اب سے تیرہ سو برس پہلے اسلام نے اسے پہنچانا چاہا تھا مگر نہ پہنچ
سکی؟ اس کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ مگر سر دست ہمیں اس جواب کی
ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ سوال حل کرنا ہے کہ بحالت موجودہ ہمیں کیا کرنا چاہیے
یعنی جہاں تک "قوم" اور "قومیت" کا تعلق ہے، ہمارا طریق کار کیا ہونا چاہیئے؟ ناگزیر
ہے کہ قیام امن و اصلاح قومیت کے لیے نہ صرف ملت اسلامیہ کو بلکہ تمام دنیا کو اسلامی
نقطہ نگاہ کے مطابق عمل پیرا ہونا پڑے گا۔

قولِ فیصل

"اسلام کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتا کہ مسلمان آزادی کھوکر زندگی بسر کریں۔ انھیں مر جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں"

کہ اپنے بچاؤ کی ایک ہلکی سی خواہش اور سماعت حق کی ایک کمزور سی توقع اس کے اندر کام کر رہی ہو۔ حالانکہ نان کوآپریشن کی راہ بالکل قطعی اور یک سر ہے۔ وہ اس کے بارے میں اشتباہ بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

(کامل مایوسی، اس لیے کامل تبدیلی کا عزم)

"نان کوآپریشن" موجودہ حالت سے کامل مایوسی کا نتیجہ ہے، اور اسی مایوسی سے کامل تبدیلی کا عزم پیدا ہوا ہے۔ ایک شخص جب گورنمنٹ سے نان کوآپریشن کرتا ہے، تو گویا اعلان کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکا۔ وہ اس کی غیر منصف طاقت کے جواز سے منکر ہے، اور اسی لیے تبدیلی کا خواہشمند ہے۔ پس جس چیز سے وہ اس درجہ مایوس ہو چکا کہ تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا، اس سے کیونکر امید کر سکتا ہے کہ ایک منصف اور قابل بقا طاقت کی طرح اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟

اس اصولی حقیقت سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی موجودہ حالت میں بریت کی امید رکھنا ایک بے سود زحمت سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ گویا اپنی معلومات سے انکار ہوگا گورنمنٹ کے سوا کوئی ذی حواس اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ بحالت موجودہ سرکاری عدالتوں سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایسے اشخاص سے مرکب ہیں جو انصاف کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسے نظام (سسٹم) پر مبنی ہیں جن میں رہ کر کوئی مجسٹریٹ ان ملزموں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا جن کے ساتھ خود گورنمنٹ انصاف کرنا پسند نہ کرتی ہو۔

میں یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ "نان کوآپریشن" کا خطاب صرف گورنمنٹ، گورنمنٹ کے سسٹم اور موجودہ حکومتی اور قومی اصولوں سے ہے۔ افراد و اشخاص سے نہیں ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے ہیں، تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی، دونوں کے لیے استعمال

قولِ فیصل*

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے، نہ طلب ہے، نہ شکایت ہے۔ یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے، اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف یہاں دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کہ کوئی نان کوآپریٹر کسی طرح کا بھی حصہ عدالت کی کارروائی میں لے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سنٹرل خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند نے اگرچہ اس کی اجازت دے دی ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تحریری بیان دیا جا سکتا ہے، لیکن ذاتی طور پر میں لوگوں کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ خاموشی کو ترجیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس لیے بیان دیتا ہے کہ مجرم نہیں، اگرچہ اس کا مقصد پبلک کی واقفیت ہو، تاہم وہ اشتباہ سے محفوظ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے

---

* ۱۰؍دسمبر ۱۹۲۱ کو مولانا آزاد کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اپنے کیس کی کارروائی میں مولانا حصہ نہیں لے سکے لیکن ۲۴؍جنوری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے عدالت میں ایک تحریری بیان "قولِ فیصل" کے عنوان سے دیا۔ ۹؍فروری کو انھیں ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی اور ان کو علی پور جیل بھیج دیا گیا، جاتے ہوئے مولانا نے مجسٹریٹ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا "یہ سزا بہت ہلکی ہے اور میری توقعات سے کہیں کم ہے۔"

حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے، اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل میں سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے؟ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہو۔

بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ بیان دوں۔ لیکن ۱۱ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا، تو میں نے دیکھا گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے، حالانکہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے۔

پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن جب اس کا ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہو سکا، جیسا کہ آج کل اثبات جرم کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے، تو مجبوراً واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد براری کے لیے کافی نہیں۔

یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا، وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں۔ اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی، اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں۔

اقرار "جرم"

(۱) ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی و انصاف کی جدوجہد کو مبغوض رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے، اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کر سکتا اگرچہ از روئے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازع للبقا STRUGGLE FOR EXISTENCE کی ایک جنگ ہوتی ہے جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنا حق حاصل کرے۔ قابض طاقت چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح آخر الذکر بھی قابلِ ملامت نہیں، کیونکہ وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل وحق کا بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہی ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔

(ایک عجیب مگر عظیم الشان جگہ)

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے، جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے، جو اپنی معلومات ومشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا، کیونکہ میرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے جو نیکی اور محبت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے، جہاں سب سے اچھے اور سب سے برے، دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں؟ اتنی بڑی ہستی کے لیے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں!

(حمد و شکر!)

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کے

باہر رہوں۔ میں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے تمام پروگرام ملتوی کرکے کلکتہ چلا جانا چاہیے۔ زیادہ خیال ہمیں اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، گورنمنٹ کا جبر و تشدد لوگوں کو بے قابو کر دے اور کوئی بات صبر و ضبط کے خلاف کر بیٹھیں۔

میں پہلی دسمبر کو کلکتہ پہنچا۔ میں نے ظلم اور برداشت، دونوں کے انتہائی مناظر اپنے سامنے پائے۔

میں نے دیکھا کہ ۱۷ نومبر کی یادگار ہڑتال سے بے بس ہو کر گورنمنٹ اس آدمی کی طرح ہو گئی ہے جو جوش اور غصہ میں آپے سے باہر ہو جائے، اور غیظ و غضب کی کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ ہو۔ ۱۹۰۸ء کے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت قومی رضاکاروں کی تمام جماعتیں "مجمع خلاف قانون" (ان لا فل) قرار دے دی گئی ہیں۔ پبلک اجتماعات یک قلم روک دیے ہیں، قانون صرف پولیس کی مرضی کا نام ہے، وہ "ان لا فل جماعت" کی تفتیش اور شبہ میں جو چاہے کرسکتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں لوگوں نے بھی برداشت اور استقامت، دونوں کا گویا آخری عہد کر لیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اپنی راہ سے ہٹیں گے۔ نہ تشدد کا مقابلہ کریں گے۔

ان حالات میں میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یکسو تھی۔ میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں: ایک یہ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے اس لیے فتح و شکست کا پہلا فیصلہ یہیں ہوگا، دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ لیکن موجودہ حالت نے بتلا دیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادی تقریر اور آزادی اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر مل کی زبان میں "انسانیت کے قتل عام سے کچھ ہی کم" کہی جاسکتی ہے، لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجک کے اعلانیہ ہو رہی ہے۔ پس میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کر دیا، اور فیصلہ کر لیا کہ اس وقت تک کلکتہ ہی میں رہوں گا جب تک دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آجائے: یا گورنمنٹ اپنا کمیونک اور آرڈر واپس لے لے۔ یا مجھے گرفتار کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان گذشتہ ایام نے بہ یک وقت دونوں حقیقتیں صفحاتِ تاریخ

یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔ ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے؟ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو۔

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو، اور وہ اُن لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں، بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے، اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی، اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے اُن کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُر پیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا۔ پس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔

۱۷ر نومبر کے بعد دنیا کی ان تمام چیزوں میں سے جو چاہی جا سکتی ہیں، گورنمنٹ صرف یہ چاہتی تھی کہ ۲۴ر نومبر کو جب پرنس کلکتہ پہنچیں تو ہڑتال نہ ہو، اور جو جابرانہ بیوقوفی ترمیم ضابطہ فوجداری ۱۹۰۸ء کے نفاذ میں ہو گئی ہے، وہ ایک دن کے لیے قبول کر لی جائے۔ وہ خیال کرتی تھی کہ میری اور مسٹر سی آر داس کی موجودگی اس میں حارج ہے، اس لیے کچھ عرصہ کے تذبذب اور غور و فکر کے بعد ہم دونوں گرفتار کر لیے گئے۔

میں گذشتہ دو سال کے اندر بہت کم کلکتہ میں رہ سکا ہوں۔ میرا تمام وقت زیادہ تر تحریک خلافت کی مرکزی مشغولیت میں صرف ہوا۔ یا ملک کے پیہم دوروں میں اکثر ایسا ہوا کہ مہینے دو مہینے کے بعد چند دنوں کے لیے کلکتہ آیا اور بنگال پراونشیل خلافت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کر کے پھر باہر چلا گیا۔ لیکن یکا یک گورنمنٹ بنگال کے تازہ جبر و تشدد اور ۱۸۔ کے کمیونک کی اطلاع بمبئی میں ملی، اور میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ ایسی حالت میں کلکتہ سے

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو، میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر ہوسکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے، یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہوسکتی ہے؟ جبکہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی، اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

"اصلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کرسکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیے، بعینہٖ ایسی ہی بات ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی

کے لیے مہیا کردیں۔ اگر ایک طرف گورنمنٹ کے چہرے سے ادعا و نمائش کے تمام نقاب دور ہوگئے، تو دوسری طرف ملکی طاقت بھی ایک سخت آزمائش میں پڑکر پوری طرح نمایاں ہوگئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر و تشدّد میں بالکل بے حجاب اور بے لگام ہے، تو ملک میں بھی صبر و برداشت کی طاقت روزافزوں نشوونما پارہی ہے، جیساکہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے آج بھی اس کا موقع حاصل ہے کہ انکار کردیا جائے، لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہوگی۔ یہ مستقبل کی رہنمائی کرے گی کہ کیونکر اخلاقی مدافعت مادی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے؟ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعے خونریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے؟ البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے جو بُرائی کے مقابلہ میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا؟ گورنمنٹ میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیوروکریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف نہ ہونگے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

فلسفہ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے تحریک خلافت وسوراج کو پامال کردے گی، اور ۲۴ رکی ہڑتال رُک جائے گی۔

لیکن بہت جلد گورنمنٹ کو معلوم ہوگیا کہ جبروتشدد جب قومی بیداری کے مقابلہ میں نمایاں ہو، تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انھی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ، اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔ الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں، اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

پائے جائیں۔ اسلام نے "پادشاہ" کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے، اور صرف ایک رئیس جمہوریہ (پریسیڈنٹ آف دی ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی "خلیفہ" کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں، جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے؟ اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اس کو ظلم کہوں، اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ نظام بعد کو قائم نہ رہ سکا۔ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شہنشاہی کے پرشوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ، جو بسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انھوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا ہے، جنھوں نے علانیہ حکام وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو، اور ان تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی جھیل نہ لیا ہو جو اس راہ میں پیش آئی ہیں۔

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے، تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم

جائداد اور قرضدار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیے۔ اگر ایک شخص ہماری جائداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے، تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جا سکتا۔

بُرائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے۔ یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے یا بُری ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "زیادہ بُری چوری" اور "کم بُری چوری"؟ لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ "اچھی چوری" اور "بُری چوری"۔ پس میں بیوروکریسی کی اچھائی اور جائز ہونے کا کسی حال میں تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہٖ ناجائز عمل ہے۔

میں ایک مسلمان ہوں، اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔

اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقت ور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے، لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق صداقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے، اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یکقلم مٹا دیے، اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں، اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیار فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے۔ اور سب سے بڑا وہی ہے، جس کے کام سب سے اچھے ہوں: یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ، وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (سورہ حجرات)۔

پیغمبر اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی، اور صرف قوم کی رائے، نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں

نکال دیں گے"، لیکن وہ مقدمہ بغاوت چلانے کی جگہ خدا کا شکر کرتا کہ قوم میں ایسی راست باز زبانیں موجود ہیں۔ عین جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبہ کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا "واسمعوا واطیعوا"، سنو اور اطاعت کرو۔ تو ایک شخص کھڑا ہو جاتا اور کہتا "نہ تو سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے"، کیوں؟ "اس لیے کہ تمھارے جسم پر جو چغہ ہے وہ تمھارے حصہ کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے اور یہ خیانت ہے" اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا۔ وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصہ کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دیدیا تھا۔ اس سے چغہ تیار ہوا۔

قوم کا یہ طرزِ عمل اس خلیفہ کے ساتھ تھا جس کی صولت وسطوت نے مصر اور ایران کا تخت الٹ دیا تھا۔ تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴ الف نہ تھی۔

ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ (جن کی اطاعت از روئے شریعت ہم پر واجب ہے) ایسا سلوک رہا ہے، تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "از روئے قانون قائم شدہ" گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو "از روئے شریعت اسلام" واجب الاطاعت ہے؟ کیا انگلستان کی بادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت عبدالملک کی خلافت اور حجّاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی وغیر مسلم" اور "قومی ومسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں، جب بھی ہم سے صرف یہی امید کی جا سکتی ہے کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں وہی چیمسفورڈ" اور "ریڈنگ"، کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا: "اتق اللہ فقد ملأت الارض ظلماً وجوراً" خدا سے ڈرو کیونکہ تمہارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے۔ یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم وجور کے لیے ہمیں بتلایا گیا تھا، ایک اجنبی قبضہ وتصرف کے لیے نہ تھا۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے تو انھیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگذری کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ وہ اسلام

کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیرکٹر) ہے جو ان کو تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔

پیغمبر اسلام کے بے شمار قولوں میں سے جو اس بارے میں ہیں، ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو، برائی کو روکو۔ اگر نہ کروگے تو ایسا ہوگا کہ نہایت برے لوگ تم پر حاکم ہوجائیںگے اور خدا کا عذاب تم کو گھیرے گا۔ تم دعائیں مانگوگے کہ یہ حاکم ٹل جائیں مگر قبول نہ ہوگی"۔

لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے؟ تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیے، اپنے ہاتھ سے درست کردے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کرے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے" (مسلم)۔ ہندوستان میں ہمیں استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دور کردیں۔ اس لیے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کیا جس کی استطاعت حاصل ہے۔ یعنی زبان سے اس کا اعلان کرتے ہیں۔

اسی لیے اسلام تمامتر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جابجا کہتا ہے: "مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ہر حال میں سچی بات کہے" (ولم یخش الا اللہ)۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا "سب سے بہتر موت اُس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے" (ابوداؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا "میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا خواہ کہیں ہوں، اور کسی حالت میں ہوں" (بخاری و مسلم)۔

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں، مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہوسکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا مدۃ العمر کی قید ہے!

پہلے دور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ حال تھا کہ دارالخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفۂ وقت سے برسرعام کہہ سکتی تھی "اگر تم انصاف نہ کروگے تو تکلے کی طرح تمہارے بل

مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمانِ شہادت کی توقع کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمراں کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمراں کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جارہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی، وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمران ظالم ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴۔ الف کو اس سزا کے ساتھ تول لے سکتے ہو۔

میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلابِ حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے۔ اور غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں۔

یا آزادی یا موت

لیکن انسانوں کی بدعملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

میں اقرار کروں گا کہ گذشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح و شام مجھ پر ایسی نہیں گزری ہے، جس میں میں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو اور

کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلہ میں دو طرح کے طرزِ عمل کا حکم دیا ہے کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں: ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلط کا ہے۔ ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لیے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف" اور "اعلانِ حق" جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا۔ دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہییں اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتحمندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں۔ اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی، اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی۔ پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی "جنگی جدوجہد" کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں ان کی "شہری جدوجہد" بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے، حالانکہ معاملہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لیے "جنگی جدوجہد" کا وقت آ گیا تھا لیکن انھوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا۔ انھوں نے "نان وائلنس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے یعنی صرف وہی کریں گے جو انھیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلے میں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ اس طرزِ عمل میں ہندوستان کی ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں، جو انھیں اپنوں کے مقابلے میں کرنی تھی۔

انقلابِ حال

میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر

تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی۔ میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم" اور "یا درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ"، نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "نہ تو درست ہو، نہ مٹو" کہوں۔ کیا صرف اس لیے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے۔

میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری ۱۸ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہدِ شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اسی کی خاطر چار سال تک نظر بند رہا، مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اسی کی تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوئی۔ "رانچی" کے در و دیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں جہاں میں نے نظر بندی کا زمانہ بسر کیا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف اسی کام کے لیے جی سکتا ہوں: اِنَّ صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین۔

میں اس جرم سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جبکہ میں ہندوستان کی اس آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں، جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آ رہے ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا، اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیورو کریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی۔ اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت و سوراج ہے۔ بیورو کریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے پہلے الہلال کی

مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی عدرکھتی ہو، ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہوسکتی۔ گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق محارب کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظر بند تھا) لارڈ چیمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی۔ اس میں واضح کر دیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ میں نے لکھا تھا کہ اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ممالک پر خلاف وعدہ متصرف ہو گئی، تو اسلامی قانون کی رو سے ہندوستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائیں گی یا اسلام کا ساتھ دیں یا برٹش گورنمنٹ کا۔ وہ مجبور ہوں گے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔

بالآخر وہی ہوا۔ گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی۔ اس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کے اعلان میں کیا تھا، اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے، لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے۔

اس حالت میں مسلمانوں کے لیے آخری درجہ کی کشمکش پیدا کر دی۔ اسلامی قانون کی رو سے کم از کم بات جو ان کے فرائض میں داخل تھی، یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں۔ مسلمانوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اگر وہ حق و انصاف چاہتے ہیں تو اس کی راہ صرف ایک ہی ہے، سوراج کا حصول۔ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے۔ موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے، وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لیے محض نفی ہے، وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے، وہ جلیانوالا باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے، وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چار پایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں، وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لیے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے؟ وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے

ترجمے کے ساتھ بار بار شائع ہو چکا ہے۔ اور گویا میرے "جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔
میں نے گذشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب، سوراج اور نان کوآپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔

دسمبر ۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا، اپریل ۲۱ء میں جمعیۃ العلماء کا بریلی میں جلسہ ہوا۔ گذشتہ اکتوبر میں یوپی پراونشیل خلافت کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی، نومبر میں آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا بھی میں ہی صدر تھا۔ لیکن ان میں بھی تمام مقررین نے جو کچھ کہا، اور صدارتی تقریروں میں میں نے جو خیالات ظاہر کیے، اُن سب میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ان دو تقریروں میں دکھائی گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ان سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔

اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴ الف کا جرم ہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ پہلی اور پندرہویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ میں تو یہ کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقع اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گذشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴۔الف کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔

ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلنس نان کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خونریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے، میں اسے فطرت الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جد و جہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے

ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمامتر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔

چار سال کے بعد پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو میں رہا کیا گیا۔ اس وقت سے گرفتاری کے لمحے تک میرا تمام وقت انہی مقاصد کی اشاعت و تبلیغ میں صرف ہوا ہے۔ ۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا تھا، اور مسلمانوں نے مایوس ہو کر اپنا آخری اعلان کر دیا تھا:

"اگر برٹش گورنمنٹ نے مطالبات خلافت کی اب بھی سماعت نہ کی، تو مسلمان اپنے شرعی احکام کی رو سے مجبور ہو جائیں گے کہ تمام وفادارانہ تعلقات منقطع کر لیں۔"

میں اس کانفرنس کا پریسیڈنٹ تھا۔

میں نے اس کے طولانی پریسیڈنشل ایڈریس میں وہ تمام امور بتفصیل بیان کر دیے تھے جو اس قدر ناقص شکل میں ان دو تقریروں کے اندر دکھلائے گئے ہیں۔

میں نے اسی ایڈریس میں اس اسلامی حکم کی بھی تشریح کر دی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے "ترکِ موالات" کریں یعنی کوآپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہی "ترکِ موالات" ہے جو آگے چل کر "نان کوآپریشن" کی شکل میں نمودار ہوا، اور مہاتما گاندھی جی نے اس کی سربراہی کی۔

اسی کانفرنس میں فوج کے متعلق وہ ریزولیوشن منظور ہوا تھا، جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لیے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ کراچی کا مقدمہ اسی رزولیوشن کی بنا پر چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں کہ یہ رزولیوشن سب سے پہلے میں نے ہی تیار کیا تھا اور میری ہی صدارت میں تین مرتبہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں پھر بریلی اور لاہور میں۔ پس اس "جرم" کی تعزیر کا بھی پہلا حقدار میں ہی ہوں۔

میں نے اس ایڈریس کو مزید اضافہ کے بعد کتاب کی شکل میں بھی مرتب کیا، جو انگریزی

مٹا دی جائے گی۔ ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں۔ افسوس ان آنکھوں پر جو نشانیوں سے انکار کریں۔

میں نے انہی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں، کہا تھا: "آزادی کا بیج کبھی بارآور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو"

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے۔

میں نے انہی میں کہا تھا: "مبلغین خلافت کی گرفتاریوں پر کیوں مغموم ہو؟ اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلبگار ہو، تو جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ"

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دیدے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے کسی ایک پرزے سے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت کارڈینیر برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:

"زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا"

خاتمہ

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔

متفق ہوں، اور اُن دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلینس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہوگا اور اس کی فتح مندی اخلاقی و ایمانی طاقت کی فتح مندی کی ایک یادگار مثال ہوگی۔

میں جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں، خاتمۂ سخن میں بھی دہراؤں گا۔ آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے، وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کے لیے خاص طور پر اُسے ملامت کی جائے، قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبروت رد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعتِ ثانیہ (سکینڈ نیچر) کا حکم رکھتا ہے، اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل دی جائے گی۔

یہ قدرتی کمزوری افراد اور جماعت، دونوں میں یکساں طور پر نمود رکھتی ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دیں گے کہ وہ اس کے حقدار نہیں؟ پھر ایک پورے برِّاعظم کے لیے ایسی امید کیونکر کی جا سکتی ہے؟ طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلّل ہے۔ وہ تو خود بھی طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے، اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبے کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہمارا جذبۂ آزادی و حق طلبی سچا اور راٹل ثابت ہوا، تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے، کل کو فتح مند محب الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہوگی۔

مجھ پر سڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے لیکن مجھے "بغاوت" کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا "بغاوت"، آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے ؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ساتھ یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویلیرا اور گریفتھ کے لیے برطانیۂ عظمیٰ کونسا لقب تجویز کرتی ہے۔

پس آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ انصاف باقی رہے گا۔ ناانصافی

ترجمان القرآن

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۝۳
وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۴ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۵ ع

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بنانے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے، اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو، اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا، اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا——

والحمد للہ اولاً و آخراً ط

دیباچۂ طبع اوّل*

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَحۡدَهٗ ط

۱۹۱۶ء میں جب "البلاغ" کے صفحات پر "ترجمان القرآن" اور "تفسیر البیان" کا اعلان کیا گیا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو پندرہ برس تک التواء و انتظار کی حالت میں معلق رہے گا اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ اور میرے ارادوں کی ناتمامیوں کے لیے ایک درد انگیز مثال ثابت ہوگا۔

لیکن واقعات کی رفتار نے بہت جلد بتلا دیا کہ صورتِ حال ایسی ہی تھی۔

جلاوطنی ابھی اس اعلان پر بمشکل چند مہینے گزرے ہوں گے کہ ۳ر مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے تحت مجھے حدودِ بنگال سے

---

* ترجمان القرآن کو تین جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ تھا۔ دو تو مولانا کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ اور تیسری جلد کے بارے میں مولانا سید عبداللطیف سے کہا تھا (جنھوں نے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے) کہ اس کے مسودے کو صندوق میں احمد نگر جیل سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ مولانا نے کل ملاکر قرآن شریف کے کل اٹھارہ پاروں کا ترجمہ و تفسیر کی ہے۔ پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں۔ احمد نگر میں ان دونوں پر نظر ثانی ہوئی۔ اور ان کا سیکنڈ ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

۱۹۳۱ء میں مولانا نے لکھا تھا "اب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہو رہی ہے اور تیسری جلد تیار ہو رہی ہے اور میں اب یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ دور ہوگئی۔"

انتساب

غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا، عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص میرے پیچھے آ رہا ہے، مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا:

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے۔"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا، میں بہت غریب آدمی ہوں، قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے، انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے "الہلال" اور "البلاغ" کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا کہ میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں، لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔

ابوالکلام

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء، کلکتہ

لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کردے سکتا ہوں لیکن ابھی اس صورت حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہوگیا کہ اس گوشے میں بھی مجھے محرومی ہی سے دوچار ہونا تھا۔

دوبارہ تلاشی اور مسودات کی ضبطی نظر بندی کے احکام جب وقت نافذ کیے گئے ہیں تو میرے قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور جس قدر کاغذات ملے تھے، افسران تفتیش نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ انھیں میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا لیکن جب معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابل اعتراض اور حکومت کے لیے مفید مقصد نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد واپس دے دیے گئے۔

لیکن جب تفتیش کے نتیجے سے حکومت ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دے دینے میں بہت جلدی کی اور بہت ممکن ہے کہ پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانے میں حکومت ہند کے محکمہ تفتیش کا افسر اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ (Sir Charles Cleveland) تھا اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اسے میری مخالفت میں خاص کد ہوگئی تھی۔ وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا۔ اور پھر رانچی آیا اور از سر نو میرے مکان کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے بعد کہا گیا کہ جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لیے گئے تھے اب حکومت ہند کے معائنے کے لیے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ تھا بلکہ بعض دوسری مصنفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے۔

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا ترجمے کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورہ نساء تک پہنچ چکا تھا، لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضے میں نہ تھا۔ تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتدا کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا۔

باہر چلے جانے کا حکم دیا اور دفعۃً البلاغ اور البلاغ پریس کے ساتھ تصنیف و طباعت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔

چونکہ اس سے پہلے اسی آرڈیننس کے تحت دہلی، پنجاب، یوپی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں میرا داخلہ روک چکی تھیں، اس لیے اب صرف بہار اور بمبئی ہی کے دو صوبے رہ گئے تھے جہاں میں جا سکتا تھا۔ میں نے رانچی منتخب کیا۔ میرا خیال تھا کہ کلکتہ سے قریب رہ کر شاید تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھ سکوں۔

۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بیک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں ترجمہ، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعے کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ، مطالعے کے لیے تفسیر، اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ۔

البلاغ میں جب ترجمے اور تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے تو ترجمہ پانچ پارو ں تک پہنچ چکا تھا، تفسیر سورۂ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پائے، میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا، نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا، دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں۔

نظر بندی

لیکن ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو یکایک حکومت ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کر دیے اور اس طرح کوئی موقع باقی نہ رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔

اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا، تصنیف و تسوید کا مشغلہ نظر بندی کی ازلیں دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روک سکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ میں نے خیال کیا کہ اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی

گرفتاری اور تمام مسودات کی بربادی

سنہ ۱۹۲۱ء کے اواخر میں تحریک لاتعاون کی سرگرمیاں منتہا عروج تک پہنچ گئی تھیں اور اب ناگزیر تھا کہ حکومت بھی اپنے تمام وسائل کام میں لائے، ۲۰ نومبر کو سب سے پہلے حکومتِ بنگال نے قدم اٹھایا اور ان تمام مجالس کو خلافِ قانون قرار دے دیا جو تحریک کی سرگرمیوں میں مشغول تھیں۔ اس اقدام نے کانگریس کو عدم متابعت قانون کے اجراء کا موقع دے دیا اور ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو بعض دیگر رفقاء بنگال کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اس مرتبہ میری گرفتاری پریس کے انتظامات میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی، کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی اور میں نے اس کا پورا انتظام کر لیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں بھی کام بدستور جاری رہے لیکن گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس افسانے کی آخری المناکی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رک گئی بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے افسردہ ہو گئے۔

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ میرے خلاف مقدمہ چلانے کے لیے کافی مواد موجود نہیں ہے تو اسے مواد کی جستجو ہوئی اور اس لیے تیسری مرتبہ میرے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے لیے جو لوگ آئے تھے ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اردو یا عربی یا فارسی کی استعداد رکھتا ہو۔ جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ہوئی ملی انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہو گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسودات کا تمام ذخیرہ اٹھا لے گئے، حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی لکھی ہوئی تمام کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں۔

سوء اتفاق سے اس وقت کسی شخص نے مطالبہ نہیں کیا کہ کاغذات مرتب کر کے لیے جائیں اور حسب قاعدہ ان پر گواہوں کے دستخط ہو جائیں، نیز ان کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے دی جائے۔ افسرانِ تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے۔ صرف یہ لکھ کر کہ متفرق قلمی کاغذات لیے گئے، چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہو گئے۔

پندرہ ماہ کے بعد جب میں رہا ہوا تو حکومت سے کاغذات کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصے کی

میں نے کاغذات کی واپسی کے لیے خط و کتابت کی لیکن جواب ملا کہ نہ تو سر دست واپس دیے جاسکتے ہیں، نہ ہی بتایا جاسکتا ہے کہ کب تک واپس کیے جائیں گے۔ چونکہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی امید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت حال پیش آئے، اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ از سر نو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کر لی جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا، ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے، تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سر نو مکمل کر لیا۔

"گفتہ" گر شد ز کفم، "شکر کہ" ناگفتہ"، بجاست

از دو صد گنج، یکے سنت گہر باختہ ام

اس خیال سے کہ مسودہ بہتر حالت میں مرتب ہو جائے اور اگر کسی دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے تو تصحیح میں آسانی ہو، میں نے اردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اسے ٹائپ کرانا شروع کر دیا تھا، چنانچہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں نصف سے زائد حصہ ٹائپ ہو چکا تھا۔

رہائی اور تحریک لاتعاون ۲۷، دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا اور اب طباعت و اشاعت کی تمام رکاوٹیں راہ سے دور ہو گئیں لیکن یہ وقت وہ تھا کہ ملک میں ایک عام سیاسی حرکت کا مواد تیار ہو رہا تھا اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے" الہلال" کی سیاسی دعوت کی صدائے بازگشت ہر گوشے سے بلند ہونے لگی تھی۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ وقت کے تقاضے سے تغافل کرتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رہا ہوتے ہی تحریک لاتعاون کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا اور عرصے تک اس کی مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا سکتا۔

لیکن ۱۹۲۱ء میں جب ملک کے ہر گوشے سے ترجمان القرآن کے لیے تقاضا شروع ہوا تو مجھے اس کی اشاعت کے لیے آمادہ ہو جانا پڑا۔ چونکہ ٹائپ کی لکھائی اس کے لیے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی اس لیے کتابت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے متن کی کتابت کرائی گئی، پھر ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء میں متن کی کتابت ختم ہو چکی تھی، ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی میرے خلاف تھا۔

طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا۔ فکر و طبیعت کی جو گرم جوشی پچھلی محنتوں کی بربادی کے تصور سے بُجھ جاتی ہے، بہت دُشوار ہوتا ہے کہ اسے دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسی بدقسمتیوں سے دوچار ہوئے ہوں۔ میں نے ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) کے حالات میں جب پڑھا تھا کہ اس نے انقلاب فرانس پر اپنی مشہور کتاب دوبارہ تصنیف کی اور اہل فن نے اسے قوت تصنیف کا ایک غیر معمولی مظاہرہ سمجھا تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے لیکن اس حادثے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ نہ صرف غیر معمولی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے اور فی الحقیقت کارلائل کی مصنفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

ترجمان القرآن کی از سرِ نو ترتیب

کئی سال گزر گئے، مگر میں اپنے آپ کو اس کام کیلیے آمادہ نہ کر سکا۔

دلی سرگشتہ دارم کہ در صحرا است پنداری

بارہا ایسا ہوا کہ ترجمہ و تفسیر کے بچے کھچے اوراق نکالے، لیکن جونہی برباد شدہ اوراق پر نظر پڑی، طبیعت کا انقباض تازہ ہو گیا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑا۔

لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے وقت کا سب سے ضروری کام ہے، ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصے تک طبیعت غافل رہتی۔ جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا اس کام کی ضرورت کا احساس میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا تو شاید عرصے تک اس کی انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو۔

سنہ ۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں، دل کی جوشش بے اختیار سے خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا ابتدا میں چند دنوں تک طبیعت رُکی رُکی رہی، لیکن جونہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے، طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس شوریدہ کدۂ مستی میں افسردگی و خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا:

بہ بدمستی مزد گر متہم سازد مرا ساقی

خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے، مگر اس حالت میں ملے کہ تمام ذخیرہ برباد ہو چکا تھا۔

افسرانِ تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا ہے تو یہ قلمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے اور الگ الگ پیٹھوں کی دفتیوں میں ترتیب دیے ہوئے تھے۔ ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا، لیکن جب واپس ملے تو محض اوراقِ پریشاں کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔

یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمایش تھی، لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے لبوں کو لگایا لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا، البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے:

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا کہ دونوں کو بیک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا، نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زاں شکستم کہ بہ دنبالِ دلِ خویش مدام
در نشیبِ شکنِ زلفِ پریشاں رفتم

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سرِ نو محنت کی جائے، لیکن اس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہو گئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثہ کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔

طبیعت کی بڑی رکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہلِ قلم کے لیے اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں۔ وہ ہزاروں صفحے نئے بہ آسانی لکھ دے گا، لیکن ایک ضائع شدہ صفحے کے دوبارہ لکھنے میں اپنی

اصول ترجمہ و تفسیر

ترجمان القرآن کے مقاصد و مطالب جن اصول و مبادیات کے ماتحت ترتیب دیے گئے ہیں، قدرتی طور پر طبیعتیں منتظر ہوں گی کہ اصل کتاب کے مطالعے سے پہلے ان سے آشنا ہو جائیں۔ اس دیباچے کے لکھنے کے وقت تک میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس بارے میں ایک مختصر سی تحریر بطور مقدمہ کتاب شامل کر دی جائے گی، لیکن اب کہ دیباچہ لکھ رہا ہوں، ان اصول و مبادیات کو سمیٹنا چاہا تو معلوم ہوا موضوع کی پیچیدگیاں اور مباحث کی گہرائیاں ایسی نہیں ہیں کہ تفصیل و اطناب کے بغیر بیان میں آ سکیں۔ مباحث میں سے ہر مبحث کی وضاحت کے لیے مقدمات اور تمہیدات ناگزیر ہیں اور ہر مبحث کے اطراف اس طرح دور دور پھیلے ہوئے ہیں کہ نہ تو سمیٹے جا سکتے ہیں نہ مجمل اشارات عام مطالعے کے لیے کفایت کر سکتے ہیں، مجبوراً اس خیال سے دست بردار ہوتا ہوں اور ایک سرسری اشارہ ان مشکلات و موانع کی طرف کر دیتا ہوں جو اس راہ میں حائل تھے، تاکہ اندازہ کیا جا سکے معاملے کی عام حالت کیا تھی اور مطالعۂ قرآن کا جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ کس رُخ پر جا رہا ہے۔

باقی رہے ترجمان القرآن کے اصول تفسیر تو ان کے لیے مقدمۂ تفسیر کا انتظار کرنا چاہیے۔ جو ترجمان القرآن کے بعد اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے جس کے قدیم مسودات کی تہذیب و ترتیب میں آج کل مشغول ہوں۔

قرونِ اخیرہ اور قرآن کے مطالعہ و تدبّر کا عام معیار

مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ محل نہیں، صدیوں سے اس طرح کے اسباب و موثرات نشو و نما پاتے رہے ہیں جن کی وجہ سے بتدریج قرآن کی حقیقت نگاہوں سے مستور ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ اس کے مطالعہ و فہم کا ایک نہایت پست معیار قائم ہو گیا۔ یہ پستی صرف معانی و مطالب ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ ہر چیز میں

ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

اتنا ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیے شورش تازہ کی سرمستیاں مجلس دوشیں کی کیفیتوں سے بھی کہیں تند تر ہوگئیں :

چہ مستی ست نہ دانم کہ رو بہ ما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد

سبحان اللہ! عالم روح و قلب کے تصرفات کا بھی کچھ عجیب حال ہے! یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دور نہیں ہوا، یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو روک نہیں سکتا :

شوریست تو از ریزۂ تار نفسم را
پیدا نہ ای جنبش مضراب کجائی

بہرحال کام شروع ہوگیا اور اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر و ترجمہ کے لیے بھی ضروری تھی سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے، صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی، سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں، تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا اور ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و تفسیر سے فارغ ہوا۔

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم و قراءت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔

لیکن صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔

فطرت سے جب بُعد ہو جاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں۔ وہ سادگی کے لیے حسن و عظمت کا تصور نہیں کر سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور شاندار دکھانا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ و خم پیدا کر دیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا۔ سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں، اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے۔ لیکن خلف کی طبیعتوں پر وہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کر دیے اور چونکہ یہ جامہ اس پر راست نہیں آسکتا تھا، اس لیے بتکلف پہنانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی، ہر بات ناموزوں اور الجھی ہوئی بن کر رہ گئی۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریق استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور و مرکز اس کا طریق استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم، اس کے مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے کھلتے اور ابھرتے تھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی گویا اس کا

ہوئی، حتیٰ کہ اس کی زبان، اس کے الفاظ، اس کی تراکیب اور اس کی بلاغت کے لیے بھی نظر و فہم کی کوئی بلند جگہ باقی نہیں رہی۔

ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنھیں مجتہدانہ ذوق و نظر کی قدرتی بخشایش نے صفِ عام سے الگ کر دیا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اخیرہ تک جس قدر مفسّر پیدا ہوئے ان کا طریقِ تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے، جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت اس کے برعکس ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیے ہیں۔ پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔

بعض اسباب و موثرات جو فہمِ حقیقت میں مانع ہیں

یہ مخالف اثرات جو یکے بعد دیگرے جمع ہوتے رہے دو چار نہیں، بے شمار ہیں اور ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ اختصار کے ساتھ بیان میں آسکیں، لیکن میں نے مقدمۂ تفسیر میں کوشش کی ہے کہ انھیں چند اصول و انواع کے ماتحت سمیٹ لوں۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل دفعات قابلِ غور ہیں:

قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان، اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال، غرض کہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے اور نہ اسے پابند ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیائے کرام (علیہم السلام) کے طریقِ ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔
اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے
صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے:

"أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا"

دراصل تفسیر بالرائے میں "رائے" لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا جہاں زمین و آسمان اور کواکب و نجوم کے الفاظ آ گئے ہیں، یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے، یا مثلاً آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض مدعیانِ اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانہ حال کے اصول علم و ترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے، گویا قرآن صرف اسی لیے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس COPERNICUS اور نیوٹن (NEWTON) نے یا ڈارون DARWIN اور ویلیس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی اسے چند صدی پہلے معمول کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پیش تر کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔

جستجوئے حقیقت

یہ چند اشارات ہیں کہ اختصار کے تقاضے اور محل کی تنگ نائی پر بھی حوالہ قلم ہوئے شرح اس

سب کچھ ہی گم ہو گیا:

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ، مدعا ایں جاست

انبیا ء کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیئے پھر ان کی بحثوں میں مخاطب کو الجھانا شروع کر دیں۔ وہ براہ راست تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے، ہر دل قدرتی طور پر قبول کرلیتا ہے۔ لیکن ہمارے مفسروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کرلیں۔ انھوں نے انبیاء کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انھیں منطقی بنا دیں اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچے میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوب روئی اور دل نشینی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہو گئی۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک و ایرادات کے بے شمار دروازے کھل گئے۔

یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں پیش نہیں آتی، بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی اصطلاحات پیدا کر دی تھیں عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کے متعلق وہ نہیں ہو سکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پائے۔ لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دوراز کار بحثیں پیدا کر دی گئیں چنانچہ خلود، احدیت، مثلیث، تفصیل، حجۃ، برہان، تاویل وغیرہا نے وہ معانی پیدا کر لیے جن کا صدر اول میں کسی سامع قرآن کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکایا جائے، ٹھیک اسی

اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا:

راہی کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں، میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے:

سبک زجای نگیری کہ بس گراں گہرست
متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی

مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۲ : ۱۱۱)

۱۶ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء
ڈسٹرکٹ جیل، میرٹھ

ابوالکلام

معاملے کی بہت طولانی ہے۔

تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل

کم از کم ان مجمل اشارات سے اس بات کا اندازہ کرلیا جاسکتا ہے کہ راہ کی مشکلات و موانع کا کیا حال ہے اور کس طرح قدم قدم پر پردوں کو ہٹانا اور چپے چپے پر رکاوٹوں سے دوچار ہونا ہے۔ پھر رکاوٹیں کسی ایک گوشے ہی میں نہیں ہیں اور مشکلات کسی ایک دروازے ہی سے نہیں آئی ہیں۔ بیک وقت ہر وادی کی پیمایش اور ہر گوشے میں نظر و کاوش ہونی چاہیے، تب کہیں جاکر حقیقتِ گم گشتہ کا سراغ مل سکتا ہے۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے کوشش کی ہے کہ ان مرحلوں سے عہدہ برآ ہوں۔

آخر میں چند الفاظ اس پورے سلسلۂ ترجمہ و تفسیر کی نسبت کہہ دینا ضروری ہیں۔ کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا ذخیرہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں:

رہا ہوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں
مری نظر میں ہیں رنداں و پارسا اک ایک

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا میں نے اول روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں

تفسیر "اُم القرآن"

یعنی

تفسیر سورہ فاتحہ

دیباچہ طبع ثانی

صفاتِ الٰہی کا مسئلہ ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بحث و نظر کی سرحد ایک طرف مابعد الطبیعیات METAPHYSICS سے جا ملی ہے، دوسری طرف مذہب سے اور دونوں نے یکساں طور پر اسے اپنے حلقۂ فکر کا موضوع تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و نظر کے ہر دور میں علماء مذاہب سے زیادہ فلسفیوں کی کاوشوں نے اس میں حصہ لیا اور ہندوستان، یونان، اسکندریہ اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ مسلمانوں میں جب علم و توحید و کلام کی بحثوں نے سر اٹھایا تو اسی مسئلے میں سب سے زیادہ ردوکد ہوئی اور مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ اصحابِ حدیث اور اشاعرہ کا سب سے بڑا اختلاف اسی دروازے سے آیا تھا۔

یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسئلوں کے ہے جو طالب علمی کے زمانے میں میرے لیے سخت تشکیک و خلجان کا باعث ہوئے تھے اور مدتوں حیران و سرگشتہ رہا تھا۔ بالآخر جب حقیقتِ حال منکشف ہوئی تو معلوم ہوا کہ متکلمین کی رہنمائی اس راہ میں کچھ سودمند نہیں ہو سکتی، بلکہ منزلِ مقصود سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔ یقین و طمانیت کی اگر راہ ہے تو وہی ہے جو ظواہرِ قرآن نے اختیار کی ہے اور جس سے متبعین سلف منحرف ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم میانۂ دریا کنارہ شد

قید خانۂ قلعۂ احمد نگر
۷، فروری ۱۹۴۵ء

ابوالکلام

تفسیر سورہ فاتحہ

(۱)
سورت کی اہمیت اور خصوصیات

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے، اس لیے "فاتحۃ الکتاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے کہ جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی، اس لیے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۱۵ : ۸۷)	اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمھیں سات دہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم!

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے، کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو "السبع المثانی" بھی کہتے ہیں۔ احادیث و آثار میں اس کے دوسرے نام بھی آئے ہیں جن سے اس کی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے، مثلاً ام القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن۔

عربی میں "ام" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو ام الراس کہتے ہیں، کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔

الفاتحہ

مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

سورۂ فاتحہ ۔ مکیّ ۔ سات آیتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو الرحمٰن اور الرحیم ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ع

ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اُس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلا لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

کہ قرآن نے اس سورت کا ذکر کرتے ہوئے "سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ" کہہ کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کر دیا، یعنی ہمیشہ دہرائے جانے اور ورد رکھنے ہی میں اس کے نزول کی حکمت پوشیدہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نادان اور ان پڑھ ہو، لیکن ان چار سطروں و یاد کر لینا اور ان کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ لینا اس کے لیے کچھ دشوار نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھ سکا، جب بھی اس نے دینِ حق کا بنیادی سبق حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اس سورت کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہوا اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہو سکی" لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الۡکِتَابِ" (صحیحین) اور اسی لیے صحابۂ کرام اسے "سورۃ الصّلٰوۃ" کے نام سے پکارتے تھے، یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے مزید معرفت اور بصیرت کا ذریعہ ہوگا، لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

دینِ حق کا ماحصل

دینِ حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر غور کیا جائے گا، ان چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دے گی:

(۱) خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصوّر۔ اس لیے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔

(۲) قانونِ مجازات کا اعتقاد۔ یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں، نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے۔ بُرے کا بُرائی۔

(۳) معاد کا یقین، یعنی انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

(۴) فلاح و سعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔

سورۂ فاتحہ کا اسلوبِ بیان

اب غور کرو ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے! ایک طرف زیادہ مختصر حتّٰی کہ گنے ہوئے الفاظ ہیں، دوسری طرف ایسے جچے تُلے الفاظ کہ ان کے معانی سے

مکہ کو امّ القریٰ کہتے تھے، کیونکہ خانۂ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی پس اس سورت کو ام القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔

اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد. الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہد نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابی ابن کعب کو یہ سورت تلقین کی اور فرمایا "اس کے مثل کوئی سورت نہیں"، ایک دوسری روایت میں اسے "سب سے بڑی سورت" اور "سب سے بہتر سورت" بھی فرمایا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے یعنی قرآن کی تمام صورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں سورۂ فاتحہ میں انھیں کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشیں کر لے، جب بھی وہ دین حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

علاوہ بریں جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے. اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصل بیانات کا ایک مختصر اور سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بہ آسانی ذہن نشین کر لے اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دہراتا رہے۔ یہ اس کی دینی زندگی کا دستور العمل، خدا پرستی کے عقائد کا خلاصہ اور روحانی تصورات کا نصب العین ہوگا، یہی وجہ ہے

نہیں آتی معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک شعر کے پیرائے میں بیان کی ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست — وگرنہ

اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست!

دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھادی ہوں۔ چونکہ خدا پرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جاسکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی تصور کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر دیتا دے اور یہی سورۂ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔ اس سورت نے نوعِ انسانی کے وجدانی تصورات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ اپنی شکل و نوعیت میں نمودار ہوگیا اور چونکہ یہ ہر حقیقتِ حال کی سچی تعبیر ہے، اس لیے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا، بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس کا ہر بول اور ہر لفظ اس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے! دینِ حق کی مہمات پھر دیکھو! اگرچہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خدا پرست انسان کی سیدھی سادی دعا ہے۔ لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دینِ حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہوگیا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کر رہے ہیں:

۱۔ خدا کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنا لیتا تھا۔ سورہ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کردیا۔ اس کی ابتدا "حمد" کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ "حمد" ثنا جمیل کو کہتے ہیں، یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثنا جمیل اسی کی کی جاتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس "حمد" کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہوسکتا، جو ذات محمود ہوگی وہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔

پھر "حمد" کے بعد خدا کی عالمگیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے اور اس طرح صفاتِ الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشو و ارتقاء کے لیے ضرورت ہے اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس

پوری وضاحت اور دل نشینی پیدا ہوگئی ہے۔ساتھ ہی نہایت سیدھا سادا بیان ہے کسی طرح کا پیچ وخم نہیں، کسی طرح کا الجھاؤ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے۔ اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دل نشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمھارے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو، وہ اس طرح قبول کرلے گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات ہو۔ اردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب غور کرو! جہاں تک انسان کی خدا پرستی اور خدا ترسی کے تصورات کا تعلق ہے اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور اس سے زیادہ سہل اور دل نشین اسلوب بیان کیا ہوسکتا ہے۔ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں، ہر بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں، اور ہر لفظ صاف اور دل نشیں معانی کا نگینہ جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کرکے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ اپنی جہالت و غفلت سے انسان غور و فکر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ لگ چلنے کی طلب گاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کہ ہم متواتر یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فہم اور تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے۔ جب تک سامنے

ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی زمانہ، کوئی فرد ہو، لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے۔ ایک ناکام انسانوں کی۔ پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لیے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف انگلی اٹھا دی جائے، اس سے زیادہ کچھ کہنا ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لیے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر تعلیم وامر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔ دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہیے؟ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سرجوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار اُبل پڑتا ہے۔

راہ میں پیش آسکتی ہیں

۲۔ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں حدک عالم گیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشۂ وجود کے لیے ہے، اور اس لیے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہوگئی تھیں اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لیے ہیں، کسی دوسری قوم کا ان میں حصّہ نہیں۔

۳۔ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں "الدّین" کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے اور جزا کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزاء انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو۔ کیونکہ "اَلدِّیْنَ" کے معنی بدلے و مکافات کے ہیں۔

۴۔ ربوبیت اور رحمت کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے وصف نے بھی یہ حقیقت آشکارا کردی کہ اگر کائنات میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں، تو یہ اس لیے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے اس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

۵۔ "عبادت" کے لیے نہیں کہا کہ "نَعْبُدُكَ" بلکہ کہا "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" یعنی یہ کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں" اور پھر اس کے ساتھ "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہہ کر "استعانت" کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں بند ہوگئیں۔

۶۔ سعادت و فلاح کی راہ کو "اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو۔

۷۔ پھر اس کے لیے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بنا دی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ

اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوعِ انسانی کی عالم گیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوعِ انسانی کی عالم گیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو! مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیّا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے، ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی، دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا، عالم گیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوتِ قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح

اب چند لمحوں کے لیے سورۂ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد و تصور کی جو روح مضمر ہے وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو ایک انسان کے دل و زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے، اس صورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کی حمد میں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ گویا کہ خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے۔ اور جو کچھ بھی اس کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرماں روائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا، اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا، اب کسی کے آگے اس کا دست طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے، لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں

تذکرہ

"کوئی صاف راہ پر دوڑتا آگیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی، لیکن ہم اس کو بھی بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے۔ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے تب جا کر اس کوچے میں دم لے سکے جہاں اپنے کو پا رہے ہیں۔"

لوٹ سکتا ہے جو جا چکا!

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمایش میں پورا اترے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ! اگر وہاں رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ اور فَوْزٌ عَظِيْمٌ کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی، تو پھر بخت بخت ارجمند ہے اور طالع طالع بلند۔ لیکن اگر وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اور لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ کی رسوائی و مایوسی ملی، تو پھر نہ اس حرماں نصیبی کے لیے کبھی امید ہے، نہ اس ماتم حسرت کے لیے کبھی خاتمہ۔ بخت اسکندری و تخت جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لے کر کیا کیجیے!

گر بدانم کہ وصال تو بدیں دست دہد
دل و دیں را ہمہ در بازم و توفیر کنم!

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ، و دار الہجرت سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے، قبلہ عبادت گزاران عشق، و کعبۂ نیازمندان شوق علیٰ صاحبہا الصلوات والتحیہ:

دارم دلے گرداں، کہ من قبلہ نما می خوانمش
رو سوئے ابرویش کند، ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم فِی الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر۔ تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن در پیش۔ البتہ کسی کے لیے سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لیے حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا

مولد و منشا طفولیت وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم ہے یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام؛

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے، قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا ہے۔

تذکرہ*

یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتوا فانتبھوا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ، غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا، اور مصرعۂ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد!

سبحان اللہ! بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے، نہ شاہ راہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی، تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی، نہ ہمت میں کارفرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سرو سامانِ کار ناپید۔ وقت جا چکا، اور ہر آن و ہر لمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے، پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے۔ جو لٹ چکی، اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر

---

* مولانا نے تذکرہ اپنے ایک دوست جناب فضل الدین احمد کے اصرار پر لکھا تھا۔ جب وہ رانچی میں ۱۹۱۶ سے ۱۹۱۹ تک نظر بند تھے۔ یہ ایک خود نوشت سوانح ہے گو کہ مولانا نے اپنے بارے میں آخر کے چند صفحوں میں ہی لکھا ہے۔ یہ انتخاب تذکرہ کے خود نوشت سوانح کے حصے سے لیا گیا ہے۔ جس میں مولانا نے بہت سچائی سے اپنی زندگی کے ذاتی تجربات بیان کیے ہیں۔

ایک شامِ مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کرسکا:

بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا، چراغ جلتا نہیں کہیں کا!

یا امید و حسرت کے دو دن، ایک ہوسِ تعمیر میں بسر ہوا، ایک ماتمِ تخریب میں۔ ایک دن تنکے چنتے رہے دوسرے دن دیکھا، تو راکھ کا ڈھیر تھا۔ جس پر خوب جی بھر کے آنسو بہائے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

ابو طالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی:

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود بیش — آہم کلیم! با تو چہ گویم، چساں گزشت

یک روز صرفِ بستنِ دل شد بایں و آں — روزِ دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت

اور در اصل اس شعبدہ گاہِ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا اور قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ! کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز (و) بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے:

ومتی یساعد نا الی سال، ودھرنا

یومان، یوم نوی ویوم صدود!

عہدِ طفلی ایک خوابِ عیش تھا:

حیف صد حیف کہ ما زود خبردار شدیم

آنکھیں کھلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی، اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا، تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی، تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستانِ امید اور نگارخانۂ فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لیے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا، یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنی ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی، یا نو گرفتارانِ طلسمِ شباب کی ہوش ربائیوں کے لیے خودسازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے۔

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے، اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں:

کس نمی گوید م از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است

جتنی زندگی گزر چکی ہے، گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلمِ درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز، اور فکرِ گم گشتہ حیرانِ اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگزشت و رُوئیداد غم لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمودِ غبار و جلوۂ سراب کی تاریخِ حیات قلم بند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرا دیے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغِ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ۔ آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں، تو لکھ لیجیے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتمِ یاس!

عاشق نہ شدی محنتِ الفت نہ کشیدی
کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید!

پہلے مجسّم امید تھا؛ اب سرتاسر حسرت ہوں:

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستان سرائی کا شوق ہو تو اس پورے تیس برسوں کی سرگزشت سن لیجیے۔ حکایتِ برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لیے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے۔ صرف ایک نالۂ گرم اور آہِ سرد میں پوری حکایت ختم ہے:

ہمسایہ شنید نالہ ام، گفت:
"خاقانی را دگر شب آمد!"

ایک صبحِ امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی:

ہم چو عیدے کہ در ایامِ بہار آمد و رفت

بھی رونے میں کمی نہ کی؛ اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا، تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی:

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ سدا
درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا!

بہتر یہ ہے کہ صاف ہی کہہ دیا جائے:

ہاں! بانگ بلند ست ایں، پوشیدہ نمی گویم

البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامہ غفلت و خود فراموشی میں نفس لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے۔ اور پہنچتی ہے تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ ان کے شور و غل میں یہ سرگوشیِ ملامت کب کام دے سکتی ہے! لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینیوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا کچھ عجب حال ہے:

کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد

ہر چند راہ ایک ہی ہے، لیکن کرشمے بے شمار ہیں۔ اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوے سے نہیں:

اے ترا با ہر دلے رازے دگر
ہر گدا را بر درت نازے دگر!

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ طلب و سعی سے انکار نہیں، لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے، تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟

غفلت ومدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی وسرگرانی نے جام بھرے، جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا، اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود سمجھا ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا: راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا:

ساقیا! مرنج ازمن، عالمِ جوانی ہاست!

جس طرف نظر اٹھائی، ایک صنم آبادِ الفت وپرستش نظر آیا، جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب۔ ہر مورتی دل فروشی وجاں سپاری کے لیے وبالِ ہوش۔ ہر جلوہ برقِ تمکین واختیار، ہر نگاہ بلائے صبر وقرار۔

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی، وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجیے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی، مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا، ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا فسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوشربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔

فرصت ز دست رفتہ وحسرت فشردہ پاے
کار از دوا گذشتہ وافسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا، تو سربلندی وسرفرازی کے لیے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری وافتادگی پر نظر پڑ گئی، تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی، تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی، آوارگی ورہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی وبے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا، تو اپنی آنکھوں نے

اصل یہ ہے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے، اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لیے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے لیے سب سے کٹنا۔ اس دروازے کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں جو پہلے کھول لیے گئے تھے:

در قبولِ نظرِ عشق ہزاران شرط است
اول از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں اور پرستشِ ماسوی اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا کوئی طاقتور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے، جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ نہ ناخنِ گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کی انتظاری۔ ایک سوکھی لکڑی کے جلانے کے لیے ہزاروں تدبیریں کیجیے تب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لیے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے:

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی؟
از یک نگاہ کشت، جوابے دگر نہ داد

یہی وجہ ہے کہ اس سفر کی سب سے اقرب راہ منزلِ مجاز ہی سے ہو کر نکلی ہے:

بادہ گر خام بود، پختہ کند شیشۂ ما

ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے! کوئی درمیانی منزل ہو؛ اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو پھر وہی منزل بُت ہے اور رہرو اس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔ چنانچہ الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفے نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے؛ کوئی گوشہ، کوئی مقام باقی نہ چھوڑا!

شمہ از داستانِ عشقِ شور انگیز ماست
این حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند

ناگہاں جذبۂ توفیقِ الٰہی پردہ عشق مجاز میں نمودار ہوا، اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی چمکی، اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا۔

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناگہہ ز کمیں
عالم آشوب نگاہے سرِ راہم بگرفت

اصل میں منزلیں تین ہی ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم، پختہ شدم، سوختم

اور یہاں عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے، نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے، عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے، تو یہی ہے؛ زمین کا مدار و محور قائم ہے، تو اسی کے دم سے۔ دنیا میں جس قدر ظاہر ہے، یہی ہے، جس قدر باطن ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمھاری نگاہِ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں، جو اسی کج نظری اور کثرت بینی نے جمال حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں، ورنہ:

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی۔ لیکن اُس لغزش کو کیا کہو گے، جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہ نما بن جائے، تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں! لاکھوں ہشیاریاں اس پر نچھاور:

گر طمع خواہد ز من سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں۔

رہے، دلیلِ راہ رہا۔ جب صبح ہوگئی تو ضرورت نہ تھی: بجھا دیا گیا۔

وہی دنیا جس کے مے کدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اس کا کونہ کونہ، چپّہ چپّہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرمِ گفتار پایا۔ پتّے پتّے کو مکتوب و مستور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کیے۔ خاکِ پامال نے اڑ اڑ کر گہرافشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بارہا اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا، تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیے۔ سارے پردے چھلنی ہوگئے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔

جس حال میں رہے، نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے، کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم رہنما چھوڑا۔ رندی و ہوسناکی کا عالم رہا، تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں، تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔ لمحوں کے اندر برسوں کے کام انجام پائے۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اب جس حال و رنگ میں ہیں، تو یہاں بھی کمال ہی کی آرزو ہے، اور اتمام کار کے لیے بیقراری؛ اور سارا معاملہ اسی کارسازِ غیب کے ہاتھ ہے جس نے گو ہر راہ میں ڈالا لیکن اٹکایا کہیں نہیں اور گو ہر وادی میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے سرگردانی ضرور ہوئی۔ یہ سرگردانی بھی ہدایت یابی سے خالی نہ تھی:

تا دست رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

کچھ قمریوں کو یاد ہیں، کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن ہر رہ رو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے؛ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش، یا شمع کی خاموشی و سوزش:

وللناس فی ما یعشقون مذاهب

معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے:

عریاں تنی خوش ست، ولے زیب دیگر ست
دامانِ چاک چاک و گریباں دریدہ را

کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ و زاری کی ہو، تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی، ایک ایک لمحہ ایسا گزر چکا ہے کہ سیکڑوں آہیں اندر ہی اندر کھپنکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر ہی اندر چلی ہیں۔ آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی، تو دل کے گوشے ہی طوفان اٹھاتے رہے:

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر مایوسی و ناکامی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔

سبحان اللہ چارہ فرمائے غیبی کی کارسازیاں، اور رہ نمائے آوارگانِ غفلت کی دست گیریاں! جاذبۂ توفیق کب سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، مگر غفلت کی درماندگی دامن گیر تھی۔ جمالِ حقیقت کب سے بے نقاب تھا، مگر پردۂ کج نظری حائل تھا۔ کرشمۂ عنایت کب سے پکار رہا تھا، لیکن نفس کے ہنگاموں میں دل غافل تھا۔ ناکامیِ عشق نے آخری ضرب لگائی، تو یکایک آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو ایک دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں سامنے تھیں۔ نہ وہ آسمان تھا نہ زمین تھی۔ نہ وہ آفاق، نہ وہ انفس جس ہاتھ کی رہ نمائی نے یہاں تک پہنچایا تھا، خود اس کو بھی ڈھونڈھا تو پتا نہ تھا۔ گویا وہ ایک چراغ تھا کہ جب تک چراغ کی تاریکی میں چلتے

اپنی بیوی کی علالت اور دائمی جدائی پر

غبارِ خاطر

"اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ اور کچھ کہہ سکتی تھی، جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا"

حالات ابتدا سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے، جن تک بتدریج رسائی میسر آئی۔ قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ جو کچھ پایا ہے، صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہ نمائیاں ملیں، صرف اسی مرشدِ فیض و ہادی کے طریق سے ملیں۔ علم کا دروازہ اسی نے کھولا۔ عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی۔ معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے۔ حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے کھولے۔ نظر اسی نے دی۔ دل اس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی؟ کون سا الجھاو تھا، جو اس کی ایک سلجھی ہوئی نظر سے سلجھ نہ گیا؟ کون سی بیماری تھی، جس کی دوا اس کے دارالشفا سے نہ مل سکی۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو، تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں، جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے، تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی، لیکن ہم اس کو بھی بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے جب کہیں جاکر اس کوچہ میں دم لے سکے، جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں۔

تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی، لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں مَیں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں۔ اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے جنوبی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لیے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

اپنی بیوی کی علالت اور دائمی جدائی پر*

قلعۂ احمد نگر

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکرآں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم!

صدیق مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں۔ بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا کمرہ میں آیا۔ روشنی کی، اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

دماغ برفلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم، دل کجا دماغ کجا؟

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا،

---

*۔ زلیخا بیگم کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔ اس موقع پر جو مولانا کے جذبات و احساسات تھے وہ انھوں نے مذکورہ بالا خط میں اپنے دوست نواب صدر یار جنگ کو لکھے ہیں۔ یہ ان بیس خطوں میں سے ایک ہے جو مولانا نے قلعۂ احمد نگر میں اسیری کے دوران دس اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء تک لکھے ہیں۔ مولانا کے سکریٹری جناب محمد اجمل خاں نے مولانا کے چند اور خطوط جو نواب صدر یار جنگ کے نام تھے، ان کے ساتھ ملا کر خطوط کا ایک مجموعہ "غبار خاطر" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع کر دیا۔

میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو، ۱۷ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی، اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا، جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم، جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے، اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جا سکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے۔ کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس کے ہی ذریعے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعے نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے

وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کرلیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے ہیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ر اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ر اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء؁ میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ

ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقباد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم!

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں۔ ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں۔ جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا؛ و جس قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے

روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط وکتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے۔ اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو اس میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے، اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو اسے فوراً بمبئی بھیج دیگا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا، اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جوں ہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے

مجھے چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ، ولے آہ چارہ نیست
ریں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمّم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا:

لقد لامنی عند القبور علی البکاء   رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رأیتہ   لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے۔

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک آدمی اندر آکے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساسات کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبّہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب ولے، کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ راپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا۔

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی معلوم ہوگئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا۔ اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جونہی انھیں معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی۔ اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

چائے اور قید کی زندگی کی مسرتیں

غبارِ خاطر

"میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں
اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے
باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا جاتا ہے۔"

نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی۔ زمانے کی بے راہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا:

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتّوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا۔ یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں۔ لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی۔ ان کے لیے وسائل میں۔ غور فرمائیے، میرا رخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جا رہی ہے۔ لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہ راست گئی۔ مثلاً روس، ترکستان، ایران وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گزرا۔ مگر سترہویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انہوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی، اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انہی کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعت سیّیہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد براں مزید کرد۔ اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے لیکن ان کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں انہیں کون چھانٹ سکتا ہے؟ لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوا بناتے ہیں۔ کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

چائے اور قید کی زندگی کی مسرّتیں

قلعۂ احمد نگر

۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار　　رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہوگئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں:

یک نالۂ مستانہ ز جائے نہ شنیدیم　　ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ داری

اس کارگاہ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دُرد کدُورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا، اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند و صفحہ تمام نہ شد کہ ورق بر نہ گردید:

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال　　چوں صفحہ تمام شد ورق برگردد!

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے وقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے یا

★ مولانا نے اپنے متعدد خطوں میں اپنے دوست صدر یار جنگ کو اس مسرت کے بارے میں لکھا ہے جو انہیں چائے پینے سے ہوتی تھی۔ اکثر ان ہی خطوط میں اس خوشی کا ذکر بھی ہے جو وہ قید کی زندگی سے حاصل کرتے تھے ان میں سے اوّل الذکر کا تعلق حسیات سے ہے اور آخر الذکر کی نوعیت ذہنی اور فلسفیانہ ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس تین مختلف خطوں سے اخذ کیا ہے جن کا حوالہ فٹ نوٹ نمبر ۱، ۲، ۳ میں دیا گیا ہے۔

کرنی چاہئیں:

پیرِ ما گفت خطا در قلمِ صنع نہ رفت　　　آفریں بر نظرِ پاکِ خطاپوشش باد!

غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو؟

تو و قطع منازلہا، من و یک لغزشِ پائے

اور پھر اگر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائے گا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود　　　ز زہد ہم چو توئی یا بفسق ہم چو منی!

اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جزءِ رواقیہ Stoics کا ہے ایک لذتیہ Epicureans کا

پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد ست

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقتِ بد کہ روئے دہد آب سیل دواں　　　ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند موجِ آب گیر:

ہائے کمبخت، تو نے پی ہی نہیں

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابونواس والی بات ہوئی کہ

رق الزجاج و رقت الخمر — فتشابها، فتشاکل الامر

کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

ساقی بدہ رطلِ گراں زاں می کہ دہقاں پرورد

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔ علمی اصطلاح میں اس صورتِ حال کو "علیٰ سبیل التوالی والتعاقب" کہیے۔ اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعہ سے خالی ہوا، ادھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔

اعتدالِ معانی از من پرس — کہ مزاجِ سخن شناختہ ام!

آپ کہیں گے، چائے کی عادت بجائے خود ایک علت تھی۔ اس پر مزید علت ہائے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا، گویا حکایت بادۂ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خودساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کہوں۔ جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور

لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا، ایک چمنستانِ بوقلموں کھل جائے گا:

نہ با صحرا سرے دارم، نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے!

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے، اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں۔ اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی، اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا۔ قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سر و سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد مغتنم شمار کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست؟

میں نے اپنے کاک ٹیل (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے:

چناں افیون ساقی در مے افگند حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار!

البتہ کاک تیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermouth) اور جن (Gin) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں درخور ہر ہوش نیست حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، انہیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آ سکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھنے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا، جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی وقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دَم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہو گا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم　　　اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا، اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا:

خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن　　　تا بہ بینیم سرانجام چہ خواہد بودن!

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اسی عالم میں ہوں، اور نہیں جانتا کہ ۹ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا، اور اب کیا ہو رہا ہے:

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش　　　کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش
کمندِ صید بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار　　　کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام است نے گورش

کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست　　ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا اینجاست!

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزہ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسّر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں۔ صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی۔ چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلائیے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مر جائے　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا، اور ساری دنیا اجڑ گئی:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست　　"عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد ست"

باہر کے سارے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست　　واں دراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ایں جامِ جہاں بین بتو کے داد حکیم؟　　گفت "آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد!"

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں، خواجۂ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہی ہے کہ:

خورشیدِ مے ز مشرقِ ساغر طلوع کرد　　گر برگِ عیش می طلبی ترکِ خواب کن!

موسیقی

غبار خاطر

"میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے ان ہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔"

میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا، اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں،

بازم بہ کلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پر شدہ ست!

کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصور نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانہ کا تھا، اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس آگئے جو اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے۔ اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کم سن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کر رہا ہے، متعجب ہوئے، اور مجھ سے فارسی میں پوچھا "یہ کس مصنف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خاں کی کتاب ہے اور فن موسیقی میں ہے۔ انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ ہندوستان کا فن موسیقی بہت مشکل فن ہے۔ کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔ انہوں نے ہنس کر کہا، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ۔ انہوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔ بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آکر اسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہرِ فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی تو طبیعت کو سخت الجھن ہوئی اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے۔ لیکن مدد لی جائے تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم و راہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال مسیتا خاں کی طرف گیا۔ اس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا جس کی ہمارے یہاں گزر تھی۔

موسیقی*

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے اس کے پاس لاسلکی کا سٹ ہے۔ کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آنکلتی ہے کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی، بی، سی کا پروگرام تھا اور کوئی وائلین (Violin) بجانے والا اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ لَے ایسی تھی جیسی کہ Mendelssohn کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سوانگس وِدآؤٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی!

حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنی ست ۔۔۔ بہ نالۂ دَف و نَے در خروش و ولولہ بُود!

ناگہاں ایک مغنیۂ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اٹھی اور اس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا جس کی طرف خواجۂ شیراز نے اشارہ کیا ہے:

چہ راہ می زند ایں مطربِ مقام شناس ۔۔۔ کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد!

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے، لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا تو بدستور انقباض خاطر واپس آگیا تھا!

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد ۔۔۔ یا کہ خود زخم مرا لذتِ آزار نہ ماند!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبا کو پڑھانے میں مشغول تھا، تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی، اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار

---

* یہ اقتباس مولانا کے اس خط سے ہے جو انہوں نے نواب صدر یار جنگ کو احمد نگر جیل سے موسیقی اور اس کی تاریخ کے بارے میں لکھا تھا۔

سے تائب ہوگیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کرلی۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ مسیتا خاں کا حال دیکھتا ہوں تو پیر چنگی کی حکایت یاد آجاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیر چنگی کی:

پیر چنگی کے بود مردِ خدا حبذا اے سرِ پنہاں حبذا

بہرحال میرا خیال اسی مسیتا خاں کی طرف گیا اور اس سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ پہلے تو اسے کچھ حیرانی سی ہوئی، لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آگیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظرِ توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سارا، گاما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا، اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہرحال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک راز دار مل گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہوگیا۔ پہلے ہفتہ میں تین دن مقرر کیے تھے۔ پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا۔ مسیتا خاں پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا:

عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود

مسیتا خاں نے تعلیم کا صرف ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے۔ وہی اس نے یہاں بھی چلایا، لیکن میں نے اسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہوگئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن اس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھایئے پوری طرح اٹھایئے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جایئے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے، گناہ کے کام کیے تو انہیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے، پارسائی کی راہ ملی تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔ رسم و راہ رکھیے تو راہ کے کاملوں

اس سیتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشہ کا خاندانی گویّا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ اور دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلّمی کیا کرتا تھا: تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ لیکن اصلاح و توجہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے۔ فرماتے، بغیر بیعت کے آتے رہو۔ دیکھو، خدا کو کیا منظور ہے اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ چنانچہ سیتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے، تو پہلے کچھ دیر دیوان خانہ میں بیٹھتے۔ پھر اندر جاتے، خاص خاص مرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے۔ سیتا خاں بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا اور دور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی تو پوچھ لیتے۔ سیتا خاں کیا حال ہے؟ عرض کرتا۔ حضور کی نظرِ کرم کا امیدوار ہوں۔ فرماتے۔ ہاں اپنے دل کی لگن میں لگے رہو۔ وہ بے اختیار ہو کر قدموں پہ گر جاتا اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے انہیں تر کر دیتا۔ ہا، ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا۔ رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے۔ یعنی رات کی مجلس خاص میں جو مریدوں کی تعلیم و ارشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی اسے والد مرحوم ٹال جاتے۔ مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا۔ فرماتے، اچھی بات ہے۔ دیکھو۔ ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہیں گی۔ وہ جاں باختۂ امید و بیم اتنے ہی میں نہال ہو جاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں:

زحاجب درِ خلوت سرائے خاص بگو "فلاں زگوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست"!

لیکن بالآخر اس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والد مرحوم نے اسے مرید کر لیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی معلّمی

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق — آتشے نیست چو در مجمرات، عود مخر!

میں آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا، اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

رُوئے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ست — ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند!

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانے میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے تو وہ ریڈیو سیٹ کا فقدان ہے:

لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی!

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے۔ جو اگرچہ خود گزر گئے، لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا۔ اور اس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں:

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم!

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی اَن گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے، اور ہوا کی لہروں پر

سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دست رسم بود زدم چاکِ گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم!

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ مل سکی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی، بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ شغلہ یک قلم متروک ہو گیا، اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

اور ایک بھنورے کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بو باس لی، اور اڑ گئے:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے!

چنانچہ زندگی کے چمنستانِ ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا کچھ دیر کے لیے رک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے، کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا، تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی   دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محرومِ ازلی پر، جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

کانگریس ایڈریس

(دہلی ۱۹۲۳ء)

ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملے سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ بدنصیب ہندوستان کی حفاظت کا ولولہ کب تک قائم رہ سکتا ہے۔!

بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آآ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں، اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کی لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے

ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے، جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں، بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسن ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کرسکا ہوں تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ یہ میرے وطن وقوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت بڑی سند ہے۔ میں اس عزت کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں، مگر اس ذمہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدس امانت ہے، آپ ہی سے ہمرہی واعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلاشبہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت میں، نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے، اور گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوششیں حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خدا کی زمین میں اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کام ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ ایسا ہو۔ پس، یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو، ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکرمند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ ہے، لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا، وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دستگیری کرے گی اور بالآخر انجام کی فتحمندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

وقت کے مسائل

میں وقت کے حالات و مسائل پر بھی نظر ڈالتا، جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کونسی بات ہے، جو نئی ہوسکتی ہے؟ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کرسکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات ومحسوسات کے لیے کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے ایک زمانہ تھا جب ہندستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر نکتہ چینی، شکایت میں مبدل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی صورت اختیار کرلی ایک مدت تک ہمارا طرز عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی، لیکن اب معاملہ اس حد سے گزرچکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہوگئے ہیں، گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک

کانگریس ایڈریس

رام گڑھ ۔ ۱۹۴۰ء

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چُنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدّوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدّت کوئی بڑی مدّت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب وقت کے پُرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔ ہم ہر منزل میں ٹھہرے، مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دُنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رُکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں، تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھائیے، اور سامنے کی طرف دیکھیے، نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے، بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور، اور آخری منزل سے

جدید مشرق

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حوادثِ عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوتی ہے وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آتی ہے۔ ہم دراصل ایک ایسے عہد انقلاب سے گزر رہے ہیں، جو ٹھیک ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے جن میں مؤرخین عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ اس کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں، اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے کے حدود اور خطوط بھی ہل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل قریب کے دامن میں کیا ہے؟ تاہم جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے، جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیداری ہی تھی، اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے سحر کار ہاتھوں نے صرف ترکی کے بخت خفتہ ہی کو بیدار نہیں کیا، بلکہ مشرق کے دروازہ پر بھی دستک دے دی۔ اب اس کی گونج ایک طرف وسط ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے۔ دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحر ہند کی لہروں کو عبور کر رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند نہ ہو گی!

حضرات!

ہندستان مشرق کی اس عام جد و جہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جد و جہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا ربط و یگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کر رہا ہے، جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت، حالات اور مقصد کی یکسانی قدرتی طور پر پیدا کر دیتی ہے۔ پس وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے، جو انصاف اور آزادی کے لیے جد و جہد

معمولی واقعہ ہے۔ اب نا انصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ اپنے عمل ویقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجۂ یقین تک آچکی ہے، اس میں نہ تو مزید اضافہ ہوسکتا ہے، نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ برابر ہوتا رہے گا، جب تک ہم اسے خود نہ بدل دیں گے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے، جن کی تبدیلی حالات پر موثر ہو، ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نا منصفانہ ہے، اور اگر یہ اس وقت تک قائم رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچا دیے ہیں پس نا انصافی جب کہ اس کا عمل نہیں ہے بلکہ خاصہ ہے، تو ہمیں نہ تو متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے۔

ترکی کی فتح عظیم

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہونگے، وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پُر جوش جذبۂ تہنیت کی ترجمانی کی عزت حاصل کروں، جو آپ کی قومی جدوجہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پُر فخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں آپ کی تاریخ کی ایک شاندار داستانِ عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق کے دو دور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے، اور ایک کی فتحمندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنھیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کر دیا ہے، کون ہیں؟ یہ ہندستان ہے، جس نے عین اس وقت جب کہ اسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ در پیش تھا، خلافت اسلامی اور حکومت ترکی کی آزادی وہ خود مختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا، اور یہ ترکی ہے اور اس کی جدید قومیت کا ظہور ہے جس کی انقلاب انگیز فتحمندیوں کا دنیا نے ایک زندہ جاوید معجزہ کی صورت میں مشاہدہ کیا ہے، اور جس کی فتحمند حب الوطنی کی روح تمام سرزمین مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی ہے۔

کیا تھا۔ ہر جماعتی جدو جہد کی کامیابی کے لیے اتحاد عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ۔ اس وقت ہم میں شرط کمزور ہو گئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آگیا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیجیے۔ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوئی، تو عجب نہیں، ہم ایک دوسرے خطرہ سے دوچار ہو جائیں۔ آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا، تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا۔ اور اگر کم کر کے دیکھا، تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے، نہ خائف، ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں۔ راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

قوانین اجتماع کی وحدت

ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کر لیں، جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں، لیکن بسا اوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگیز کرہ کی ایک ویسی ہی مخلوق ہیں، جیسی ان گنت اور نامعلوم مخلوقات اس یکساں گردش کے ساتھ ظہور میں آتی رہی ہیں، اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی، اس کائناتِ ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے اور اگرچہ اس میں زندگی اور حرکت کے بیشمار مظاہر ہیں، لیکن ان سب کے لیے ان کے خالق کی مرضی کی طرح قانونِ حیات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے، نہ اس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ تھلگ اور مختلف ہے جو کچھ ایک مرتبہ ہو چکا ہے، وہی ہمیشہ ہوتا ہے، اور جو ایک کے لیے ہوا ہے، وہی سب کو پیش آتا ہے، وہ یکساں ہے، ہمہ گیر ہے، باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ ایران کے فلسفی شاعر عمر خیام کے لفظوں میں "اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں

کررہی ہے، اور ہراس قوم پرافسوس کرتا ہے، جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے۔ وہ مصر، شام، فلسطین، عراق، مراکش اور دیگر اقطاعِ مشرق کے تمام محب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں، وہ ان کی آزادی کو کبھی اس سے کم محبوب نہیں رکھتے، جس قدر خود اپنے وطن عزیز کی آزادی کو۔

حضرات!

قسطنطنیہ اور یرودا جیل جب کہ ہم ترکی کی فتح عظیم کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالیشان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو بے اختیار ہمارا خیال ہندستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھڑی کے اندر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارکباد دی جائے، تو وہ ہندستان کے قائد اعظم مہاتما گاندھی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں، جنھوں نے اوّل نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کرلیا اور تمام ہندستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔ حضرات! ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مطالباتِ خلافت کے لیے جو جدوجہد کی، وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے، جس کے نتائج پر تاریخ بحث کرے گی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں۔ تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں، جو بلا کسی بحث و نظر کے ہم سب محسوس کر رہے ہیں اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدوجہد ظہور میں آسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندستان کی آزادی ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ نہیں، اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آگیا جو عرصہ سے اس کی راہ میں حائل تھیں۔

حضرات!

وقت کی مشکلات میں نے آغاز تقریر میں آپ سے وقت کی مشکلات کا ذکر

مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر گستاولی بان نے زیادہ جامع اور علمی پیرایہ میں بیان کیا ہے، جب ہم جماعتی زندگی کی سائیکولوجی اسی طرح مدوّن کر لیں گے، جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کر لی ہے تو پھر ہمارے لیے ممکن ہو جائے گا کہ ہم ایک قوم اور تمدّن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدن کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکے گی۔

ایک آزمایشی منزل

آیئے! ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں، جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصلی سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشو ونما جب اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خارج میں بھی اپنا اثبات کرے، تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے۔ مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی تاثر کی ہوتی ہے، جو فکر ورائے کے تمام انتشار و اختلاف پر غالب آ کر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطۂ اجتماع پیدا کر دے۔ افراد کے دماغ جب جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہو جاتے ہیں، تو ان میں عقل وادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ ادراک سے۔ جب ایسی حالت مہیّا ہو جاتی ہے، تو عملی جدوجہد ظہور میں آتی ہے اور بقدر اپنی قوت کے اُبھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معین حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اسے رک رک کر جانا پڑتا ہے۔ اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں، لیکن ہر حال میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ردّعمل (ری ایکشن) کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک ایک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک بندھن میں بیشمار بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے تھے، یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوتے ہیں، انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، اور قومی جدوجہد کو ایک سخت آزمایش پیش آ جاتی ہے۔ چونکہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے، اس لیے علم وادراک اس میں بہت کم تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوشمند اور

میں دہرائی جارہی ہے" اور فرانس کے مشہور شاعر وکٹر ہیوگو کے زیادہ مختصر لفظوں میں "حوادثِ عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے۔"

حوادثِ عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانینِ حیات کی اس غیر مبدّل یگانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے، اسی طرح مورّخ کی نگاہوں نے مطالعہ کیا ہے، اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد اور اجسام کے لیے ہے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح اور عصروں کے لیے بھی ہے۔ جس طرح افراد کا جسم ہے، دماغ ہے اور وہ تمام قویٰ اور خواص ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے، دماغ ہے، نفسیاتی (سائیکولوجیکل) کیفیات ہیں، جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گردوپیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں، جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے، بلکہ ان کی دماغی وجسمانی حالات سے ہے۔ ایک طرح کی دماغی وجسمانی حالات میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا، اسی طرح جماعتوں کے اعمال و احوال میں بھی جماعت کا تشخص و تعیّن بالکل غیر موثّر ہے۔ حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گردوپیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی جماعت کی ویسی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گردوپیش پیش آئے گا، ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں، قوموں کا آغاز و انجام، عروج و زوال، غفلت و بیداری، آزادی و محکومیت، فتحمندی و ناکامی سب پر یہی قانون نافذ ہے اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور جس کے لیے ہوا ہے بجنسہٖ وہی ہر قوم پر گزرتا اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے، جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی عبدالرحمن ابن خلدون نے (جس نے سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ کے مبادیات و اصول مدوّن کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے، اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں، تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہٖ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں کے تغیّر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیّر نہیں ہوتا، اس حقیقت کو موجودہ زمانہ کے

دماغ کے لیے قبول نہ کریں گے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو، یہ حالت بالکل ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ایک آدمی کا دوڑتے دوڑتے رک جانا کہ دَم لے کر پھر دوڑے۔

ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چین ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اسی وقت اقرار کیا جاتا ہے، جب وہ بالکل سامنے آجائے۔ لیکن خود ہم کو نہیں چاہیے کہ اپنی حقیقتِ حال کی نسبت کسی قسم کا شبہ قبول کریں۔ کیا ہے، جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدوجہد کے تمام دماغی قویٰ پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی سستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ کیا ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہمارے دلوں میں ہے، ایک مقصد کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے، اور روح کی طرح ہمارے جسم کی ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے۔

حضرات!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں آج آپ سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کردوں، جو فی الحقیقت آپ کے یقین واحساس کی ترجمانی ہے، میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدوجہد قائم ہے بدستور جاری ہے، اور ہم ایک ایسے وقفہ کی حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کُن معرکہ میں التوا ڈال دی ہے مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہشیاری، سرگرمی اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا ناامیدی کا کوئی سوال درپیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجیے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو، لیکن غفلت اور بد پرہیزی سے فوراً مہلک بنا دی جاسکتی ہے۔ آج جو آزمایش ہمیں پیش آئی ہے، فی الواقع یہ ایک عارضی وقفہ ہے، بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیونکر کرسکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس سب کا جواب ہم سب کو معلوم ہے، لیکن اس پر عمل دشوار

دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں، لیکن اپنے جذبات کو ان حالات و نتائج سے نہیں روک سکتے۔ تاہم اگر جدوجہد کا دماغ اور پھیپھڑا مضبوط ہو تو یہ جو کچھ ہوتا ہے، جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ، اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جونہی وہ مدّت ختم ہوتی ہے جو اس نشہ کے خمار کے لیے ضروری تھی معًا افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہو جاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رونما ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے کیونکہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا، گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کر رہی تھیں۔ اب دوسرے ظہور میں تازہ قوت کے ساتھ پچھلی قوتوں کے مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی یا ختم ہو جاتے ہیں یا جاری رہتے ہیں، بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ اُتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اُتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جدوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اُتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھے گا۔

ہماری اس قومی جدوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آگیا ہے۔ جدوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ یکایک باردولی کے فیصلہ نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ، وہ اچانک تھم گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا اور اس سے وہ تمام نتائج پیدا ہوئے۔ جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری جمعیت جنبش میں آگئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلتی اور بکھرتی جا رہی ہے۔ جدوجہد کا عام سکون، کانگرس کا اختلاف، ہندو مسلم اتحاد میں فتور، اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں، یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات!

یقینًا یہ ایک آزمائش ہے جس پر ہمیں فتحمند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑے گا اور عجب نہیں کہ بڑی کشمکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کرونگا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و

ہتھیار ہیں کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور رہوئی ہیں تو انھوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔ مذہب، اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ مصیبت برداشت کرلو، مگر حق سے منہ نہ موڑو کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی کمزوری اور بے بسی میں صرف یہی اصول ثبات و قرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط کے جام زہر میں دیکھتے ہیں۔ یروشلم کی صلیب پر نقش پاتے ہیں اور مکہ کی گلیوں میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دو صدیاں تمام تر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم و ستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں، یہی اصول تھا جس کی غیر مسخر قوت اسے تھامے رہی اسی عہد کے ایک مسیحی خدا کا ترتولین کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے، جو اس نے رومی عدالتوں کے سامنے بطور اپنے تحریری بیان کے پیش کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ امریکن مصنف ڈریپر کی "کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس" میں پڑھ سکتے ہیں۔

> اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ کونسی جگہ ہے جہاں ہم موجود نہیں شہر، جزیرے، صوبے، قلعے، فوجی بارکیں، دربار کے محلات، سینٹ کے اجلاس، غرضکہ ہر اس مقام پر جو تمہارے اقتدار کی علامتیں ہیں، ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں بجز تمہاری عبادت گاہوں کے، ہم نے تمہارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو، اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان بپا ہو جائے۔ لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھاتا ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں مگر مقابلہ نہیں کرتے۔

اس سے زیادہ مکمل اور موثر اسپرٹ مقاومت سلبی کی کیا ہوسکتی ہے؟ ہم چاہیں تو سترہ سو برس کے ان پرانے لفظوں کو بجنسہ آج بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

البتہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نامنصفانہ حکومت کے ظلموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور ایک دستورالعمل کے اختیار کیا جائے، اور مسلح انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کرلی جائے، ایک ایسا خیال ہے

کاؤنٹ لیوٹالسٹائی

ہو رہا ہے۔ ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

حضرات!

آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمائش سے کامیاب گزر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے، ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمائش کے نتیجہ کا تماشا کریں۔ کیا ہم اس کی یادگاروں کا بہترین استعمال کریں گے؟ اس کا جواب ہمیں چند گھنٹوں کے اندر دینا ہے۔

لاتعاون سلبی حضرات! میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی سرحد سے شروع کروں۔ ہم نے حصول مقصد کے لیے عام تشدد اور ترک تعاون کا اصول اختیار کیا ہے۔

نون کوآپریشن کی بنیاد دراصل دنیا کے اس سادہ، مگر عالمگیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے۔ اگر اس اصولی تعریف میں برائی کا لفظ نقصان سے بدل دیا جائے (اور میرے خیال میں دونوں کو مترادف ہی ہونا چاہیے) تو پھر یہ نوعِ انسانی کا نہ صرف عالمگیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رجحان ہو جاتا ہے اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کو "ترک موالات" کا حکم دیا ہے، جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمہارے لیے قومی نقصان ہے، تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ بنو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے۔

قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے، جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے، بلکہ متفقہ عمل ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کوآپریشن کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کر کے حاصل کیے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کشمکش ہے، کوآپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومتِ سلبی یا سول ڈس اوبیڈینس بھی جو اس کے سب سے زیادہ قومی

کار راز اسے معلوم نہ تھا۔

نون کوآپریشن کا پروگرام

ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نون کوآپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا، اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ تاہم بہت سی باتوں میں اس سے مختلف بھی ہو گیا ہے۔ پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا۔ اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں، جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ افکار و عقائد اور بہت سے تقاضہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف، ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا۔ لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو یا ایسی دشواری رکھتی ہو، جس کو ایک محدود وقت کے اندر نافذ نہیں لایا جا سکتا۔ عدم تشدد اس کی اصلی روح ہے۔ لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کر لیا جائے۔ ان تمام تعلقات کو ترک کر دینا جو ہندستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں، بلاشبہ اس کا اصل اصول ہے۔ لیکن اس کا دائرۂ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کر دیا ہے اور جس قدر رکھی ہے، اسے اس طرح عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار، ضبطِ نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصلی ہتھیار ہیں۔ تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے۔ اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور العمل بن گیا ہے، جو زیادہ سے زیادہ واضح، سادہ اور اس لیے عملی ہو سکتا ہے، اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلح فتحمندی کا یقین دلاتا ہے۔ ان میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے، بلکہ عمل کی بھی تمام دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے۔

جو قالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچے مسیحی معلم کاؤنٹ ٹالسٹائی نے اپنی شہرۂ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے اور اس قابلِ تعظیم کا دماغ دراصل مغربی تمدن کی بے روح مادیت، نظامہائے معاشرت کی بے حد ناہمواری سرمایہ داری (کیپیٹل ازم) کی بے روک بے اعتدالی، اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے برخلاف ایک انتہائی پروٹسٹ تھا اور اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریات کی نسبت ہمیں امریکہ کے گزشتہ پریزیڈنٹ روز ویلٹ کے نکتہ چین لفظوں میں جو اس نے ایک مرتبہ امریکن آؤٹ لک میں لکھے تھے، ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کر گئی ہیں"۔ تاہم اس کی تمام تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل تعلیم ہے جس کی سادہ عملیت بالکل آشکارا ہے اور وہ بلاشبہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتل انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں، ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے، جو انھوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں، تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ٹک نہیں سکتے۔

مہاتما گاندھی

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے۔ لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے، وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے، ہر آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے، واشنگٹن جیسے چند آدمیوں کو معلوم تھا۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا، لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے چن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہو گئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نون کوآپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت

جنگ کے میدان کے لیے اسے ایسے مناسب تصادم کی ضرورت ہے، جو اس کی سلبی (پازیٹو) قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہو جائے، اور جو بالآخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔

نون کو آپریشن کی ذہنیت (مینٹلٹی) یہاں سے یہ بات ضمناً واضح ہو گئی کہ نون کو آپریشن کی ذہنیت کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، وہ کس قدر دور از کار ہیں! کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے بر خلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جد و جہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا وعظ ہے۔ وہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدّم کی جگہ واپسی کی خواہش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے، جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔

دراصل تمدن، تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہندستان میں مغربی تہذیب و تمدّن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں۔ خود یورپ اور امریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب اُمنڈ آئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں۔ لیکن نون کو آپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے، نہ ترکِ دنیا اور زہد و عبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنی چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستور العمل ہے جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہے۔ اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیم گاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو، تو اس لیے نہیں کہ وہ یورپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس اقتدار کا مخالف ہے، جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہنو، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے اور نیز اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرزِ معیشت کی سادگی اور ضبطِ نفس کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

پروگرام کی نوعیت

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندستان کی موجودہ مسلح بیوروکریسی[29] کے مقابلہ میں غیر مسلح اور سلبی (نون وائیلنٹ) جدوجہد کے ذریعہ ایسی فتحمندی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ ہم نے "ہندستان کی مرضی" کو خلافت، پنجاب، اور سوراج سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان بہت سے لفظوں میں نہیں، بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی طرح ہندستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ در پیش ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کیا قوم کی مرضی کی نمایندہ اس ملک کے باشندوں کی آزاد حکومت ہوگی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو۔

یہ غیر مسلح جدوجہد کیونکر عمل میں لائی جائے؟ تو بلا شبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظامِ حکومت کی شرکتِ عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہو کر اسے اس طرح گرا دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ کے ناقابل ہو جائے۔ اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے، وہ مذہب، اخلاق، تجربہ اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ ہمیں اس ناانصافی کے لیے آلۂ عمل نہیں بننا چاہیے، جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔

شرکتِ عمل کی یہ علیحدگی اگر بیک وقت پوری طرح عمل میں آجائے، تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ سورج کے ایک طلوع و غروب کے اندر ہندستان کی تاریخ پلٹ جا سکتی ہے۔ لیکن کیونکر عمل میں آئے؟ اس آسانی کی ساری دشواری اسی سوال میں پنہاں ہے۔ اس جنگ میں، جو جنگ ہونے کے ساتھ کھلی جنگ نہیں ہے، اگر جنگ کی سی کوئی تیاری ہے، تو یہی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا معرکہ۔ جنگ کے سروسامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس اسپرٹ کی، جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔

اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت جائے۔

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمراں جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ خواہ کانگرس کا فیصلہ ہو، یا ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کی رائے ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے، لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہیے۔

حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کرسکا ہوں، وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر نہیں ہوسکتا جس طرح گزشتہ انتخاب کے موقع پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا، اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہم نشستوں پر قبضہ کرلیں۔ اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرزِ عمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں۔

میری ناچیز رائے میں ہمارا آیندہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے، دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں آل انڈیا کانگرس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو۔

ہندو مسلم اتحاد

حضرات! میں نے آپ کا اس قدر وقت دردِ دیوار کی نذر میں لے لیا، حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیر کی وہ پہلی بنیاد ہے، جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی بلکہ ہندستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں، محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتے۔ آج اگر ایک

تجربہ کی کامیابی

حضرات! میں بلا کسی تامّل کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے یقین میں پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، جو کسی ایسے پروگرام کے لیے ہوسکتی ہے۔ اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا، جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی، تو اب ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے، جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کردی ہے۔

قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں، بلکہ دل ودماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندوستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں کی استعداد دفعتہً بلند کردی۔ برّاعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچادیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کردیے۔ راہ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشا گاہ بن گئیں۔ غرضکہ آزادی کی جدوجہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک پر نہ کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں، تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہیے کہ پروگرام صحیح ہے، عملی ہے، اور اپنی تاثیر میں بے خطا ہے۔ نون کو آپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائے گا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے ایسی طاقت پیدا کرسکتا ہے، جو دفتری اقتدار کے لیے ناقابل تسخیر ہوگی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی وکامیابی کے لیے روک ہے، اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے۔ ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو۔ لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے، مگر اس کے خلاف قدم نہیں اٹھاسکتا اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو، جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریزی رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے، کٹ جائیں، لیکن

ہندوؤں سے بہت کم ہے، تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں، اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہوں گے، تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے۔

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اس سے واقف ہوں گے کہ ۱۹۱۲ء میں میری سب سے پہلی صدا تھی، جو اس طرز عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں، کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں، اور فرقہ وار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آ گیا، جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ میں جب ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بند تھا، تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔

جس طرح میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ میں حیرت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی، ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سنائے جا رہے ہیں۔ وہی اسباب و بواعث آج بھی ان کی زبان پر ہیں۔ مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ ان کی تعداد کم ہے۔ اور آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کر رہا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے، نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت

فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا، کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا، تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندوستان کے عشق و محبّت کا ایک ذرّہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہو اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکے۔ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزّت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ وہ ہماری آزادی کا انتظار کرے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش بر آواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے مجنونانہ کُشت و خون کی اس کے لیے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک، اس کی مدافعت اور سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملہ سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب ہندوستان کی حفاظت کا ولولہ کب قائم رہ سکتا ہے! ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات ابھارے جا رہے ہیں، دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندوستان کی سڑکوں پر بے دریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر، میرٹھ، سہارنپور، آگرہ، پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہو چکے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوسناک ہوں گے۔

فرقہ وار تنظیم

حضرات! ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بہ حیثیت ایک قوم کے کانگریس کی سیاسی حرکت میں شریک نہ تھے۔ مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندوستان میں ان کی تعداد

کانگریس ایڈریس

رام گڑھ ۔ ۱۹۴۰

"ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے
ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے ۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا
کرتے ہیں ۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ۔"

ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگرس" ہے۔

ان تحریکات کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سنا دیتے ہیں ان حضرات سے کہوں گا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اب فطرتِ انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجیے۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو۔ مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں۔

اسی طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت یہی عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وار کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے ہیں، لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندستان میں ایک طرف سے ملیچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی، تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے، جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

ہندستان کا میثاقِ ملی حضرات! اس سلسلے میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجیے کہ اب ہمیں اس باب میں تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندستان کے لیے ایک ایسا میثاقِ قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روزمرہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔

خاتمہ قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں۔ آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی ہمارے حصے میں آسکتی ہے۔ ہمارے عزم، ہمارے ثبات اور حب الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ آیئے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

نزدیک کر دیا ہے، وہیں طرح طرح کی نئی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے، جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزّت ہے، اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزّت کے لیے شکر گزار ہوں، اور ذمّہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیے۔ ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین القومی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کرکے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور اُس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا، جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعے ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس*

نمائندگانِ قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کُن وقت میں جیسا کہ آج درپیش ہے، آپ حضرات حالات کے تقاضے سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوانِ قومی میں جمع ہوں، اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں، یہ وقت کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی نظیر موجود نہیں تو میں سمجھتا ہوں یہ ایسی بات ہوگی، جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کر رہا ہے تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوئے تھے، تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا۔ لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایام کی جھلک پائی جاتی ہے، جن میں قوموں کی جنگ کی فیصلہ کُن دشواریوں سے گزرنا پڑا ہے اس دن آپ جنگ کے آغاز کے لیے فکرمند تھے۔ آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی۔ آج گمراہی کا خطرہ پیش آگیا ہے اس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے مضطرب تھے، لیکن آج زندۂ جاوید حافظ کے لفظوں میں "کشتی ایک کنارہ سے چل چکی ہے مگر دوسرا کنارہ ابھی دور ہے اور موجیں گھیرا ڈال رہی ہیں"۔ حضرات! جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، تو مجھے آپ کی جانب سے عزت اور اعتماد کا

---

* ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ میں مولانا نے کانگرس کے ایک خصوصی اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس سال تھی، کانگرس کے سب سے نوعمر صدر تھے۔ اس زمانے میں ہندو مسلم اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ مولانا نے اپنی اس تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

رہیں۔ اور لڑائی کی تجویزوں کے نام سے مشہور رہیں۔

کانگرس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہوگئی۔

اب میں اس موقع پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا، اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑکر دیکھیے، پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے؟

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا، اور حسبِ معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگرس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا، اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرلے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں، اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جاسکتا ہے، قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کرچکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں، اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (Mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی Diplomacy ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی۔ کہ اس موقع پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے، اور ہندستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا! تبدیلی کی کوئی ذراسی پرچھائیں بھی اُس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک

سب سے پہلی بات، جسے ہیں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے، ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے، ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں، بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے، اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے ہیں ابھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت ہیں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے، کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے یہی احساس تھا، جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ ہیں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازی ازم کی جوار تجاعی (Reactionary) ری اکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں، ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کا دل اور دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے، جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت ہیں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

وہ نازی ازم اور فیشزم سے بیزار ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں، کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے۔ اور ہندوستان کسی حال ہیں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی، جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگرس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی

کرنی چاہیے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں، جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا، دُنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورت حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِ فعل REACTION شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نا تسزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت دنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی، جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی، تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی، دوسری ارتجاعی (REACTIONARY) قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فیشسٹ اٹلی اور نا تسی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی نا قابل برداشت تھی، اور جو اسے برطانی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی، تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نا تسی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینیا، اسپین، آسٹریا، چیکوسلاواکیا، اور البانیا کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے، اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے، انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا، اور نا تسی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا، تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہو گئی۔ اسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اترتی، تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے نا قابل برداشت ہو جاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہوریت، آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی، اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔

اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصّہ رہا ہے، اُس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمایندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقع دے دیا جائے، جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمایش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقع پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقع دیا گیا تھا کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا، اور اُس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا مسٹر ڈی ویلیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک السٹر (Ulster) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے!

لیکن برطانوی نو آبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد، مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نو آبادیوں (Dominions) کا درجہ (Status) ملنے والا ہے، اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح، کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک ڈھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہُوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں

مطالبے کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبے کو مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا، تو مجھے یقین ہے، میں آنے والے مورخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (REASON) کا ایک سادہ مگر ناقابل رد نوشتہ (DOCUMENTS) ہے، جس کو صرف مسلّح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی، لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی، یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی۔ اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی، تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ (SELF-DETRMINATION) ہتھیاروں کی حد بندی، بین القومی (INTER-NATIONAL) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں سلگائی گئیں مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی! ہر جلوہ خواب وخیال ثابت ہوا! آج پھر قوموں کے گلّوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (REASON) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگریس کا پہلا قدم

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں

۳ ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (REACTIONARY) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں، ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیے!

کانگریس کا مطالبہ

۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی، تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگریس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلانِ جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کی جاسکتی تھی، اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی، جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے، اپنے کانوں کو بند کر لیا اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا، جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے، کہ اس صورتِ حال میں اس کے لیے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا، بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جارہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (TRAGEDY) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے، اور یہ واقعی اس لیے لڑی جارہی ہے کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (ORDER) سے دنیا کو آشنا کیا جائے، تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس

اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے، جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۶ر فروری کو شائع کیا، اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندستان جلد سے جلد وقت میں جو صورتِ حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نو آبادیوں کا درجہ حاصل کرلے، اور درمیانی زمانے کی مدّت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور یہ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے، اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندستان کے لیے خود اختیاری فیصلے (SELF-DETERMINATION) کا حق تسلیم نہیں کرسکتی۔ حقیقت کی ایک چھوت (TOUCH) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہوگیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جونہی ہندستان نے یہ سوال اٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہوکر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے مگر اس کا داؤ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جاسکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ر فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کردی ہے، اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:

> "ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آیندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت

کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لیے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومتِ ہند کے سرکاری علم ادب (OFFICIAL LITERATURE) کے الجھے ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی حالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے، صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی، اس قدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے، جو صرف یورپ کے امن اور بین القومی (INTERNATIONAL) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ جہاں تک ہندستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا، اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کر سکتا، اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامّل کر دینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اُس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے۔

"ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرلے۔ کمیٹی کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں۔"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا

بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے، تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے، ہمارے لیے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں، جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتمندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں، جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلانِ جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں، اس کا رخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اب اسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے لبوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (CO--OPERATION) کا جو قدم ۱۹۲۱ء میں اٹھایا تھا، ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رخ ترکِ تعاون (NON-CO-OPERATION) کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں، جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رخ کی طرف آگے بڑھیں، یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے، تو وہ رک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں، جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اُس عام ذہنیت کی ترجمانی کررہا ہے، جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا، اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جاسکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں، اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنہیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے؛ اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو، نوآبادیات (DOMINION STATUS) کا درجہ حاصل کرلے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہش مند ہے مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے، صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ سوال

کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے!

وقت کی ساری پھیلی ہوا اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں، بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (CABINET) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے، برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن اور انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعووں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلانِ جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے، اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جب کہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (REACTIONARY) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ و بالا کر دیے، اور انصاف اور معقولیت (REASON) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ ابھار رہی ہے، وہیں امید کا ایک دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم (ORDER) کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا، اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر اُبھر رہی ہے، اور اس طرح اُبھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا، آیندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں، معقولیت اور انصاف کے دور

ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہوچکا، یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشے میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا، اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے کہ ختم ہوگیا، اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے، اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے، اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے۔ کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پروا رہ کر اٹھے گا، یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہییں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے، وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے، وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اوّل دن سے دعوا رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگریس نے یہ دعوا کرکے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے، اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے، اور کانگریس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو

سوال اٹھایا جاسکے گا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں، جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جاسکتیں، جہاں تک کانگرس کے قدم پہنچ گئے ہیں، اور براہ راست اقدامِ عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کرلیا ہے متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے۔ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرأت کرسکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے نادر مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہش مند نہ ہوں، وقت کی عام آب وہوا کے تقاضہ سے بے بس ہورہی ہیں اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزلِ مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھادیے۔ وہیں اس گوشے کو بھی بے نقاب کردیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ، دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کردی جائے۔ باربار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہورہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے، اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے، تو یہ ہندستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا، اور ہمارے لیے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اُس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہوسکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی

بھی ایسی خامی رہ گئی ہے، جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگرس اپنے ادائے فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا، جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا، اس کا مضبوط اور سطے کیا ہوا طرز عمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوائنٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمایندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمایندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے، فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی، خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے، تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے، جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے، تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں، اور پوری کوشش کر چکی ہے، اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے، تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات

سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت، اس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا، جس سے زیادہ قابلِ اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا، اور اگر بتلایا جاسکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا۔

ا۔ ہندوستان کا جو دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں۔ نہ کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے، نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی

بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق ومفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چُنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا، تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے، جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے، اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند، لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹیننٹ گورنر مغربی وشمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے

رہ گئی ہے جو برطانوی مدبّروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے، تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کرکے ہمیں اس کا موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کرلیں؟

ہم میں تفرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہییں۔ یہ صورتِ حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کردی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں، جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے، جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے، اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لاسکتی ہے، جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کردیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں، جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزرچکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں، تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات

تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی، لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں، جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے، تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں، تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے۔

ہندوستان کا آیندہ دستورِ اساسی (CONSTITUTION) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اس کی ایک بات سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (FEDERATION) کا جمہوری دستور ہوگا، جس کے تمام حلقے UNITS اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے، اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے، جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے، ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟

ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے، تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے، جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (QUANTITY) کے ساتھ نوعیت (KIND) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے، ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے، دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطہ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (FACTORS) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد

شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے، لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے، تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی اُبھاؤ، حالات کا کوئی اُتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے!

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے۔ ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں، اور گو تیرنا چاہتے ہیں، مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود جانا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!

مسلمانِ ہند کے لیے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے، اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمّت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آیندہ کا کوئی وعدہ، دستورِ اساسی کا کوئی تحفّظ، ہمارے

ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور یہ میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTORS) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدّت سے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، ان میں سے کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے صرف گزرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں، میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے، ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کر لیں، وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متحدہ قومیت

میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان

میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں، اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اُس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیّل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (REVIVAL) کی مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں، یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے، اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

خاتمہ

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم

کے مخفی ہاتھوں نے، پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سر زمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے، جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے، اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں

مہاتما گاندھی کی سالگرہ پر

(آل انڈیا ریڈیو دہلی)

"پنجاب میں پانچ دریا پانی کے ہزاروں برس سے بہہ رہے تھے اب ایک چھٹا دریا انسان کے گرم گرم خون کا بھی بہنے لگا ہے۔ پانی کے دریاؤں پر ہم نے اینٹ پتھر اور لوہے کے پل بنائے تھے، اس چھٹے دریا کا پل اب انسانوں کی لاشوں سے چُنا جا رہا ہے۔"

کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجیئے۔ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارو مدار تین چیزوں پر ہے: اتحاد، ڈسپلن (DISCIPLINE) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے، جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا، اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمایش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

دنیا میں ہندوستان کی قومی جاگرتی کا شور مچ گیا۔ کیا کیا نقشے نہیں ہیں جو ہم نے آزاد ہندوستان کے نہیں بنائے کیا کیا خواب نہیں ہیں جو ہم نے قومی زندگی کی نئی اٹھانوں کے نہیں دیکھے آج وہ سب کہاں ہیں کیا ہمارے دماغ کے کسی کونے میں بھی ان کی پرچھائیں باقی رہی کیا ان کی بو باس بھی کوئی بدبخت آب و ہوا میں سونگھ سکتا ہے۔ ہماری آزادی کے مخالفوں نے ہمیشہ کہا تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ پاؤں جب تک غلامیوں کے بندھنوں سے بندھے ہوئے ہیں، اسی وقت تک امن چین ہے جہاں یہ بندھن ٹوٹے اور انھوں نے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنا شروع کردیں خدا کے لیے مجھے بتلاؤ اگر اس صورت حال کو فوراً نہ ختم کر سکے تو نتیجہ اس کا کیا نکلے گا۔ کیا یہی نہیں نکلے گا کہ ہندوستان کی آزادی کے مخالفوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا۔ آج آزاد ہندوستان کو زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آگیا وہ ایک بڑی گہری خندق کے کنارے کھڑا ہے اس کی قسمت اُدھر میں جھول رہی ہے یا تو اسے خندق میں گرنا ہے یا چھلانگ مار کر صحیح سلامت پار اتر جانا ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کو اس خطرہ سے سلامت نکال لے جائیں تو ہمیں چاہیے کہ پہلے ٹھیک طور پر سمجھ لیں کہ خطرہ کیا ہے اور پھر اس سے ملک کو بچانے کی تدبیر کریں خطرہ جو ہمیں آج پیش آگیا ہے۔ ملک کی بدامنی اور بدنظمی کا خطرہ ہے۔ ملک کی آزاد حکومت کی عمر ابھی دو مہینے کی بھی نہیں ہوئی ہے اور وہ دیکھنے لگی ہے کہ بدامنی اور بدنظمی کا خطرہ آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا ہے۔ ہمت اور ملک کی پوری قوت کے ساتھ یہ خطرہ نہیں دبایا گیا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ معاملہ کہاں جاکر تھم سکے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ پنجاب کے دونوں حصوں میں بدامنی کا سیلاب اٹھا اور دونوں جگہوں کی حکومتیں اسے روک نہ سکیں۔ سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ کرنا چاہیے کہ حکومت کی ساری قوت خرچ کرکے پنجاب کی اور زیادہ بربادیاں روکی جائیں اور ساتھ ہی تمام ملک میں امن اور انتظام بھی قائم رکھا جائے۔ یا یہ کرنا چاہیے کہ پنجاب کو اور زیادہ بربادیوں کے چھوڑ دیا جائے اور باقی تمام ملک کا امن اور انتظام بھی غارت کیا جائے۔ مجھے یقین ہے آپ میں کوئی شخص ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرسکے گا کہ پہلے طریقے کے سوا نجات کا کوئی دوسرا طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ ایسا یقین کرتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس کام کے لیے اپنی ساری قوتوں کو لگا دیجیے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس نے پوری قوت کے ساتھ فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی حال میں

گاندھی جی کی سالگرہ پر*

آج مہاتما گاندھی کی ۷۸ ویں سال گرہ کا دن ہے۔ آج ان کی عمر ۷۸ برس کی ہوگئی اس ۷۸ برس میں سے ان کی زندگی کے پورے پچاس برس امن انسانیت اور انسانی حقوق کی خدمت اور پرچار میں بسر ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت میں گاندھی جی کی سال گرہ نہیں ہے امن اور انسانیت کے مقصد کی سال گرہ ہے لیکن آج جب کہ ہم امن انسانیت کی یہ سال گرہ منا رہے ہیں ہمارے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ خود امن اور انسانیت کی جانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ جس ہندوستان نے دنیا کو امن اور انسانیت کا یہ سب سے بڑا انسان دیا ہے خود اسی ہندوستان میں امن کو کس طرح خاک و خون میں ملایا جا رہا ہے۔ پنجاب میں پانچ دریا پانی کے ہزاروں برس سے بہ رہے تھے اب ایک چھٹا دریا انسان کے گرم گرم خون کا بھی بہنے لگا ہے۔ پانی کے دریاؤں پر ہم نے اینٹ پتھر اور لوہے کے پل بنائے تھے اس چھٹے دریا کا پل اب انسانوں کی لاشوں سے چنا جا رہا ہے آج سے چھ سو برس پہلے جب تاتاریوں نے ملتان پر حملہ کیا تھا تو امیر خسرو نے کہا تھا "پنجاب بدیگر اندر ملک درآمد بدید" یعنی ملتان میں پانی کے پانچ دریاؤں کے ساتھ خون کے بھی پانچ دریا بہنے لگ گئے۔ اس وقت شاید یہ مبالغہ تھا مگر آج یہ حقیقت ہے۔ آج پوروی پنجاب میں مسلمان کے لیے امن نہیں رہا اسی طرح پچھمی پنجاب میں کسی ہندو اور سکھ کے لیے امن نہیں ہے اسی دلی میں جس کی ایک عمارت کے اندر بیٹھا ہوا میں آپ کے کانوں تک اپنی یہ آواز پہنچا رہا ہوں۔ دو ہفتے تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کی یاد ہر غیرت مند ہندوستانی کے دل کو زخموں سے چور کر دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اچانک کیا سے کیا ہو گئے اور اب ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم اپنے ملک کی آزادی کے لیے رو رہے تھے اور تمام

---

* ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ کو مولانا نے مہاتما گاندھی کی اٹھہترویں سال گرہ کے موقع پر یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی تھی۔ یہ تقریر پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔

دہلی کے مسلمانوں سے خطاب

جامع مسجد دہلی

"یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔"

بھی بدامنی اور بدنظمی کو برداشت نہیں کرے گی اور ہر فتنہ کو جو سر اٹھائے گا آہنی ہاتھوں سے ملیا میٹ کرے گی۔
آپ کو بھی چاہیے کہ اس کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ہر طرح کی بدامنی اور بدنظمی کو روکیں۔
آپ اپنا یہ فرض کیونکر ادا کر سکتے ہیں اس کی تفصیل میں، میں نہیں جاؤں گا اگر آپ دل کی سچی لگن کے ساتھ تیار ہو گئے ہیں تو آپ کو بتلانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کو ملک کی یہ خدمت کیونکر انجام دینی چاہیے۔

جے ہند

نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا، وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویّہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی۔ اور یہی وہ انقلاب ہے، جس کی ایک کروٹ نے تمہیں

دہلی کے مسلمانوں سے خطاب*

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتّٰی کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی

★ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا نے دہلی کے مسلمانوں کو اس وقت خطاب کیا تھا، جب وہ بے گھر بے در تھے اور اپنی قومی اور سیاسی شناخت کھو جانے سے خائف تھے۔ مولانا نے اپنی اس تقریر میں مسلمانوں کو اس پر ملامت کی تھی کہ وہ اپنے اجداد کی سرزمین کو چھوڑ کر ایک عجیب و غریب ریاست پاکستان کو اپنے لیے انتخاب کر رہے ہیں۔

کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا۔ اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے، اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم" ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔

بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں تمہاری بے قراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا!

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے میں نے اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو۔ اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دودھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو اپنے دلوں

خلاصہ

آزادی کے بعد

۱۹۴۷ سے ۱۹۵۸ تک

ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں۔ وہ تمہارا ہی قافلہ تھا، انہیں بھلاؤ نہیں۔ انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو۔ اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں، تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں، تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے، آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے وہی پرانا نسخہ ہے، جو برسوں پہلے کا ہے وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ: لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

آج کی صحبت ختم ہوگئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تعلیم اور مذہب

"ہماری آج کل کی مصیبتیں یورپ کی طرح مادّہ پرستی کے پاگلوں نے نہیں پیدا کیں بلکہ مذہب کے پاگلوں نے پیدا کی ہیں، اگر ہم اس حالت سے اپنے ملک کو نکالنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں ہو سکتا کہ مذہبی تعلیم کو آج کل کی حالت کے رحم پر چھوڑ دیں۔ ہمیں چاہیے کہ پوری طرح اسے اپنی دیکھ بھال کے اندر لیں اور اچھی قسم کی اور سچّی مذہبی تعلیم دلائیں۔ اس طرح ہم اس کی روک تھام کر دیں گے کہ مذہب اپنے غلط روپ میں آکر بچوں کے دماغوں کو پہلے دن سے بگاڑ دینے کا موقع نہ پائے۔"

گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہو، لیکن اس حقیقت کی پرچھائیں سے وہ اپنے دماغ کو نہیں بچا سکتا تھا کہ ایک قومی حکومت کے بے روک ارادے اسے سہارا دینے کے لیے موجود نہیں ہیں۔ اسے پوری طرح پھیلنے کی خواہش رکھنے پر بھی اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ سمٹا اور سکڑا ہوا رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن اب وہ حالت باقی نہیں رہی آپ جس قوم کی تعلیم کے مسئلوں پر سوچ وچار کرنا چاہتے ہیں، اسی کی قومی حکومت اپنے بے روک ارادوں اور بے بندھن قدموں کے ساتھ آپ کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے وہ آپ سے توقع رکھتی ہے کہ مقصد کی سرگرمی اور دھیان کی گہرائی کا جو کانٹا اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ آپ اپنے تمام مشوروں کو بھی اسی طرح کے کانٹے سے تولتے ہوئے پیش کریں گے۔

لیکن اگر آج ہم نئے ارادوں اور نئی سرگرمیوں کے ساتھ نئے قدم اٹھانا چاہتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ اس بورڈ کی پچھلی خدمتوں کی قدر و قیمت کا ہمیں پورا احساس نہیں ہے۔ اس بورڈ نے پچھلے تیرہ برسوں کے اندر اپنا فرض جس سرگرمی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا ہے، اس کا ریکارڈ اس کی رپورٹوں کے ہزاروں صفحوں کے اندر پھیلا ہوا ہے اور ملک کی آج کل کی تعلیمی سرگرمی اس کی گواہی دے رہی ہے۔ غالباً اس کی تاریخ کی سب سے زیادہ قیمتی خدمت وہ سمجھی جائے گی جو اس نے ۴۴ء میں پبلک ایجوکیشن کی نئی اسکیم تیار کر کے انجام دی۔ برٹش انڈیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کی بنیادی تعلیم کے سوال کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی اور ایک ایسا نقشہ بنایا گیا جس میں دھیان کا پھیلاؤ اور کام کی جرأت، دونوں کو ہم موجود پاتے ہیں حالانکہ یہی دو چیزیں ہیں جو یہاں بہت کم ملا کرتی تھیں۔ اس نقشہ کے بنانے میں ہمارے سابق اڈوائزر سر جان سارجنٹ نے جو بڑا حصہ لیا تھا، اس کی وجہ سے ان کا نام بجا طور پر اس کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ ابھی ہمارے ملک میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے اگرچہ اس وقت وہ باہر گئے ہوئے ہیں اور اس لیے اس اجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ اس اسکیم کو کس طرح وقت کی اس بدلی ہوئی حالت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے؟ اور کیونکر ان رکاوٹوں کو جلد سے جلد دور کیا جا سکتا ہے۔ جو اس کا راستہ

تعلیم اور مذہب*

دوستو!

سینٹرل اڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے اس چودھویں اجلاس میں میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں میں نے اسے "چودھواں" اجلاس کہا کیونکہ اس سے پہلے بورڈ کے تیرہ جلسے ہو چکے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں، زیادہ ٹھیک بات یہ ہوگی کہ ہم اسے اپنی قسم کا پہلا اجلاس کہیں۔ اس بورڈ کے تیرہ جلسے جس ہندوستان میں ہوئے تھے، وہ ۱۵ اگست ۴۷ء میں ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ تاریخ کی ایک بہت بڑی کہانی بھی ختم ہو گئی۔ آج ہم ایک نئے ہندوستان میں اکٹھے ہوئے ہیں، جسے اب اپنی نئی تاریخ بنانی ہے، اور جس کی نئی بننے والی تاریخ کا ایک ورق ہم آج الٹ رہے ہیں۔

مجھے امید ہے آپ اسے بے موقع محل خیال نہیں کریں گے اگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ صورتِ حال کی اس تبدیلی نے اس کام کے ڈھنگ اور مزاج کو بھی بہت کچھ بدل دیا ہے جسے انجام دینے کے لیے آپ یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس بورڈ نے آج تک تعلیم کے مسئلوں کو جن ترازوؤں میں تولا تھا، وہ آپ کے لیے پرانے ہو گئے۔ اب آپ کو نئے ترازو بنانے پڑیں گے اور نئے بٹّوں سے ان کا وزن تولنا پڑے گا۔ اب آپ وقت کے قومی مسئلوں کی لمبائی چوڑائی ان فیتوں سے نہیں ناپ سکتے جو کل تک آپ کو ہر طرح کی نپائی کا کام دیتے رہے ہیں۔ نئے ہندوستان کی نئی مانگوں کا جواب دینے کے لیے آپ کو نئے دماغوں اور نئے اوزاروں کی ضرورت ہوگی۔

اس بورڈ نے اس وقت تک قومی تعلیم کے سوال کو کتنا ہی دھیان کے پھیلاؤ اور آنکھ کی

---

* صدارتی خطبہ جو ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو نئی دہلی میں سینٹرل اڈوائزری بورڈ کے چوتھے سیشن میں دیا گیا

سے زیادہ مذہب والے بن جاتے ہیں۔ ہماری آج کل کی مصیبتیں یورپ کی طرح مادہ پرستی کے پاگلوں نے نہیں پیدا کیں، بلکہ مذہب کے پاگلوں نے پیدا کی ہیں۔ اگر ہم اس حالت سے اپنے ملک کو نکالنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں ہو سکتا کہ مذہبی تعلیم کو آج کل کی حالت کے رحم پر چھوڑ دیں۔ ہمیں چاہیے کہ پوری طرح اسے اپنی دیکھ بھال کے اندر لیں، اور اچھی قسم کی اور سچی مذہبی تعلیم دلائیں۔ اس طرح ہم اس کی روک تھام کر دیں گے کہ اپنے غلط روپ میں آ کر بچوں کے دماغوں کو پہلے دن سے بگاڑ دینے کا موقع نہ پائے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ اپنے بچوں کو مذہب کے لگاؤ سے الگ رکھیں، اور میں سمجھتا ہوں خود آپ کی بھی یہ خواہش نہ ہوگی پھر اگر حکومت اپنی تعلیم کے نقشہ میں مذہبی تعلیم کے لیے جگہ نہیں نکالنا چاہتی تو سوچنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ لوگ اپنے پرائیویٹ ذریعوں سے بچوں کو ابتدائی مذہبی تعلیم دلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ پرائیویٹ ذریعے آج کل جس طرح کے ہو سکتے ہیں، اس کا حال آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں واقفیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف دیہاتوں میں بلکہ شہروں میں بھی بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا کام جن استادوں کے ہاتھوں میں آتا ہے، وہ عام طور پر آدھے پڑھے ہوئے جاہل آدمی ہوتے ہیں اور مذہب کو صرف اس کی بگڑی ہوئی اور تنگ خیالی کی صورت ہی میں پہچانتے ہیں ان کی پڑھائی کا ڈھنگ بھی ایسا ہوتا ہے جس میں دماغ کے کھلنے اور دھیان کے روشن ہونے کی بہت کم جگہ نکل سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ہاتھوں سے جن بچوں کے دماغ کا سب سے پہلا سانچا ڈھلے گا، انھیں آگے چل کر کتنا ہی تعلیم کے نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے لیکن وہ اپنے پلاسٹک سانچے کے اثر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی دماغی زندگی کو اس خرابی سے بچائیں، تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ابتدائی مذہبی تعلیم کو لوگوں کے پرائیویٹ ذریعوں کے رحم پر نہ چھوڑ دیں۔ خود اپنی دیکھ بھال کے ساتھ اس کا انتظام کریں۔ ایک باہر کی حکومت کو بلاشبہ یہی بات سجتی تھی کہ وہ مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے اپنے کو الگ رکھے۔ لیکن ایک قومی حکومت اس ذمہ داری سے الگ نہیں رہ سکتی۔ اس کا فرض ہے کہ ملک کا قومی دماغ ڈھالنے کے لیے ایک ٹھیک سانچا بنائے۔ لیکن ہندوستان میں مذہب کو

روکے ہوئے ہیں، لیکن میں یہ سوال یہاں نہیں چھیڑوں گا۔ ایک ایجوکیشنل کانفرنس جو اس طرح کے سوالوں پر سوچ وچار کرنے کے لیے بلائی گئی ہے، تین دن کے بعد اسی ہال میں شروع ہوگی اور مجھے موقع ملے گا کہ وہاں تفصیل کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کروں۔

لیکن اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک خاص پہلو ہے جس پر میں آپ کو توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا بیسک ایجوکیشن کے سلسلہ میں مذہبی تعلیم کا سوال پیدا ہوا تھا اور بورڈ کی دو کمیٹیوں نے اس پر سوچ وچار کیا تھا، لیکن یہ کمیٹیاں کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وقت کی اس بدلی ہوئی حالت میں پھر نئے سرے سے اس سوال پر غور کیا جائے۔ کیونکہ ہمارے ملک کے لیے یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی تعلیم کے بارے میں انیسویں صدی کا جو لبرل نقطۂ خیال تھا، اب عام طور پر اپنا وزن کھو چکا ہے۔ پہلی بڑی لڑائی کے بعد سے ہی ایک دوسرا نقطۂ خیال بننا شروع ہو گیا تھا جسے دوسری لڑائی کے انقلابی نتیجوں نے پوری طرح ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ قومی تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ملانا بچوں کے بے روک عقلی ابھار کو نقصان پہنچائے گا۔ اب مان لیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ قومی تعلیم اگر اس چیز سے خالی رہے گی تو نہ تو سچی اخلاقی روح پیدا ہو سکے گی، نہ انسانیت کا سانچا ٹھیک طرح ڈھالا جا سکے گا۔ چنانچہ روس کو عین لڑائی کے زمانے میں جس طرح اپنے پچھلے فیصلے بدلنے پڑے، اس کی کہانی آپ سن چکے ہیں اور ۱۹۴۴ء میں انگلینڈ کی حکومت کو اپنے تعلیمی نقشہ میں جو ترمیم کرنی پڑی اس کا حال بھی آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، معاملہ بالکل ایک دوسرے روپ میں ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں مذہبی تعلیم کی ضرورت کا نیا احساس اس لیے پیدا ہوا کہ لوگوں نے دیکھا، مذہب کی تعلیم کو اگر الگ رکھا جاتا ہے، تو لوگ ضرورت سے زیادہ عقل والے بن جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں مذہب کا اثر جس طرح کام کر رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہمارے سامنے یہ خطرہ نہیں ہے بلکہ ایک دوسرا خطرہ پیش آگیا ہے۔ ہمیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ لوگ ضرورت سے زیادہ عقل والے بن جائیں گے، ہمیں اس خطرہ نے گھیر لیا ہے کہ لوگ ضرورت

بڑا فائدہ ہے کہ اگر غیر ملکی زبان کو ذریعہ بنانے کا بنیادی نقصان میرے سامنے نہ ہوتا تو میرا دماغ اس طرف جھکنے لگتا کہ اب انگریزی زبان کو اس کی تعلیمی جگہ سے ہٹانا بہتر نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس رائے کی طرف بڑھنے سے اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے میں آپ سے ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔ اگر کل تک ایک مدراسی، ایک بنگالی، ایک پنجابی کو اس میں کوئی کٹھنائی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی مادری زبان رکھتے ہوئے بھی ایک اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم پائے تو اب یہ بات کیوں اس کے لیے کٹھن ہو جائے کہ خود اپنے دیس کی ایک بھاشا کے ذریعہ تعلیم حاصل کرے؟ اگر ہم انگریزی کی جگہ ہندوستانی زبان کو تمام ملک کے لیے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ٹھہرا سکتے ہیں، تو انگریزی کی وجہ سے جو دماغی اکتائی ملک میں پیدا ہو گئی ہے وہ بدستور قائم رہے گی۔ لیکن اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے، تو پھر ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ لیکن میں یہ کہنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا کہ اس سے ہماری دماغی اکتائی کی مضبوطی کو ٹھیس ضرور لگے گی

یہ دوسرا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمام صوبے اپنے اپنے حلقوں کی زبانیں اختیار کر لیں اور اس کے ساتھ ہندوستانی زبان کی تعلیم کو بھی بطور ایک بیچ کی زبان کے اور بطور ایک انٹر پراونشیل زبان کے ضروری ٹھہرا دیں۔ میں چاہتا ہوں اس مسئلہ پر بھی آپ نئے سرے سے غور و فکر کریں، اور اپنی ایک صاف رائے قائم کریں۔

دوستو! ایک بھاری ایجنڈا آپ کے انتظار میں ہے۔ میں اب اور زیادہ بوجھ آپ کے وقت پر نہیں ڈالوں گا۔ میں پھر ایک مرتبہ آپ کا سواگت کرتا ہوں اور اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

چھوڑکر ہم کوئی ایسا سانچا نہیں بنا سکتے۔

اگر مذہبی تعلیم کے لیے بیسک ایجوکیشن میں جگہ رکھی جائے تو اس کی مقدار کیا ہو؟ اور اس کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ بلاشبہ ان سوالوں پر بہت زیادہ سوچ وچار کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں کچھ کٹھنائیاں بھی ہیں جن کے دور کرنے کا راستہ ہمیں ڈھونڈھنا ہے، لیکن میرے لیے ابھی ان تفصیل کی باتوں میں جانا ضروری نہیں۔ اگر اصلی سوال طے کر دیا جائے تو پھر تفصیل کی باتوں پر غور کر کے ایک نقشہ بنایا جا سکتا ہے۔ بہرحال میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس سوال پر نئے سرے سے سوچ وچار کرنے کے لیے اب ایک کمیٹی بنا دیں اور اسے اختیار دیں کہ اپنی سفارشیں براہ راست گورنمنٹ کو بھیج دے۔

ایک اور معاملہ پر آپ کو اپنی آخری رائے اب قائم کر لینی ہے، یہ ہے کہ آئندہ ہماری اونچے درجہ کی تعلیم کا ذریعہ کون سی بھاشا ہو؟ میں سمجھتا ہوں، اس بارے میں دو باتیں ایسی ہیں جن سے آپ ضرور اتفاق کریں گے۔ ایک یہ کہ آئندہ انگریزی بھاشا تعلیم کا ذریعہ نہیں رہ سکتی۔ دوسری یہ کہ جو تبدیلی بھی اس بارے میں کی جائے، وہ اچانک نہ کر دی جائے۔ دھیرے دھیرے اور درجہ بدرجہ کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ جہاں تک اونچے درجہ کی تعلیم کا تعلق ہے ہمیں ابھی پانچ برس تک اسٹیٹس کو قائم رکھنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ آئندہ تبدیلی کی تیاریوں کا کام بھی شروع کر دینا چاہیے تاکہ اس مدت کے بعد ہم تعلیم کی تمام شاخوں کی پڑھائی کا کام اپنی ملکی زبان کے ذریعہ کر سکیں یہ میں چاہتا ہوں، اس بارے میں بھی آپ غور وفکر کے بعد اپنا مشورہ حکومت کو دے دیں۔

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ انگریزی کی جگہ کوئی ایک زبان اختیار کی جائے یا ایک سے زیادہ؟ یعنی ملک میں یونیورسٹی کی تعلیم کی زبان ایک رہے، یا ہر صوبہ اپنی اپنی مقامی زبان کو اختیار کرلے؟ انگریزی زبان ہمارے لیے ایک باہر کی زبان تھی۔ اسے پڑھائی کا ذریعہ بنانے سے ہمیں کئی طرح کے نقصان پہنچے۔ لیکن ساتھ ہی ایک بہت بڑا فائدہ بھی پہنچا، یعنی ملک کے تمام پڑھے لکھے آدمیوں کے دھیان گیان کی ایک زبان ہوگئی اور اس نے تمام ملک کو اکتائی کی ایک ڈوری میں باندھ دیا۔ یہ فائدہ اتنا

علی گڑھ اور قوم پرستی

"ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کا تعلیمی نظام بھی سیکولر ہی ہونا چاہیے۔ اس کو ملک کے تمام شہریوں کے لیے بغیر کسی تفریق کے یکساں تعلیم فراہم کرنا چاہیے۔"

سر سید احمد خاں سے سیاسی قیادت میں سنگین اور فاش غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ میں کو انیسویں صدی کی عظیم شخصیتوں میں سمجھتا تھا اور آج بھی سمجھتا ہوں لیکن ان کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے ساتھ میں سیاست کے میدان میں مسلمانوں کی غلط قیادت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکا۔

اس بات کو چھتیس سال گزر چکے ہیں لیکن میں جب بھی اس زمانے کے واقعات پر غور کرتا ہوں تو اس مسئلے پر نظرثانی کرنے کا آج بھی مجھے کوئی جواز نہیں ملتا اس وقت بھی میرا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ سرسید تعلیمی اور سماجی عظیم مصلح تھے لیکن سیاست میں ان کی غلط قیادت نے بہت سی خرابیاں پیدا کیں اور جس سے نہیں بہت نقصان پہنچا ہے لیکن آج یہاں میرا مقصد ان کے سیاسی رول پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ تعلیمی مصلح سر سید احمد خاں کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی جدید تعلیم کی بنیاد رکھی۔

مغربی تعلیم آج ہماری قومی زندگی کا جز بن چکی ہے ہم "تعلیم" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں لیکن ہم آج اس مخالفت کا اندازہ نہیں کر سکتے جس کا سامنا ان مصلحین کو کرنا پڑا اور جنھوں نے جدو جہد کر کے ملک میں مغربی تعلیم رائج کی۔ انھوں نے نئی راہ تلاش کی ہر قدم پر رکاوٹوں اور مشکلات سے نبرد آزما ہوئے ان لوگوں نے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا جن سے ہر اصلاحی تحریک کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مدتوں سے تعصبات اور توہمات کے بادل لوگوں کے ذہنوں پر محیط تھے، مروجہ عقائد اور صدیوں کی قدامت پرستی اس تبدیلی کے خلاف تھی۔ ترقی کے مخالفین کے ہاتھ میں مذہب کی دُہائی کا مؤثر ہتھیار تھا۔ گو مذہب علم و عقل کا مخالف نہیں ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اسے اکثر اسی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک عام نعرہ تھا کہ مغربی تعلیم مذہبی تعلیم کی مخالف ہے اس لیے جنھیں مذہب عزیز ہے انہیں قدیم تعلیم سے وابستہ رہنا چاہیے۔

انسانی خیالات کو مختلف ملکوں میں مختلف اوقات میں اس آویزش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یورپ اس آویزش سے سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی میں گزرا جبکہ مشرقی ممالک کو اس سے انیسویں صدی میں مقابلہ کرنا پڑا۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ کشمکش جلدی شروع ہوئی اور اوران کے یہاں اس کا خاتمہ بھی جلدی ہو گیا۔ مسلمانوں میں یہ جدو جہد کافی لمبے عرصے جاری رہی

علی گڑھ اور قوم پرستی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ تقسیم اسناد کے جلسے کو خطاب کرنے کے لیے آپ کے وائس چانسلر صاحب کا دعوت نامہ جب میں نے منظور کیا تو ظاہر ہے کہ مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب اس یونیورسٹی سے میرا پہلا رابطہ قائم ہوا تھا یہ چھتیس ۳۶ برس پہلے کی بات ہے جب حالات ایسے تھے کہ میرا شمار اس ادارے کے مخالفوں میں ہوتا تھا۔

حقیقت جبکہ اس کے بالکل برعکس تھی اس زمانے میں ہندوستانی مسلمان تمام سیاسی تحریکوں سے نہ صرف علیحدہ تھے بلکہ جدوجہد آزادی کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس سیاسی جمود کا سب سے بڑا اور واحد سبب اس ادارے کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم کی قیادت تھی جس کا بار انیسویں صدی کے آخری پچیس سال میں انھوں نے اٹھا لیا تھا علی گڑھ پارٹی نے انڈین نیشنل کانگرس سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے کی سر سید احمد خاں کی پالیسی کو جاری رکھنے کی پوری کوشش کی۔ کچھ اور چنیدہ شخصیتوں کو چھوڑ کر انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

اس پس منظر میں ۱۹۱۲ء میں، میں نے "الہلال" کا اجرا کیا۔ میں نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ہی میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک آزادی میں حصہ لینا چاہیے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں نیشنل کانگریس میں شریک ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ لازمی امر تھا کہ میں اس سیاسی رہنمائی پر تنقید کروں جس کی قیادت سر سید احمد خاں مرحوم کر رہے تھے اور علی گڑھ پارٹی جس کی نمائندہ تھی۔ چنانچہ اس سیاسی مسئلے پر میرے اور اس پارٹی کے درمیان تصادم ہوا۔ اس مخالفت کو اس کے اراکین نے اس سیاسی پالیسی کے بانی کی مخالفت سمجھا اور کچھ لوگوں کے خیال میں تو میں سر سید احمد خاں مرحوم اور علی گڑھ کا دشمن تھا۔

لیکن اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے نزدیک

★ یہ خطبہ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر دیا گیا۔

میں ہندو ہوں"۔ اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ان کی تعلیم کی روح کو سمجھ لیتے اور اسی پر عمل کرتے تو ابھی جو حالیہ واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں ان کا رخ دوسرا ہی ہوتا۔

سرسید احمد خاں نے اس ادارے کی بنیاد ایک مخصوص مقصد کے تحت ڈالی تھی۔ وہ انگریزی تعلیم کی روح کو سمجھتے تھے کہ اس کی افضلیت یہ ہے کہ اس میں صرف درسی تعلیم ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک مخصوص تربیت کی جاتی ہے اور اس تربیت کا مقصد نوجوان مرد اور عورتوں کے کردار کی تعمیر اور ان کو دوسروں سے ممتاز بنانا تھا وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور تربیت بھی ہونا چاہیے۔ وہ جانتے تھے کہ اس شرط کے بغیر جدید تعلیم مسلمانوں میں مقبول نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس مقصد کے حصول میں ایک خاص ادارے کے قیام کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ دن علی گڑھ کالج کی تعمیر کے نذر کر دیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہ پہلا ادارہ تھا جہاں برطانوی پبلک اسکول کا ماحول بنایا جا رہا تھا۔

ابتدا میں ان کے دماغ میں یہ منصوبہ تھا کہ کیمبرج کے طرز پر اقامتی یونیورسٹی قائم کی جائے لیکن آخر میں انہیں ایک کالج کے قیام پر قناعت کرنی پڑی۔ اور اس زمانے کے حالات کے پیش نظر یہ بھی کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی ان کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے طور پر اس کو یونیورسٹی بنانے کی مہم شروع ہوئی اور بیس سال کی جانفشانی کے بعد اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

سرسید نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا بلکہ وقت کے جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اسے دانشوری اور ثقافت کا مرکز بنا دیا۔ اس حلقے کا محور سرسید تھے۔ اپنے زمانے کے بہترین دانشوران کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں شاید ہی کسی رسالے نے اس نسل کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا ان کے رسالے تہذیب الاخلاق نے کیا ہے۔ انگلستان سے واپسی پر انھوں نے اس کا اجراء کیا تھا۔ وہ اور ان کے رفیق اس کے اہم لکھنے والوں میں تھے درحقیقت اسی رسالے نے جدید ادب کی بنیاد ڈالی اور زبان کو علمی مجرّد خیالات کے اظہار کے قابل بنایا اور شاید ہی مسلمانوں میں کوئی ایسی ادبی شخصیت ہو جو اس حلقے سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ جدید دور کے بہترین مسلمان ادیبوں نے یہاں سے توانائی حاصل کی۔ یہاں مسلم فکر کی تحقیق تفسیر اور

لیکن آخر میں وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا کہ تبدیلی کی طاقتیں فتحیاب ہوئیں۔ قدیم نظام کی جگہ جدید نظام نے لے لی جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا سوال ہے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جس شخص نے اس جدوجہد میں اہم رول ادا کیا وہ اس یونیورسٹی کا روح رواں تھا۔ یہ جنگ یہیں علی گڑھ میں لڑی گئی اور اس طرح علی گڑھ ترقی کی علامت بن گیا۔

ہمارے کچھ لکھنے والوں نے سرسید احمد خاں کا مقابلہ راجہ رام موہن رائے سے کیا ہے کسی حد تک یہ تقابل درست ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو کچھ کیا تھا سرسید احمد خاں نے وہی چالیس سال بعد شمالی ہندوستان میں خاص طور پر مسلمانوں کے لیے کیا۔ ان دونوں میں اتنا ہی فرق ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحات کا میدان صرف مذہب تھا جبکہ سرسید احمد خاں نے تعلیم کے میدان میں بھی اصلاحات کیں بہرحال ان دونوں نے دانشورانہ کاوشوں میں اپنی شخصیت کی چھاپ چھوڑی ہے۔ مذہب، تعلیم سماجی زندگی، زبان، ادب اور صحافت ان کی مصلحانہ کوششوں اور تخلیقی توانائی کے گواہ ہیں۔

سرسید احمد خاں نے حالانکہ کانگریس کی مخالفت کی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے اس رویے میں فرقہ پرست سیاست کا معمولی سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ان کی سرگرمیوں، یہاں تک کہ سیاست میں بھی ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے وہ تمام عمر ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ انھوں نے ہر اس چیز کی مخالفت کی جو ان دونوں فرقوں کے درمیان نزاع اور اختلاف کا سبب ہو۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار اس خوب صورت تشبیہ کا استعمال کیا ہے کہ ہندو اور مسلمان مادرِ وطن کے چہرے پر دو آنکھوں کی مانند ہیں۔

"ہندو" اصطلاح کو انھوں نے جو اہمیت دی ہے اس سے ہندوستانی قوم پرستی کے سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر کو ہم کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ لاہور میں ہندوؤں کی ایک تنظیم کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے "ہندو" کی اصطلاح کے استعمال کو محدود کرلیا ہے۔ میرے خیال میں اس کا یہ استعمال درست نہیں ہے۔ میں ان سب کو ہندو مانتا ہوں جو اس ملک میں رہتے ہیں چاہے وہ کسی مذہب اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ

اب کھل گئے ہیں، ایک فارسی شعر کے الفاظ میں :

تفاوت است معنی شنیدن من و تو   تو بستن در، و من فاتح باب می شنوم

میں نے اور تم نے جو سنا وہ مختلف ہے تم نے دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنی اور میں نے کھلنے کی۔

میں آپ سے بغیر ذہنی تحفظات کے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے توقع بھی یہی ہوگی۔ آپ اگر ابھی تک اسی فرقہ وارانہ سیاست کے ماحول میں رہ رہے ہیں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا، تو میں بغیر کسی تامّل کے یہ کہوں گا کہ آپ کا مستقبل ویسا نہیں ہوگا جو میرے نزدیک ایک ہندوستانی مسلمان کا ہونا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ تب سے بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے اور ایک نئے دور کے امکانات روز بروز روشن ہوتے جارہے ہیں آپ نے اس امر کو جان لیا ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں اس ادارے کا علمی ماحول کیسا ہونا چاہیے آپ کو نئے زمانے کے مطالبوں کو سمجھ کر بدلے ہوئے تصور کے مطابق حالات پیدا کرنا چاہیے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں ہے کہ آپ نے زمانے کے ساتھ مطابقت پیدا کرکے نہ صرف اس ادارے کی بلکہ انڈین یونین کے تمام مسلمانوں کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو اپنی پُرخلوص مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں مختصر طور پر آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قومی تعلیم کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے کیا منصوبے اور پروگرام ہیں اور اس نئی اسکیم میں علی گڑھ یونیورسٹی جیسے ادارے کا کیا مقام ہوگا۔ میرے خیال میں آپ بھی اس سے متفق ہوں گے کہ ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کا تعلیمی نظام بھی سیکولر ہی ہونا چاہیے۔ اس کو ملک کے تمام شہریوں کے لیے بغیر کسی تفریق کے یکساں تعلیم فراہم کرنا چاہیے۔ اس کا اپنا انداز اور قومی کردار ہونا چاہیے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ تعلیمی اداروں کو اس کا موقع بھی دیا جائے گا کہ وہ کسی مخصوص تعلیم پر زور دیں اور اس کے دروازے ان سب لوگوں پر کھلے رہیں گے جو اس قسم کی تعلیم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ قومی تعلیم کا یہ وہ میدان ہے جس میں آپ کا ادارہ وقت کے مطابق اپنا صحیح مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اور اسی طرح آپ اپنے مخصوص کردار کے ساتھ تعلیم کی عام اسکیم کا حصہ بن جائیں گے اور اس میں ایک اہم خدمت انجام دیں گے۔

تجدد کے دبستاں وجود میں آئے۔ اگرچہ جدید اردو شاعری لاہور میں پیدا ہوئی لیکن اس کے ارتقاء کے لیے موزوں فضا یہاں ملی۔ جدید طرز کی نظمیں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے لکھی گئیں اور اس کے اجلاسوں میں پڑھی گئیں۔ یہ اردو خطابت کا پہلا فورم بھی تھا۔ اپنے زمانے کے سبھی اہم مقررّین نے اسی پلیٹ فارم سے اپنی خطابت کا آغاز کیا یا یہاں سے تربیت حاصل کی۔

انیسویں صدی میں مشرق کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی ایک عبوری دور تھا۔ قدیم طرز زندگی کے نظریے معدوم ہو رہے تھے اور جدید طرز زندگی ان کی جگہ لے رہا تھا۔ ہندوستان کی پرانی سرزمین نیا چولا بدل رہی تھی۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ علی گڑھ ہی تھا جہاں اصلاحی تحریکیں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ اس کا شمار ہندوستان کے ان مقامات میں ہے جہاں نئے ہندوستان کی تعمیر میں رہبری کی گئی۔ انیسویں صدی ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور علی گڑھ اس کا سب سے بڑا مرکز۔

یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد علی گڑھ کی بہت سی امتیازی خصوصیات باقی نہیں رہیں۔ گو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے مگر یہاں جو ابتدائی دور کی عظیم الشان روایات تھیں وہ زندہ نہیں ہو پائیں۔ بہر حال آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ عظیم الشان ورثہ آپ کا ہے اور آپ ہی لوگ ہیں جنھیں علی گڑھ کے شاندار ماضی کی روایات کی تجدید کرنا ہے۔ یہ کتبے جو آپ کے اسٹریچی ہال کی دیواروں پر کندہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ دھندلا جائیں مگر وہ کتبے جو علی گڑھ نے ہندوستان کے جدید دور میں کندہ کیے ہیں وہ کبھی نہیں دھندلا سکتے۔ مستقبل کے مورخ علی گڑھ میں جدید ہندوستان کی تعمیر کے ماخذ تلاش کریں گے۔

ایک تعلیمی ادارہ جس کا ماضی اتنا شاندار رہا ہو اس کا مستقبل بھی اتنا ہی شاندار ہونا چاہیے مجھے علم نہیں کہ آپ کی ذہنی حالت کیا ہے؟ میں نہیں جانتا کہ مستقبل کے کون سے رنگ آپ کے سامنے ہیں؟ کیا یہ دروازوں کو بند کرنے کا پیغام دیں گے۔ یا نئے دروازے کھولنے کا جن کے وسیلے سے آپ اپنے تجربات سے نئے مناظر سے روشناس ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ آپ کے سامنے کون سے مناظر ہیں لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کون سے منظر دیکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سوچیں کہ وہ دروازے جو کھلے ہوئے تھے اب بند ہو چکے ہیں مگر میں نے دیکھا ہے کہ جو دروازے مقفل تھے وہ

نے ادب تخلیق کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں برج بھاشا میں شاعری کرنے والے مسلمان شاعروں کی قابل لحاظ تعداد ہے۔ اب وقت آگیا ہے آپ اپنی پرانی روایت کو پھر زندہ کریں۔ میری خواہش ہے کہ یہ ادارہ ایسے بہت سے ادیب پیدا کرے جو اردو اور ہندی دونوں میں ادب تخلیق کریں۔

اس زمانے میں ایک متنازعہ مسئلہ رسم الخط کا ہے۔ آپ اس سلسلے میں گاندھی جی کی رائے سے واقف ہیں۔ ان کی پُرخلوص خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط جانے۔ اس لیے جب انہوں نے ہندوستانی پرچار سبھا قائم کی تو اس کے کارکنوں کے لیے یہ ضروری شرط رکھی کہ انھیں دونوں رسم الخط آنے چاہئیں۔ برسوں سے میری بھی یہی رائے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کا یہی ممکن حل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو ادب سے محبت کرنے والے ہندی ادب کی وکالت کرنے والوں کے ردعمل کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ وہ خود ایسے کام کریں گے جو ان کے نزدیک ملک کے مفاد میں بہترین ہوں گے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس بات کا انتظار کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ لیکن تعلیم کے میدان میں ہم دوسروں کا انتظار صرف اپنے اعتبار کو خطرہ میں ڈال کر کر سکتے ہیں۔ اگر دوسرے اس پر مطمئن ہیں کہ وہ صرف ایک رسم الخط جانتے ہیں تو ہمیں اس بات پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم دو رسم الخط سیکھ رہے ہیں میری یہ دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان دونوں رسم الخط سیکھے اور اس طرح ملک کے سامنے ایک مثال قائم کردے یہ گاندھی جی کا پیغام تھا اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان اسس پر جوش و خروش کے ساتھ عمل کریں گے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کام کی اہمیت کو چاروں طرف تسلیم کیا جا رہا ہے اور اردو میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی مدد سے دیوناگری رسم الخط آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے اور جو ہندی ادب سے واقفیت حاصل کرنے میں معاون ہیں۔ کچھ تنظیمیں اسس مقصد سے ملک کے مختلف حصوں میں قائم کی جا چکی ہیں اور انہوں نے اپنی سرگرمیاں شروع کردی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور آپ کا ادارہ اس کام کے نہایت سرگرم مراکز میں تسلیم کیا جائے گا۔

اب میں ہدایت کے طور پر چند الفاظ ان نوجوان گریجویٹوں سے کہوں گا جو آج اپنی ڈگریاں

اس کے لیے وسیع پیمانے پر ہمہ گیر رواداری کا مظاہرہ کرنا ہوگا کہا جاتا ہے کہ افلاطون نے اپنی اکادمی پر یہ عبادت کندہ کرائی تھی "وہ جو اقلیدس نہیں جانتے ہیں ان کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے"۔ آپ کا ادارہ ایسی کوئی شرط نہیں لگاتا بلکہ آپ کا قول تو یہ ہونا چاہیے کہ آپ دونوں کا خیر مقدم کریں گے جو اقلیدس جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ادارے کے انتظامی اصول ابتدا سے ہی غیر متعصبانہ اور لبرل ہیں جب آپ کا کالج قائم ہوا تو اس کالج کے سب سے پہلے گروپ کے طالب علموں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تھے۔ آپ کی یونیورسٹی کے اسٹاف میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں۔

کئی ہندو پروفیسروں کے نام آپ کے ادارے کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان روایات کی توسیع ہوگی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ زیادہ تقویت پائیں گی۔

اسلامیت اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ وتحقیق آپ کی روایت کا ایک حصہ ہے اگرچہ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ سرسید کے انتقال کے بعد اس میدان میں وہ سرگرمی نہیں رہی جو ان کے دور میں نظر آتی تھی۔ یونیورسٹی کے قیام سے بھی وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ آج آپ کا فرض ہے کہ ان پرانی روایات کی تجدید کریں اور اپنی یونیورسٹی میں علم کے ہر شعبے میں تحقیق اور علم کی جستجو کا ایک ماحول پیدا کریں۔

میں اس سے پہلے بھی آپ کو یاد دلا چکا ہوں کہ علی گڑھ وہ جگہ ہے جہاں جدید اردو ادب کا ارتقا ہوا۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس پر آپ کی یونیورسٹی کو فخر ہونا چاہیے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس میراث کی حفاظت کریں اور اس کو مزید تقویت پہنچائیں۔ میں آپ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ماضی کے مقابلے میں آج آپ کی ادبی کاوشوں کے لیے میدان زیادہ وسیع ہے۔ آپ کو ہندی ادب میں بھی اتنی ہی دلچسپی لینی چاہیے۔ مسلمانوں کو مختلف زبانوں اور ادب کے مطالعہ سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ ہندی ادب پر ہندوستان کے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ دونوں قوموں نے اردو اور ہندی کی ترقی میں مشترکہ طور پر حصہ لیا ہے۔ برج بھاشا میں نئے ادب کی ابتدا مغل دور میں اکبر اور جہانگیر جیسے بادشاہوں کی سرپرستی میں ہوئی، جس میں ملک محمد جائسی خان خاناں اور عبدالجلیل بلگرامی جیسے غیر معمولی ذہانت کے مالک ادیبوں

پیش لفظ

ہسٹری آف فلاسفی ایسٹرن اینڈ ویسٹرن

"علم تمام حدود اور سرحدوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں وہ پہلے ظہور میں آیا ہو، وہ ہوتا ہے بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث۔ تمام انسان چاہے ان کا ملک یا قومیت کچھ بھی ہو اس کے دعوے دار ہونے کا مساوی حق رکھتے ہیں۔"

لے رہے ہیں اور زندگی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے جارہے ہیں مجھے اس میں شک ہے کہ آپ نے ان تبدیلیوں کا پوری طرح احساس کیا ہے جو آپ کے داخلے کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ آپ جب اس ادارے میں داخل ہوئے تھے تو محکوم قوم کے فرد تھے اور آج جب آپ اس یونیورسٹی کو چھوڑ رہے ہیں تو آپ آزاد ہندوستان کے شہری ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ آپ میں سے سب لوگوں نے اس زبردست تبدیلی کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ کیا ہے۔ پہلے محکوم قوم کے فرد کی حیثیت سے آپ کو بہت سی مجبوریوں کا سامنا تھا لیکن اب ایک آزاد ملک کے شہریوں کی حیثیت سے آپ پر نئی ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں۔ آزادی نے آپ کی ترقی کے لیے وسیع تر مواقع فراہم کیے ہیں اس لیے یہ لازمی امر ہے کہ اب اپنے آپ کو ملک کا جانثار اور وفادار ثابت کریں۔ آج آپ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں اور یہی آزادی آپ پر کچھ فرائض بھی عاید کرتی ہے۔

آپ آزاد ہندوستان کے شہری ہیں۔ ایک ایسے ملک کے شہری جو سیکولر اور جمہوری راہ پر اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کو چلانے کا عزم کر چکا ہے۔ ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کی روح یہ ہے کہ نسل، مذہب، ذات اور برادری کی تفریق کے بغیر ہر فرد کو آگے بڑھنے کے مواقع میسر ہوں۔ اس ایسی ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے آپ کا یہ حق ہے کہ آپ اس کی توقع کریں کہ سیاست، تجارت، صنعت یا دوسری ملازمتوں اور پیشوں کے تمام دروازے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہوں۔ بشرطیکہ آپ اپنے کردار اور لیاقت سے ان کی ضروری شرطوں کو پورا کرتے ہوں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماضی میں اس ادارے کے فارغ التحصیل بہت سے طلباء کا مقصد صرف سرکاری نوکریوں کا حصول تھا۔ آزادی سے آپ کا ذہن کشادہ اور حوصلے بلند ہونے چاہئیں اور آزاد ہندوستان میں آپ کو اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے جو ہر طرح قوم کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ میرے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اگر آپ ترقی پسند قومیت کے اس تصور کو قبول کر لیں گے جو ہماری سیکولر جمہوری ریاست کا اصول عمل ہے تو زندگی کے میدان میں کوئی مقام ایسا نہیں ہوگا جو آپ کی دسترس سے باہر ہو۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنی شخصیت کی تعمیر کریں۔ اس کو مضبوط بنائیں نیز وہ علم حاصل کریں جس سے مستقبل میں اپنے ملک کو ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن کرنے میں اپنا صحیح رول ادا کر سکیں۔

واضح راستہ اختیار کیا اور عقل و فکر کی راہ پر گامزن ہوا۔ یہ تھی ابتدا باضابطہ غور و فکر کی۔ جس دن انسانی ذہن اس مرحلے تک پہنچا وہ دن تھا فلسفے کے وجود میں آنے کا اور اسی دن سے فلسفے کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

تاریخ فلسفہ اٹھارویں صدی تک جو طریقہ فلسفے کے یورپی مورخین نے اختیار کیا تھا وہ اس سے ملتا جلتا تھا جو ازمنہ وسطیٰ میں عرب مورخوں اور فلسفیوں نے اپنایا تھا۔ وہ فلسفے کی ترقی کا مطالعہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے برعکس ان لوگوں کے لیے جنہیں اس میں دلچسپی تھی فلسفیوں اور ان کے دبستانوں کی فہرستیں تیار کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ فلسفے کے مورخ ہونے کے بجائے فلسفیوں کے مورخ تھے۔

اس کے بعد سے فلسفے کی تاریخ کے مطالعہ میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ بہت سی قوموں کے عالموں نے اہم کتابیں لکھی ہیں لیکن انہیں پڑھتے وقت ایک واقعہ ہمیشہ میری توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ فلسفے کی ابتدا اور مختلف شعبوں میں اس کی تقسیم کے موجودہ بیانوں میں موضوع کی مکمل اور حقیقی تصویر نظر نہیں آتی ہے۔ اس لیے فلسفے کی تمام تاریخ کے زیادہ جامع بیان کی ضرورت ہے۔

اس تاریخ کے کچھ صفحات اس طرح گم ہو گئے ہیں کہ ان کی کمی کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے متعلق اطلاعات کے ماخذ تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ یونان سے بہت پہلے مصر اور عراق میں اعلیٰ درجہ کی تہذیب پائی جاتی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابتدائی یونانی فلسفہ پر مصر کے قدیم حکیمانہ اقوال کا گہرا اثر پڑا تھا۔ افلاطون نے اپنی تحریروں میں مصری کے حکیمانہ اقوال کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے علم کے ماخذ کی حیثیت سے ان کا استناد مسلّمہ تھا۔ ارسطو نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مصری پجاری دنیا کے پہلے فلسفی تھے۔ لیکن ہمیں مصر اور یونان کے باہمی رشتے کی جزئیات نہیں معلوم ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں بلکہ آئندہ انہیں دریافت کرنے کی امید بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیں اس کے متعلق بھی صحیح صحیح علم نہیں ہے کہ اس فلسفیانہ فکر کی نوعیت اور ہیئت کیا تھی جس نے ترقی کر کے بابل اور نینوا کی تہذیبوں کی شکل اختیار کی۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ یونانی فلسفے کے وجود میں آنے کی

پیش لفظ

ہسٹری آف فلاسفی ایسٹرن اینڈ ویسٹرن*

ایک فارسی کے شاعر نے کائنات کو ایک پرانے مخطوطے سے تشبیہ دی ہے جس کا پہلا اور آخری صفحہ گم ہوگیا ہے۔ یہ بتانا ممکن نہیں کہ کتاب کیسے شروع ہوئی، نہ یہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کیسے ختم ہوگی۔

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبر ایم   اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است

جب سے انسان میں شعور پیدا ہوا ہے وہ ان گم شدہ صفحات کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس تلاش اور اس کے نتائج کا نام ہے فلسفہ۔ فلسفے اور اس کی نوعیت کے بیان میں فلسفی صفحات رنگ دیتا ہے لیکن شاعر نے محض ایک شعر میں اسے بیان کر دیا۔

اس تلاش و جستجو کا مقصد ہے زندگی اور وجود کے معنی دریافت کرنا۔ جب انسان میں خود شناسی کا احساس جاگا اور وہ سوچنے لگا تو اس کے ذہن میں دو سوال ابھرے۔ یعنی زندگی کے معنی کیا ہیں اور جو کائنات اسے اپنے چاروں طرف نظر آتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کتنی مدت تک وہ آنکھیں بند کیے ادھر ادھر ٹٹولتا رہا۔ پھر بھی ایک مرحلہ وہ آیا جب اس نے ایک

---

* ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں مولانا نے اپنی تقریر میں اس ضرورت کی طرف دھیان دلایا تھا کہ تاریخ فلسفہ کو جدید زاویۂ نگاہ سے لکھا جانا چاہیے اور اسی موقع پر نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک ایڈیٹوریل بورڈ تشکیل ہوا تھا۔ اس بورڈ نے "ہسٹری آف فلاسفی" دو جلدوں میں ۴ رمئی ۱۹۵۳ء میں شائع کی تھی۔ اس پر پیش لفظ مولانا نے لکھا تھا اور الائن اینڈ اُنون لندن کی اجازت سے یہ ہندوستان ٹائمز میں بھی شائع ہوا تھا۔

تقسیم کرتے ہیں. ماقبل تجدید مسیحت اور بعداز تجدید مسیحت. اردمان کی طرح کے فلسفے کے مورخوں نے بھی اس بنیاد پر فلسفے کی ترقی کے ادوار متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اردمان کے مطابق فلسفے کے ادوار ہیں۔

۱۔ ماقبل مسیحت یونانی ۲۔ بعداز مسیحت وسطیٰ اور ۳۔ بعداز تجدید مسیحت جدید عہد[۲]

ظاہر ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا اطلاق فلسفے کی عام تاریخ کے بجائے محض مغربی فلسفے کی تاریخ پر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستانی اور چینی فلسفہ ابھی تک پوری طرح سامنے نہیں آیا ہے اس لیے اس محدود تصور نے عمومی تاریخ کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور رفتہ رفتہ یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی۔ انیسویں صدی میں لکھی جانے والی فلسفے کی سبھی تاریخوں میں، چاہے وہ طلبا کے لیے درسی کتابیں ہوں یا عام قاری کے لیے ہوں، بار بار یہی کہانی دہرائی گئی ہے۔ تاریخ فلسفہ کا یہ محدود تصور اس طرح ہمارے ذہن نشین ہوگیا کہ بعد کی تحقیق کی بنا پر حاصل ہونے والے نئے علم کے باوجود ہم اس نقش کو مٹا نہیں سکے۔ جب بھی ہم تاریخ فلسفہ کا تصور کرتے ہیں تو یہ محدود پیکر ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ کسی طرح بھی اس واقعے کی صراحت نہیں کی جاسکتی ہے کہ تھیلیس کی طرح کا عالم اس صدی کی دوسری دہائی میں لکھتے وقت مشرق کی دین کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا ہے اور باضابطہ فلسفے کی ترقی کا بیان یونانیوں سے شروع کرتا ہے[۳]۔

فلسفے کا یہ ذکر نہ صرف اس کی ابتدا کے تعلق سے بلکہ بعد کے کئی ادوار کے تعلق سے بھی نامکمل ہے۔ فلسفے کی ترقی کے تعلق سے ہمارا نقطہ نظر تین یا چار ادوار کے مغربی تصور سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ ہم کسی دوسرے تناظر میں اسے دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ عیسوی دور کی ابتدا سے بہت پہلے بودھ مابعدالطبیعیاتی فکر فلسفے کے ایک واضح دبستان کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ اگر ہم ان زمانوں میں فلسفے کی ترقی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ یونان میں فلسفے کی ترقی کے ساتھ ہندوستان میں نمودار ہونے والے اس قسم کے واقعات پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ ان صدیوں میں یونان اور ہندوستان میں جو فلسفیانہ مباحث کیے گئے ان کی نوعیت اور وسعت کا تقابلی مطالعہ بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا۔ لیکن فلسفے کی معیاری تواریخ محض یورپی فلسفے پر غور و فکر کرنے کی اتنی عادی ہوچکی ہیں کہ وہ ان تمام واقعات

کوئی ذمہ داری ان افکار پر ہے یا نہیں۔ تاریخ فلسفہ میں پائی جانے والی ان کوتاہیوں کی وجہ ہے ہمارے علم کی کمی جو اس نوعیت کی ہے کہ کبھی پوری نہیں کی جا سکے گی۔

لیکن قدیم تاریخ کے کچھ دوسرے شعبے ہیں جن کے متعلق آج ہمیں زیادہ علم ہے۔ ان کی بنا پر ہم فلسفے کے نمو کا زیادہ صحیح خاکہ بنا سکتے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے اس نے عہد قدیم میں فلسفے کی ترقی کے متعلق اطلاعات کے نئے نئے ذرائع مہیا کر دیے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ یونانیوں سے پہلے کے عہد میں فلسفے کی پیش رفت کا جائزہ لیا جا سکے اور اس مرحلے پر اس کی ترقی کی نوعیت اور وسعت کا تعین کیا جا سکے۔ لیکن ہم نے ابھی تک ان واقعات پر پوری توجہ نہیں دی ہے اور تاریخ فلسفہ کے اس محدود تصور کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو انیسویں صدی سے ہم تک پہنچا ہے۔

یورپی فلسفہ کی ابتدا ہوئی یونان کے فلسفیانہ استفسارات سے۔ مسیحت کے پھیلنے کے بعد اس کی ترقی رک گئی اور ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب یورپ میں فلسفہ منظر عام سے ہٹ گیا۔ کچھ صدیاں گزرنے کے بعد عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں یونانی فلسفے کا مطالعہ شروع کیا بعد میں ان کے ذریعے یورپ میں اس کا مطالعہ ایک دفعہ پھر شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ان مطالعات کی بنا پر روشن خیالی کی وہ تحریک وجود میں آئی جسے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یورپ نے اصل یونانی متنوں تک رسائی حاصل کر لی جن سے ابھی تک وہ عرب مترجمین اور شارحین کی تحریروں کے ذریعے متعارف تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد اس تحریک فکر کی ابتدا ہوئی جس نے جدید فلسفے کو جنم دیا۔ چنانچہ یورپ میں فلسفہ کی تاریخ اکثر چار ادوار میں تقسیم کی جاتی ہے۔

۱۔ قدیم ۲۔ وسطی ۳۔ نشاۃ ثانیہ اور ۴۔ جدید

انیسویں صدی میں جب یورپ کے عالموں نے تاریخ فلسفہ کا عمومی خاکہ تیار کرنے کی کوشش کی تو ادوار کی اس تقسیم پر ان کی نظر گئی۔ یورپی ذہن پر مسیحت کا اثر بھی ایک وجہ تھی اس تقسیم کی۔ یورپ کے عالم چاہتے ہیں کہ تمام تر انسانی ترقی کی تشریح مسیحت کے ظہور میں آنے کے نقطہ نظر سے کی جائے چنانچہ وہ انسانی تاریخ کو دو بڑے بڑے ادوار میں تقسیم کرتے ہیں یعنی ماقبل مسیحت اور بعد از مسیحت اور آخر الذکر دور کی ذیلی

لیکن جب ہم چھٹی صدی قبل مسیح کے ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک بالکل مختلف تصویر نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں اس دور نے فلسفیانہ فکر کی ابتدا کے بجائے اس کی ترقی کو دیکھا۔ یونان کی طرح یہ فلسفے کی صبح نہیں تھی بلکہ وہ منظر تھا جس کو یوم فلسفہ کی پوری آب و تاب کہا جا سکتا ہے۔ فلسفیانہ تلاش و جستجو کے طویل اور دشوار گزار راستے پر انسانی ذہن کے یہ پہلے ڈگمگاتے قدم نہیں تھے بلکہ وہ مرحلہ تھا جہاں تک خاصا سفر طے کرنے کے بعد پہنچا گیا ہو گا۔

اس دور کے متعلق کسی بھی بحث و مباحثے میں ہماری توجہ دو واقعات پر مرکوز ہو جاتی ہے

۱۔ اس دور میں بدھ مت اور جین مت ظہور میں آئے۔

۲۔ بدھ اور مہاویر کے ظہور سے پہلے ہندوستان میں فلسفیانہ فکر خاصی ترقی کر گیا تھا اور ایسے نظام وجود میں آچکے تھے جن کے لیے وسیع اور عمیق فلسفیانہ فکر کے ایک طویل دور کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیا کے عظیم ترین لوگوں میں گوتم بدھ کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہ ایک نزاعی امر ہے کہ ان کا شمار نبیوں میں کیا جائے یا فلسفیوں میں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تعلیم کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ نیا الہام تھا یا نئی فلسفیانہ دریافت، طویل نزاعی بحث کے باوجود فلسفہ اور مذہب دونوں بدھ کے دعوے دار ہیں۔ میں اس نزاعی بحث کو دہراؤں گا نہیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بدھ کو پیغمبر کے بجائے فلسفی کے رول میں دیکھنا آسان تر ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق و تفتیش شروع کی زندگی کا مسئلہ حل کرنے کی خاطر نہ کہ خدا کے وجود کی تلاش میں۔ اسی طرح ان کی تلاش ختم ہوگئی اس مسئلے کے حل ہونے کے بعد اور انہوں نے خدا کی نوعیت یا وجود میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انہوں نے ہندوستان کی اس مذہبی زندگی سے یک سر اپنا ناتا توڑ لیا جو لاتعداد دیوتاؤں اور دیویوں پر یقین رکھتی تھی۔ خدا کے تصور کو بیچ میں ڈالے بغیر انہوں نے تلاش اور جستجو کی اور منزل مقصود تک پہنچے۔ جس اصول پر انہوں نے اپنی مفکرانہ تفتیش کی بنیاد قائم کی وہ خود فلسفیانہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی کوشش کا مقصد ہے زندگی کے مسئلے کو حل کرنا اور اس کے لیے اسے کسی مافوق الفطرت قوت کے وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان

کو بھلا دیتی ہیں اور مشرق کی دین کو نظر انداز کرتی ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا کے بعد ہمارا علم محض یونان کی چار دیواری میں اسیر نہیں رہا ہے اور ہندوستانی اور چینی فلسفے کی بڑی قدر و قیمت سمجھ جان گئے ہیں لیکن یہ علم آج بھی چند ماہرین کے حلقے تک محدود ہے اور فلسفے کی عام تاریخ میں اسے وہ مقام نصیب نہیں ہو سکا جس کا وہ مستحق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ جدید مصنفین نے پرانے تصور کی کوتاہی کو جان لیا ہے۔ اس امر کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ فلسفے کی پرانی محدود تواریخ کی جگہ ایک زیادہ مکمل تاریخ تیار کی جائے برٹرنڈ رسل نے حال ہی میں فلسفے کی ایک تاریخ لکھی ہے جو انیسویں صدی کی تاریخوں کے مشابہ ہے لیکن اس نے اسے مغربی فلسفے کی تاریخ کا نام دے کر اس کمی کا اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ فلسفے کی تاریخ کے پرانے محدود تصور کی جگہ ایک زیادہ مکمل تصور نے لے لی ہے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی فلسفے کو فلسفے کی عام تاریخ میں وہ مقام مل گیا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جو مواد ہمارے پاس موجود ہے اس کی مدد سے ہمیں ایک جامع تاریخ لکھنی چاہیے جس میں مشرق اور مغرب دونوں کی دین کو یکساں طور سے تسلیم کیا جائے۔

فلسفے کے قدیم ترین ماخذ اس سلسلے میں جو بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے اس کا تعلق ہے فلسفے کی ابتدا سے۔ ہم اس کہانی کو کہاں سے شروع کریں؟ یونان سے یا ہندوستان سے؟ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ فلسفے کی ابتدائی ترقی کے نقوش کس ملک میں ملتے ہیں؟

جہاں تک یونانی فلسفے کا تعلق ہے ہم اس کے کچھ قدیم ترین مراحل سے واقف ہیں اس بات کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ یونان میں فلسفیانہ فکر چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلے نہیں ملتی ہے۔ پہلا یونانی مفکر تھا تھیلس جسے بجا طور پر فلسفی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے تاریخ وار حالات کے تعین میں ایک مخصوص حادثے نے مدد دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے حساب لگا کر اس گرہن کے صحیح وقت کی پیشین گوئی کی تھی جو ۵۸۵ قبل مسیح میں پڑا تھا۔ تھیلس کے بعد جن دو اشخاص نے یونان میں فلسفیانہ فکر کو ایک نیا موڑ دیا وہ تھے فیثاغورث اور سقراط۔ فیثاغورث ۵۳۲ قبل مسیح کے لگ بھگ زندہ تھا اور سقراط کا انتقال ہوا ۳۹۹ قبل مسیح میں۔

احتجاج کیا تھا لیکن وہ بھی دیوتاؤں کے مقبول عام تصور کے اثر کو زائل نہ کر سکا۔

اگر فلسفے اور مذہب کی تاریخ کا کہیں اور عام جائزہ لینے کے بعد ہم اس طریقے کے مطالعے کی طرف توجہ کریں جس کے مطابق ہندوستانی شعور نے ان کے مسائل کے تعلق سے ردعمل ظاہر کیا تو ہم ایک بالکل نئے طریقۂ کار سے دوچار ہوتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر فلسفے اور مذہب نے واضح اور مختلف راستے اختیار کیے۔ حالانکہ کبھی کبھی ان کے راستوں نے ایک دوسرے کو کاٹا اور متاثر بھی کیا لیکن وہ رہے علیحدہ، ملے نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان میں دونوں میں امتیاز کرنا ہر وقت ممکن نہیں ہوتا ہے۔ یونان کے برعکس ہندوستان میں فلسفہ دانش گاہوں کی دیواروں میں قید نہیں تھا بلکہ لاکھوں انسانوں کا مذہب بن گیا تھا۔

گوتم بدھ اور مہاویر نے زندگی کے مسئلے کے جو حل دریافت کیے تھے 'وہ' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بنیادی طور سے فلسفیانہ تھے لیکن ان کی تعلیمات کی بنیاد پر اسی طرح مذہبی فرقے وجود میں آگئے جیسے سامی نبیوں کی تعلیمات کی بنیاد پر آگئے تھے۔ یونانی فلسفیوں میں کئی اعتبار سے سقراط کا بڑا عجیب وغریب کردار تھا۔ وہ بنیادی طور سے محض فلسفی تھا لیکن اس کو محض فلسفی کہہ کر اس کی شخصیت کی پوری طرح وضاحت نہیں کی جاسکتی ہے۔ جب ہم اس کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں یسوع مسیح یاد آجاتے ہیں۔ اس کی زندگی کے جتنے واقعات ہمیں معلوم ہیں وہ اسرائیل کے نبیوں اور ہندوستان کے جوگیوں کی زندگی سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر وجد کے عالم میں رہتا تھا۔ اسے ایک داخلی آواز پر بھی یقین تھا جو بحرانی لمحوں میں اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ اس کے پیروؤں نے اس کی شخصیت یا تعلیمات کی بنیاد پر ایک مذہبی فرقے کو جنم دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس واقعے سے ہندوستانی اور یونانی اُفتادِ مزاج کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یونان میں مذہبی اجزا نے فلسفے کی خاصیت پائی، ہندوستان میں فلسفے کو مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔

ہم نے فلسفے اور مذہب کے درمیان امتیاز قائم کی ہے وہ ہندوستانی صورت حال کو صحیح طرح سے پیش نہیں کرتی ہے۔ اگر ہم اس اصول کا اطلاق کرنا چاہیں جو فلسفے کو مذہب سے ممیز کرتا ہے تو ہمیں یا تو خود اس جانچ کے اصول کو بدلنا ہوگا یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان میں فلسفے اور مذہب نے ایک ہی راستہ اختیار کیا ہے۔

کے انتقال کے بعد ان کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو مکمل مذہبی مسلک میں تبدیل کر دیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس جگہ کو خالی چھوڑ دیا ہے، جو مذہب میں عام طور سے خدا کو دی جاتی ہے تو انہوں نے خود بدھ کو خالق کی گدی پر بٹھا دیا۔ لیکن ظاہر ہے اس کی ذمہ داری بدھ پر نہیں ہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں جین مت کا بھی ظہور ہوا جو خدا کے وجود کے تعلق سے زیادہ بے نیاز ہے۔ بدھ کی طرح مہاویر نے بھی خدا کے وجود کے کسی حوالے کے بغیر زندگی کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ جینیوں کی ذہنی توجیہات کی بنیاد قائم ہے ان اصولوں پر جو حقیقت میں فلسفے کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ قارئین نہ صرف گوتم بدھ یا مہاویر کی شخصیت بلکہ اس مفکرانہ پس منظر پر خصوصی توجہ دیں جس نے ان کے ظہور میں آنے کو ممکن بنا دیا۔ اس پس منظر کا مطالعہ ہی فلسفے کے مورخ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ کہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہندوستان گوتم بدھ اور مہاویر کے طریقۂ کار اور انداز فکر کا مظاہرہ کر سکا خود اس امر کی شہادت ہے کہ ملک میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی اور عمیق فلسفیانہ فکر ترقی پا چکی تھی۔ ایسا ماحول موجود تھا جس میں زندگی کے رموز کے تعلق سے مختلف نظریات اور تفسیرات کو ترقی دی جا سکتی تھی۔ ایک ایسا مرحلہ بھی آ گیا تھا جہاں خدا کے وجود یا الہام خداوندی کو تسلیم کیے بغیر بھی یہ مسئلے حل کیے جا سکتے تھے۔

یونان میں اس قسم کا فلسفیانہ مزاج بہت بعد میں پیدا ہوا۔ ہندوستانی فلسفہ، جس کا شمار قدیم ترین یونانی دبستانوں میں ہوتا ہے، اس نظریئے میں یقین رکھتا ہے کہ ارواح سیاروں اور دوسرے اجرام فلکی سے باخبر رہتی ہیں۔ ان کو عام اساطیری دیوی دیوتاؤں سے ممیز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کوہ اولمپس کی چوٹی پر براجمان وہ مذہب کے دیوتا تھے۔ لیکن جب انہی دیوتاؤں نے فلسفیانہ لباس پہنا اور عرش بریں تک پہنچے تو انہیں افہام کائنات کے فلسفیانہ لقب سے نوازا گیا۔ ہندوستانی فلسفے کا یہ رجحان یونانی فکر کے بعد کے سبھی دبستانوں میں جاری رہا۔ اگر ارسطو کی آسمانی ارواح کی صحیح صحیح چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قدیم یونانی دیوتاؤں سے بہت مختلف نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سقراط نے دیوتاؤں کی پرستش کے خلاف

ارسطو نے ان میں سے کسی بھی فکری نظام کو ترقی نہیں دی۔ لیکن بالآخر اسکندریہ میں علم باطن نے نشوونما پائی اور نو افلاطونی فلسفے کی شکل اختیار کی۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ دبستان اسکندریہ کی ترقی کی ذمہ داری ہندوستان کے اپنشدوں کے فلسفے پر تھی یا نہیں۔ لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس زمانے میں اسکندریہ مشرق اور مغرب کے مذاہب اور تہذیبوں کا نقطہ اتصال بن گیا تھا۔ جس طرح مختلف مذاہب کے دیوتا اس کے بازار میں ملے تھے اور سیراپیم (جس میں مختلف دیوتاؤں کی خصوصیات تھیں اور جس کی پرستش وسیع پیمانے پر مصر اور یونان میں کی جاتی تھی) کے وجود میں آنے کا سبب بنے تھے اسی طرح اس کا امکان بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فکر و تفتیش کی مختلف دھاراؤں کا یہاں سنگم ہوا اور وہ ایک ہی دریا میں شامل ہو گئیں۔

علم باطنی کا بنیادی اصول کیا ہے؟ یہ ہے حقیقت کا ادراک جو حواس کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم حقیقت تک رسائی چاہتے ہیں تو ہمیں حواس کی دنیا کو تج کر باطنی تجربے کی دنیا میں آنا پڑے گا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ اصول فیثاغورث سے لے کر افلاطون تک کے فلسفیانہ نظاموں میں برسرِ عمل رہا ہے۔ افلاطون نے دنیائے فکر اور دنیائے حواس میں بڑا امتیاز کیا ہے۔ اس نے اس فرق کو دن کی روشنی اور شام کے جھٹ پٹے کے فرق سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے مطابق جو کچھ ہم حواس کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں وہ ایسا ہوتا ہے جیسے جھٹ پٹے میں کسی چیز کو دیکھا جائے جس چیز کا ادراک ہم شعور کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے دن کی روشنی میں اسے دیکھا جائے۔ اس نے بار بار ظاہری شکل اور حقیقت کے فرق پر زور دیا ہے۔ حواس کے ذریعہ ہماری رسائی محض ظاہری شکل کی دنیا تک ہو سکتی ہے لیکن حقیقت کی دنیا تک نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ مکمل حقیقت اچھائی ہے۔ سائنس، علم اور سچ تصورات کا جائزہ لیتے ہیں جو اچھائی کی طرح ہیں لیکن مکمل حقیقت محض اچھائی ہے۔ ہم حواس کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ غار میں رہنے والوں کی مشہور اخلاقی کہانی، جو اس نے جمہوریہ میں بیان کی تھی۔ اس کے فلسفے کا بیانِ آخر ہے۔ حالانکہ اس نے وجدانی اسباب کا ذکر نہیں کیا ہے جن پر اپنشد کے فلسفے کی بنیاد قائم ہے پھر بھی جس طرح وہ حواس کے ذریعے حاصل کیے جانے والے تجربات کے مقاصد کی تردید کرتا ہے وہ اسے حواس کی دنیا کی طرح علم باطن پر یقین رکھنے والوں کے رویّے کے بہت

علم باطن اور فلسفہ

قدیم ترین ہندوستانی فلسفہ اپنشدوں میں ملتا ہے اور اپنشدوں میں واضح متصوفانہ اور مذہبی رنگ ملتا ہے۔ اس واقعے کے بنا پر ہمیں زیلر یا ارڈمین کی طرح یہ غلط نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ قدیم ہندوستانی فلسفے کو تجربی یا عقلی فلسفے کے بیان سے خارج کر دینا چاہیے[4]۔ یہ سچ ہے کہ تصوف جب تک ایک فرد کا تجربہ رہتا ہے اس وقت تک ہم فلسفیانہ تفتیش کے امتحانوں کا اطلاق اس پر نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب اس قسم کے تجربے کی بنیاد پر فکر کا ایک منطقی نظام تشکیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کو نہ صرف فلسفے کے شعبے میں شامل کیا جانا چاہیے بلکہ اس کا ایک اہم جزو سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم اسے فلسفے کا نام نہیں دیتے ہیں تو پھر کیا کہیں گے۔

فلسفہ کیا ہے؟ زندگی اور وجود کی نوعیت کی تفتیش کا نام ہے فلسفہ۔ حقیقت کا جائزہ لینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک شروع بھی ہوتا ہے الہام و روایت سے اور ختم بھی اسی پر ہوتا ہے ہم اسے مذہب کہتے ہیں۔ دوسرے کا انحصار ہوتا ہے عقل اور فکر کے آزاد استعمال پر اور وہ فلسفہ کہلاتا ہے۔

فلسفیانہ تفتیش

قدیم ترین زمانے سے انسان نے اپنے مسائل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ استعمال کیا ہے۔ ایک گزرتا ہے انسان کی باطنی دنیا سے اور دوسرا خارجی دنیا ہے۔ ہندوستانی فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسان کی خارجی دنیا کے مقابلے میں اس کی داخلی دنیا پر زیادہ توجہ دی ہے۔ وہ مظہر کی تحقیق و تفتیش سے شروع کر کے داخلی حقیقت تک نہیں جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ داخلی دنیا کے ادراک سے شروع کر کے مظہر کی دنیا تک پہنچتا ہے۔ یہ طریقہ کار اپنشدوں کے فلسفے میں ظہور میں آتا ہے۔ یونان میں فلسفے کے قدیم تر دبستانوں نے بھی اسی قسم کا انداز اختیار کیا تھا یا کم از کم اسے عام انداز سے خارج نہیں کیا تھا۔ آرفی یا فیثاغوری فلسفے کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سقراط کا جدلیاتی طریقہ منطقی تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ ایک داخلی آواز اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ ہندوستانی فلسفے کی طرح کچھ یونانی فلسفیوں کا بھی پیغام تھا "خود کو پہچانو"۔ افلاطونی عینیت میں ہمیں تصوف کی آئندہ ترقی اور خودشناسی کے بھی جراثیم ملتے ہیں لیکن اس کے شاگرد

لیے فلسفیانہ ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی بات مسلم متکلمین کی تحریروں میں کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک عرب فلسفے کا تعلق ہے اگر ہم متکلمین کی ان تحریروں کو خارج کر دیں تو اس کا ایک ایسا دبستان خارج ہو جائے گا جس پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے۔ عرب فلسفیوں میں ابن سینا اور ابن الرشد کے نام مشہور ہیں لیکن وہ حقیقی عرب فلسفے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں حقیقت میں وہ ارسطو کے پیرو اور شارح تھے اگر ہم حقیقی عرب فلسفے کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان متکلمین کی تحریروں پر نظر ڈالنی چاہیے جن کا اکثر یونانی فلسفے کے مخالفین میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جدید عہد میں بشپ برکلے کا شمار فلسفیوں میں کیا جاتا ہے اور اس کی تحریروں کے ذکر کے بغیر فلسفے کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جاتی ہے جس نے فلسفیانہ استدلال شروع کیے تھے مذہب کی سچائی کو ثابت کرنے کی خاطر۔

زیلر کی یہ تنقید بھی بجا نہیں ہے کہ "ہندوستانی فلسفے کا ناتا کبھی مذہب سے نہیں ٹوٹا اور وہ کبھی آزاد نہ ہو سکا"[5] غالباً اس کے ذہن میں ویدوں کے عام تقدس کا خیال جاگزیں تھا اور شاید اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کم سے کم تین ایسے آزاد خیال دبستان بھی ہیں جو ویدوں کے تقدس کے منکر ہیں۔ بدھ مت، جین مت اور چارواک فلسفے اپنے نتائج کے لیے کسی سند یا روایت کے محتاج نہیں ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں راسخ العقیدہ دبستانوں میں بھی نیائے اور سانکھیہ فلسفے اکثر ویدوں کے تقدس کے تعلق سے محض زبانی جمع خرچ کرتے تھے۔ اس لیے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بدھ کے زمانے میں ہندوستانی فلسفہ مذہب سے آزاد ہو گیا تھا۔

ایک سوال اور

ہندوستان اور یونان کے درمیان فلسفیانہ روابط

ہے جس کا میں اجمالی ذکر کروں گا۔ اگر یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں یونان سے پہلے فلسفے کی ابتدا ہوتی تو کیا یہ سوچنا صحیح نہیں ہوگا کہ یونانی فلسفے کی ابتدا ہندوستانی فلسفے کے اثرات کی مرہون ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ نیل اور فرات کی تہذیبوں نے یونان کی تہذیب سے بہت پہلے نشوونما پائی۔ اس خیال کی وجوہ پائی جاتی ہیں کہ یونانی فلسفے نے پہلے پہل جو ترقی کی تھی اس میں ان تہذیبوں کے اثرات کارفرما تھے۔ کیا ہم ہندوستان اور یونان کے درمیان اسی قسم کے راست یا بالواسطہ

قریب لے آتا ہے۔

ہندوستانی اور یونانی فلسفے میں ایک اور مشابہت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاتا چاہیے۔ یونانی فلسفے میں "نوس" (ذہن) کا تصور ہندوستانی فلسفے کے "آتمن" کے تصور سے بہت مختلف نہیں ہے۔ افلاطون نے اناکساگورس کے تصورات کو رد کر دیا اور دونوں روحوں کے درمیان امتیاز کیا وہ ایک کو غیر فانی اور دوسری کو فانی سمجھتا ہے۔ فانی روح (غیر معقول روح) جسم کے اثر سے آزاد نہیں ہوتی ہے اور اس کو انا کہا جا سکتا ہے۔ غیر فانی روح کائنات کا تصور ہے اور جسم کے اثر سے آزاد۔ غیر فانی روح کو وہ "روح کلّی" کہتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم افلاطون کے فانی روح کے تصور کا مقابلہ غیر فانی روح کے تصور سے کریں تو وہ اس فرق سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا جو ہندوستانی فلسفہ "آتمن" اور "پرم آتمن" میں کرتا ہے۔

چنانچہ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ باطنی ہونے کی بنا پر اپنشد کے فلسفے کو فلسفے کے عام بیان سے خارج کر دیا جائے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہمیں یونانی فلسفے کے ایک بڑے حصے کو بھی خارج کرنا پڑیگا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفے کو غیر فلسفہ سے جو چیز ممیز کرتی ہے وہ موضوع نہیں بلکہ اس کا طریق استدلال اور منظر نامہ ہے۔ اگر کسی شخص کے اخذ کیے ہوئے نتائج کی بنیاد الہام کی سند یا انفرادی وجہ پر قائم ہے تو ہمیں اس کے تاثرات کو فلسفے کے بجائے الٰہیات یا تصوف کہنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ شعوری تشکیل کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وجود کے راز کو عقلی سطح پر حل کیا جانا چاہیے تو ہم اسے فلسفیوں کی صف سے علیحدہ نہیں کر سکتے ہیں چاہے مذہبی اور متصوفانہ عقائد ہی نے اسے متاثر کیوں نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفے کے کچھ اہم عناصر اس قسم کے مباحث سے اخذ کیے گئے ہیں۔

مسیحت اور اسلام میں کچھ ایسے دبستان وجود میں آئے جو فلسفے کو مذہب کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن عام اتفاق کی بنا پر ان کے مباحث کو بھی فلسفیانہ تحریروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ عقلی طریقوں کو استعمال کرکے معقولیت پسندوں کے حملوں کے خلاف مذہب کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ سینٹ آگسٹین اور بعد کے مسیحی متکلمین کے مباحث کو اس

سکندر کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس کے استاد ارسطو نے اس سے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کے علم کی نوعیت معلوم کرے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر کے حملے سے پہلے ہندوستانی حکمت اور دانائی کی شہرت یونان تک پہنچ چکی تھی۔ سکندر کی موت کے بعد اس کے متعلق افسانے گھڑے گئے جو یونانی میں لکھے گئے تھے۔ لیکن ان میں سے کچھ کے ترجمے سریانی میں اور بعد میں سریانی سے عربی میں ہوئے۔ ان میں ہندوستانی فلسفیوں سے اس کی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس نے ان سے فلسفیانہ مسائل دریافت کیے اور اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان میں فلسفے کی سطح یونان کے فلسفے سے اونچی ہے۔ ان کہانیوں کو تاریخی کہانیاں نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی حکمت و دانائی کی شہرت ان علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ یہ واقعہ اس کی شہادت مہیا کرتا ہے کہ اس قسم کی کہانیاں آزادی کے ساتھ تصنیف کی جاتی تھیں اور لوگ دلچسپی کے ساتھ انہیں سنتے تھے اور ان پر یقین کرتے تھے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ افسانے پہلی صدی قبل مسیح اور پہلی صدی عیسوی کے درمیان تصنیف کیے گئے تھے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں یونانی بستیاں بسانے کے اس کے عام طریقے کے مطابق سکندر نے دریائے سندھ کے کنارے پر بھی اس قسم کی بستیاں بسائی تھیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شک پرستی کے فلسفے کا بانی پیرہو (وفات ۲۷۵ قبل مسیح) اس فوج میں تھا جو اس کے ساتھ ہندوستان آئی تھی۔ سکندر کی وفات کے بعد سلوکس نکاٹر نے چندرگپت موریہ سے قریبی روابط قائم کر لیے تھے اور اس کے دربار میں میگستھینز کو اپنے سفیر کے طور پر بھیجا تھا۔ چنانچہ اشوک کے عہد سے پہلے ہندوستانیوں اور یونانیوں کے درمیان تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ان کے درمیان ذہنی لین دین بھی ہوا ہوگا۔ جہاں تک اشوک کا تعلق ہے ہمیں ایک کتبے سے جو ابھی تک موجود و محفوظ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بحر روم کے ممالک اور تمام یونانی بادشاہوں کو اپنے مبلغ بھیجے تھے حالانکہ بدقسمتی سے ان مبلغین کے تعلق سے کوئی ذکر مغربی تحریرات میں موجود نہیں ہے۔ اب ہم ان نتائج کی تلخیص پیش کریں جن کے حق میں شہادت ملتی ہے۔ اشوک کے کتبوں میں جن ممالک کا ذکر ملتا ہے وہاں بدھ دھرم کا پیغام یقینی طور سے پہنچ چکا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے آگے بھی یہ پیغام پہنچا ہو اس لیے کہ اس زمانے میں بدھ مت بڑا تبلیغی مذہب تھا۔

ناتے کا ثبوت نہیں فراہم کر سکتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے مورخوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے لیکن وہ کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ صحیح ہے کہ یونانی فلسفے کے کچھ قدیم ترین دبستانوں میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستانی انداز فکر سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں۔ ان مشابہتوں کی بنا پر خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ ہندوستانی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ اس کا خصوصی اطلاق آرفی مسلک پر ہوتا ہے۔ عام طور سے مورخین کا خیال ہے کہ اس میں ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو نظری صفات کے اعتبار سے غیر یونانی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایشیا سے حاصل کیا گیا ہے۔ آرفی مسلک کا مرکزی موضوع ہے نجات جسے جسم سے روح کی آزادی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ زیلر کا خیال ہے کہ اس تصور نے ہندوستان میں جنم لیا تھا لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یونانیوں نے اسے ایران سے لیا تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی یا موکش کا تصور زرتشت کے مذہب کا لازمی جز نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فرض کرنا بعید از عقل نہیں ہوگا کہ اس تصور نے ہندوستان سے یونان تک کا سفر کیا اور براہ راست یا بالواسطہ طور پر یونان کے قدیم دبستانوں کو متاثر کیا۔

یونان میں یہ ایک متفقہ خیال تھا کہ علم و فراست حاصل کرنے کے لیے مشرق کا سفر ضروری ہے بہت سے فلسفیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ علم کی تلاش میں انہوں نے مشرق کا سفر کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ڈیموقریطس نے مصر اور ایران میں بڑی مدت تک قیام کیا تھا۔ فیثاغورث کے لیے کہا جاتا ہے کہ جب وہ ساموس میں اپنے گھر سے روانہ ہوا تو مصر کا رخ کیا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سولن اور افلاطون نے بھی بڑے پیمانے پر مشرق کا سفر کیا تھا۔ اس لیے تعجب نہیں کہ فیثاغورث یا اس ابتدائی دور کے کسی دوسرے یونانی فلسفی نے ہندوستان کا سفر کیا ہو۔ لیکن اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی اس کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ فیثاغورث کے فلسفے میں کچھ ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو صریحاً ہندوستانی ہیں۔ ان میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ اس کا نام لیے بغیر اگر ہم اس کے فلسفے کو بیان کریں تو ہندوستانی فلسفے کا طالب علم اسے آسانی سے کسی ہندوستانی فلسفی کا بیان سمجھ سکتا ہے۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا اس سوال کا جواب ابھی تک تاریخ فلسفہ نہیں دے سکی ہے۔

بعد از مسیح زمانوں میں دو ادوار کا انتخاب کر لیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قبل مسیح دور میں اپنے ابتدائی مراحل میں یونانی فلسفہ شاید ہندوستانی فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ جہاں تک دورِ بعد از مسیح کا تعلق ہے اس کو تسلیم کرنے کی وجوہ پائی جاتی ہیں کہ ہندوستانی فکر کے کچھ پہلو یونانی علم سے متاثر ہوئے تھے۔

میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ عام فلسفے۔

یونان اور ہندوستان کی جامع تاریخ کی ضرورت پر میرے اصرار کی بنیاد ہے محض تاریخی ضرورت۔ اس میں کسی ملک یا کسی قوم کے حصے کو بڑھانے یا کم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جغرافیائی حدود کی بنا پر ہم نے انسانیت کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دنیا کے نقشے میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کو مختلف رنگوں سے ظاہر کیا ہے۔ لیکن انسانی علم کے نقشے کو مختلف رنگوں کے علاقوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ علم تمام حدود اور سرحدوں سے بالاتر ہوتا ہے دنیا کے کسی بھی حصے میں وہ پہلے ظہور میں آیا ہو وہ ہوتا ہے بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث۔ تمام انسان، چاہے ان کا ملک یا قومیت کچھ بھی ہو، اس کے دعوے دار ہونے کا مساوی حق رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ان کی سوانح عمری کے تعلق سے اہم ہو سکتا ہے کہ سقراط یونان میں پیدا ہوا تھا اور اپنشدوں کے مصنفین ہندوستان میں لیکن جہاں تک انسانی علم کی تاریخ کا تعلق ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ سچ ہے کہ سقراط یونانی تھا اور اپنشدوں کے مصنفین ہندوستانی۔ لیکن انہوں نے انسانی علم میں جو اضافہ کیا ہے وہ یونانی ہے نہ ہندوستانی۔ وہ تو پوری انسانیت کا ہے۔ اگر ہندوستان میں یونان سے پہلے فلسفہ شروع ہوا تو اس کی محض اتنی اہمیت ہونی چاہیے کہ فلسفے کی تاریخ بیان کرتے وقت ہم ہندوستان سے شروع کریں۔ لیکن اس سے ہندوستان کی اہمیت بڑھتی ہے نہ یونان کی شان و شوکت میں کمی ہوتی ہے۔ ایک عرب شاعر نے جو بات بنو عامر کے قبیلے کے متعلق کہی تھی ہم اس کا اطلاق انسانی علم پر بھی کر سکتے ہیں۔

لَا تَقُلْ دَارُهَا بِشَرْقِ نَجْدٍ   كُلُّ نَجْدٍ لِلْعَامِرِيَّةِ دَارُ

(مت کہہ کہ اس کا گھر نجد کے مشرقی خطے میں ہے، پورا نجد بنو عامر قبیلے کا گھر ہے)

موجودہ کتاب کی تالیف کی خاص خاص وجوہ میں سے ایک تو میں

عالمی فلسفہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ایک سبب اور ہے جو غالباً اہم تر ہے۔ ابھی تک فلسفے کو مختلف شعبوں میں بانٹنے کی بنا پر فلسفیانہ مسائل کا جائزہ حقیقی کلی نقطہ نظر سے نہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اشوک کے زمانے سے پہلے ہی ہندوستان کا اثر یونان تک پہنچ گیا ہو۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہندوستانی فکر اور کچھ قدیم یونانی دبستانوں اور خصوصیت کے ساتھ فیثاغورث کے فلسفے میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یا تو ہم یہ فرض کریں کہ یہ مشابہتیں محض اتفاقی تھیں یا ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان اور یونان کے درمیان روابط تھے۔ اس قسم کے روابط کا امکانی نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ ہندوستانی فکر کا اثر یونانی فکر پر پڑے اس لیے کہ ہندوستانی فلسفہ خاصی ترقی کر چکا تھا اور یونانی فلسفے کے ابتدائی دبستانوں کے مقابلے میں زیادہ مکمل تھا۔ یہ سب باتیں اس نظریے کی حمایت کرتی ہیں کہ ابتدائی یونانی فلسفے کی ترقی میں شاید ہندوستانی فلسفہ معاون ہوا تھا حالانکہ اس قسم کی مدد کی نوعیت اور وسعت کے متعلق ہمیں کوئی صحیح صحیح معلومات حاصل نہیں ہیں۔

میں نے ابھی تک جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق ہے یونانی فلسفے پر ہندوستانی فلسفے کے امکانی اثر سے۔ اب ہمیں اس سوال کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے یعنی ہندوستان پر یونانی فلسفے اور سائنس کے کوئی اثرات پڑے یا نہیں اور اگر پڑے تو وہ کیا تھے۔ اس کا ایسا تفصیلی بیان مشکل ہے جس کو تصفیہ کن کہا جا سکے۔ پھر بھی یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی میں فلکیات کے ہندوستانی علم پر یونانی علم فلکیات کا اثر پڑا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ کچھ یونانی اصطلاحات ہندوستان میں رائج ہو گئیں تھیں۔ ایک جانے پہچانے ہندوستانی جوتشی وراہمہر نے، جس کی وفات ۵۸۷ عیسوی کے لگ بھگ ہوئی۔ اپنی کتاب برہت سنگھیا میں یونان کے جانے پہچانے ماہرین فلکیات کا حوالہ دیا ہے۔ اس زمانے کے ایک اور مصنف نے، جس کا ذکر البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں کیا ہے، یونانی عالموں کی بڑی تعریف کی ہے ان تمام واقعات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تیسری صدی عیسوی کے بعد ہندوستان یونانی علم سے واقف ہو گیا تھا اور عالموں کے حلقے میں اس کا اثر محسوس کیا جانے لگا تھا۔ لیکن جہاں تک ہندوستانی فلسفے کے مختلف دبستانوں کا تعلق ہے یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ وہ یونانی فکر سے متاثر ہوئے بھی تھے یا نہیں اور اگر ہوئے تھے تو کس حد تک۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے نتائج قرین عقل ہوں گے اگر ہم قبل مسیح اور

کی کتاب کا پہلا اور آخری صفحہ گم ہو گیا ہے۔ ان صفحات کی تلاش کا نام ہے فلسفہ۔ تقریباً تین ہزار سال سے یہ تلاش جاری ہے لیکن گم شدہ صفحات ابھی تک ملے ہیں نہ اس کی امید ہے کہ آئندہ کبھی مل سکیں۔ فلسفے کی تاریخ اس تلاش کی رُوداد ہے۔ حالانکہ اس میں مقصد حاصل کرنے کی بات نہیں کہی گئی ہے پھر بھی سفر و تفتیش کی دلکش کہانی ضرور سنا رہی ہے۔

فلسفے کے زائرین کو منزل تک پہنچنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن سفر کے دوران انہیں ایک اور بڑی قیمتی چیز مل گئی۔ فلسفے کی تلاش میں انہوں نے سائنس کو دریافت کر لیا۔ سائنس نے انسان کو ایک نئی طاقت سے تو نوازا مگر چین و اطمینان نہیں مہیا کر سکی۔ وہ پہلے تو تعمیر کا آلہ کار بن کر ظاہر ہوئی لیکن اب تباہی کا ہتھیار بننے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے جب فلسفے کو انسانی امن کے مسئلے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتا ہے اور اس امن کو دوبارہ دریافت کر لیتا ہے جسے انسان نے کھو دیا ہے تو اس کے باوجود کہ گم شدہ دو صفحات تحریر نہ کر سکے انسانیت کے لیے ایک نئی کتاب تصنیف کر دے گا۔ اس وقت ایک اور فارسی شاعر کے الفاظ میں اسے یہ کہنے کا حق حاصل ہو گا۔

رہرواں را خستگی راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

(جو اس راستے پر چلتے ہیں وہ کبھی نہیں تھکتے ہیں اس لیے کہ عشق راستہ بھی ہے اور منزل بھی)

لیا جا سکا ہے۔ فلسفے کی تاریخیں موجود ہیں جو ایک ملک یا ایک دور کے متعلق ہیں لیکن ایسا کوئی مطالعہ موجود نہیں ہے جو ہر ملک اور ہر دور کی فلسفیانہ ترقیوں کا احاطہ کرلے۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے فلسفے کی ایسی تاریخ لکھنے کا جس میں ہندوستان، چین اور یونان کی اور قدیم، وسطی اور جدید ادوار کی دین کو شامل کیا جائے۔

فطرت کی قوتوں پر بڑھتے ہوئے کنٹرول کی بنا پر مختلف خطّوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ اس طرح مختلف تہذیبیں بھی ایک دوسرے کے قریب آگئی ہیں۔ قربی روابط نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن میں مختلف لوگوں کی ذہنی کاوشوں کو انسانی علم کے مشترکہ سرمائے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مختلف تہذیبوں کے نقاط نظر کی بنیادیں جن مختلف اصولوں پر قائم ہیں ان کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے فلسفے کے کام میں ان کی بنا پر آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک عالمی فلسفے کا ارتقا محض نظریاتی دلچسپی کا باعث نہیں بلکہ ایک بڑی عملی ضرورت ہے۔

اس نقطۂ نظر سے بھی فلسفے کی تاریخ دوبارہ لکھی جانی چاہیے۔ مختلف قوموں اور مختلف ادوار کی دین کو نہ صرف پوری طرح تسلیم کیا جانا چاہیے بلکہ مشترکہ عالمی فلسفے کے ارتقا میں اس کو مناسب مقام ملنا چاہیے۔ مثال کے طور پر علم کے مسئلے کے مطالعے میں ہم نے ابھی تک ہندوستانی مفکرین یا یونانی ماہرین علمیات یا عرب فلسفیوں کے خیالات پر غور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے فلسفیانہ مسئلوں پر خود ان کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے قومی یا جغرافیائی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ اب ہم اس مسئلے کے حل کی ایسی کوشش کریں جو ان مختلف نظاموں کی حاصل کردہ بصیرتوں پر بھی غور کرے۔ محض اس طرح ہم حقیقی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے فلسفے کے مسائل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں

یہ سچ ہے کہ موجودہ کتاب میں اس ملحض نقطۂ نظر سے فلسفے کے مسائل کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ کم از کم اس میں اس علم کو ایک مشترکہ تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مختلف قوموں نے مختلف ادوار میں حاصل کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ ایک کتاب میں جمع کیا جانے والا یہ مواد فلسفے کی عالمی تاریخ لکھنے کی طرف پہلا قدم ثابت ہوگا جو موجودہ زمانے میں انسانیت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا واحد طریقہ ہے۔

اختتامیہ: یہ تعارف ایک فارسی کے شعر سے شروع کیا گیا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ وجود

تہذیبی بصیرت

سنگیت ناٹک اکیڈیمی

للت کلا اکیڈیمی

ساہتیہ اکیڈیمی

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

"آرٹ اس وقت تک ملک میں پوری طرح فروغ نہیں پاسکتا جب تک ، غیر سرکاری ادارے اس کی ترقی میں کوشاں نہ ہوں۔ اس لیے ان اکیڈیمیوں کے قائم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ گو انہیں ، حکومت نے قائم کیا ہے مگر یہ اس کی مداخلت کے بغیر خود مختار ادارے کی طرح کام کریں گی۔"

حواشی

۱۔ عرب مصنفین نے دو واضح اقسام کی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ایک قسم محض سوانحی ہے فلسفیوں کی زندگیوں کا حال ان میں بیان کیا گیا ہے اور ان کے فلسفوں کا بیان محض ضمنی ہے۔ دوسری قسم کی کتابوں میں اصل توجہ دی گئی ہے فلسفہ کے دبستانوں پر اور محض ضمنی طور سے سوانح بیان کی گئی ہے۔ پہلی قسم کی کتابوں کو "تاریخ حکما" یا "تاریخ الفلسفہ" کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کو "کتاب الملل والنحل" یا "الآرا والمقالات"۔ کچھ کتابوں میں فلسفے کے خصوصی ادوار کا جائزہ بھی لیا گیا تھا چنانچہ الفرابی نے (ولادت ۹۲۵ء) ایک کتاب لکھی جس میں ارسطو سے پہلے اور ارسطو کے بعد کے فلسفے کا جائزہ لیا گیا تھا۔ غالباً ہم ان مطالعوں کو فلسفے کی باقاعدہ تاریخ لکھنے کی پہلی کوشش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

۲۔ تاریخ فلسفہ جی۔ بی۔ ارڈمین (صفحہ ۹)

۳۔ تاریخ فلسفہ فرینک تھلی (صفحہ ۳)

۴۔ تاریخ فلسفہ جی۔ بی۔ ارڈمین (صفحہ ۱۳)

بی۔ زیلر۔ یونانی فلسفے کی اجمالی تاریخ (صفحہ ۲)

۵۔ یونانی فلسفے کی اجمالی تاریخ بی۔ زیلر (صفحہ ۲)

۶۔ یونانی فلسفے کی اجمالی تاریخ بی۔ زیلر (صفحہ ۱۶)

۷۔ "ملک معظم کی رائے میں یہ سب سے بڑی فتح ہے۔ یعنی قانون کے ذریعے فتح ملک معظم نے یہ بھی کہا ہے خود اپنی سلطنت میں اور چھ سو لیگ تک پھیلے ہوئے آس پاس کے تمام علاقوں میں وہاں تک جہاں یونانی بادشاہ انٹیاکس رہتا ہے اور انٹیاکس کے علاقے سے آگے جہاں وہ چار بادشاہ رہتے ہیں جن کے نام ہیں ٹولیمی، انٹیگونس، مگاس اور سکندر .... اور اسی طرح بادشاہ کی سلطنت میں یونانوں کے درمیان (یعنی پنجاب کے یونانی)

اقتباس در بیون، سلوکس کا خاندان، جلد ۱، (صفحہ ۲۹۸)

اس کی مکمل ترقی اور نشو ونما کے لیے ناکافی تھیں اور پھر شاہی نظام کے ختم ہو جانے کے ساتھ وہ سرپرستی جو اس کے تحت فنون لطیفہ کی ہوتی تھی وہ بھی باقی نہیں رہی۔ جمہوری نظام میں فنون لطیفہ کا فروغ عوام کی دلچسپی سے ہوتا ہے اور ریاست کی سرپرستی سے جو عوام کی خواہشات کا منظم اظہار ہے اس لیے اس کو فروغ دینا حکومت کی ذمہ داریوں میں سب سے مقدم ہے۔

ایک دہائی سے پہلے سے روشن خیال عوام نے اس حقیقت کو جان لیا تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۶ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ایک خاص تجویز کے ذریعے یہ خیال پیش کیا کہ ایک نیشنل کلچرل ٹرسٹ قائم کیا جائے جو ایک آزاد اور خود مختار ادارہ ہو اور اس کے سپرد ملک کی تہذیب کے فروغ دینے کا کام کیا جائے۔ یہ ٹرسٹ تین اکیڈمیوں پر مشتمل ہو۔ ایک ادبی اکیڈمی جس کا تعلق ہندوستانی زبانوں، ادب، فلسفہ اور تاریخ سے ہو دوسری آرٹ اکیڈمی (جس میں گرافک، پلاسٹک اور سلائڈ آرٹ بھی شامل ہوں گے) اور فن تعمیر کی ہوگی۔ تیسری اکیڈمی رقص، ڈرامہ اور موسیقی سے متعلق ہوگی اس کے ساتھ یہ منشا ظاہر کیا گیا کہ ان اکیڈمیوں کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ ثقافت کے سارے شعبوں کا انتظام کریں اور اس کے معیار کو بہتر بنائیں۔

ہندوستانی تہذیب کی روح یہ ہے کہ وہ اپنے میں دوسری تہذیبوں کے عناصر کو جذب کر کے ایک امتزاج پیدا کرتی رہی ہے اور اس کا اظہار موسیقی سے بہتر اور کسی میدان میں نہیں ہوتا۔

عہد وسطی میں ایرانی اور کلاسیکی ہندوستانی موسیقی کے مختلف نمونوں سے جو موسیقی وجود میں آئی، اس میں ان دونوں کی نزاکت و نفاست موجود ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوستانی موسیقی ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اس لیے مسلمانوں کو ہندوستانی موسیقی کی امتیازی خصوصیات کو دریافت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف اسے اپنا لیا بلکہ اس کے بعد ہندوستان میں ان دونوں کا الگ الگ ارتقاء ہونے کے بجائے ان دونوں کے ملاپ سے جو موسیقی وجود میں آئی تھی اس کو فروغ ملا اور یہاں تک یہ اپنی لطافت اور نزاکت میں اپنے

تہذیبی بصیرت*

آزادی کے حصول کے بعد وہ مسائل جن پر فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ سرگرمیوں کی تجدید کی جائے۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں فنون لطیفہ کو چاہے وہ رقص ہو یا ڈرامہ، موسیقی ہو یا ادب وہ توجہ اور مدد نہیں ملی جو اس کے مکمل ارتقاء کے لیے ضروری تھی۔ ؎

یہ صحیح ہے کہ ہندستان میں نشاۃ ثانیہ انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہو گیا تھا مگر اس کا آغاز سماج کے دباؤ سے ہوا تھا اور اس میں کسی حد تک ریاست کا بھی ہاتھ تھا۔ اسی لیے نہ اس میں گہرائی تھی نہ اس کے نتائج دوررس تھے جیسا کہ اس صورت میں ہوتا جب ریاست سے اسے خاطر خواہ مدد ملتی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فنون لطیفہ کی مختلف اصناف کی ریاستی سطح پر حوصلہ افزائی ہوئی قدیم روایت کو ختم کر دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستانی ریاستیں جو تقریباً ہندستان کے تہائی حصے پر مشتمل ہیں انھوں نے علاقائی سطح پر اپنے اپنے یہاں ان فنون لطیفہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ مگر ان کی کوششیں

---

* مولانا میں جو ثقافتی بصیرت تھی اس کے نتیجے میں تین اکیڈمیاں وجود میں آئیں سنگیت کلا اکیڈمی ساہتیہ اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ اقتباس ان تینوں تقریروں سے اخذ کیا گیا جو مولانا نے اکیڈمیوں کے افتتاحی جلسوں میں کی تھیں مجموعی طور پر یہ ایک کلچرل فورم کی نمائندگی کرتی ہیں جو فنون لطیفہ کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس "SPEECHES OF MAULANA AZAD" سے لیے گئے ہیں جو پبلیکیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا نے مرتب کی ہے۔

؎ استقبالیہ خطبہ جو سنگیت ناٹک اکیڈمی نئی دہلی میں ۲۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو دیا گیا۔

ڈرامہ کے سلسلے میں یونانیوں کا سرچشمہ کوئی بھی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ڈرامے کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں کوئی ان کا ہم سر نہیں ہے گو ان معاملات میں مقابلے کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کالی داس کا شمار یونانی ڈرامہ نگاروں کی صف میں ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھبھوتی بھاس اور بھان بھٹ نے ہندوستانی ڈرامے کا معیار اس قدر بلند کر دیا ہے کہ وہ کسی طرح بھی یونانی ڈرامہ سے کم نہیں ہے۔ جہاں تک ڈرامہ کی تھیوری کا سوال ہے اس میدان میں بھی ہندوستانیوں کی خدمات نمایاں ہیں جو آج بھی قابل تقلید سمجھی جاتی ہیں۔

رقص کے میدان میں بھی ہندوستانی رقص کے تنوع نے ہمیشہ آرٹ و کلچر کے طالب علموں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے خالص ہندوستانی کلاسیکل رقص کا ارتقا مندروں میں ہوا ہے جس میں اظہار کے لاتعداد طریقے۔ اتار چڑھاؤ، حیرت انگیز موزونیت سر تال اس سرزمین کے مختلف علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندوستانی رقص کے تنوع اور نزاکت کی مثال دنیا بھر میں شاید ہی کہیں ملے۔ اس روایت کا تسلسل اور توانائی جس کا اظہار آج تک ہو رہا ہے۔ قابل تعریف ہے۔

رقص، موسیقی اور ڈرامے کی یہ قیمتی میراث ہے۔ اس کو فروغ دینا اور اس میں اضافہ کرنا ہے۔ اپنے لیے ہی نہیں ہمیں اس لیے بھی یہ کرنا ہے" یہ انسانیت کی میراث ہے"۔

یہ بات آرٹ کے میدان سے زیادہ اور کہیں صادق نہیں آتی۔ باقی رکھنے کے معنی تخلیق کرنا ہے۔ ان اکیڈمیوں کا یہی مقصد ہوگا کہ وہ منظم اداروں کے ذریعے ہماری ان روایات کا تحفظ کریں اور ان کو فروغ دیں[1]۔ یہاں ہندوستان میں ہم نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آرٹ فرد اور قوم دونوں کی تہذیب کا ایک لازمی جز ہے۔ ہماری سیدھی سادی دیہاتی عورتیں کس خوبصورتی سے اپنا سے اپنے گھروں کو سجاتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے کاریگر ہیں جو کپڑے میں ایسے ڈیزائن بنتے ہیں کہ جن پر یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں

ا۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی کے جلسۂ افتتاحیہ کا خطبہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

اصلی سرچشموں سے سبقت لے گئی۔

امیر خسرو کا نام ہندوستانی تاریخ کے طالب علم کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے اگرچہ وہ ایک عظیم شاعر تھے مگر ان کے غیر معمولی اختراعی ذہن کی فنون لطیفہ کے شعبوں پر بھی گہری چھاپ ہے۔ ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے انہوں نے نئے نئے راگ ایجاد کیے ایمن ترانہ قول ہندوستانی سازگری سہلا اور دوسرے راگ جو آج بھی کروڑوں ہندوستانی گاتے ہیں اور جو ان کی غیر معمولی ذہانت اور امتزاج پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت کی زندہ مثال ہیں۔ سازوں میں "ستار" ان ہی کی ایجاد ہے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ "وینا" بہت لمبا چوڑا پیچیدہ ساز ہے تو انہوں نے اسے آسان بنانے کے لیے اس کے تاروں کی تعداد کم کر کے صرف تین کر دی "ستار" لفظ فارسی کا ہے جس کے معنی تاروں کے ہیں۔ اسی لیے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔ یہ نام اس حقیقت کا شاہد ہے۔

موسیقی کو بھی انہوں نے اس طرح سادہ اور آسان بنا دیا۔ جے پور کے راجہ سلطان شرقی موسیقی کے بہت دلدادہ تھے انہوں نے ہندوستانی موسیقی میں "خیال" کو رواج دیا "دھرپد" کے قدیم کلاسیکی انداز بہت مشکل اور بے لوچ تھے جس سے جذبات کا روانی سے اظہار بہت مشکل تھا۔ انہوں نے "خیال میں "دھرپد" کی شان کو تو باقی رکھا مگر اس کی سختی کو ختم کر دیا اور یہ اس طرح ہندوستانی موسیقی کا سب سے پسندیدہ راگ بن گیا۔

جذب کرنے کی کیفیت اور امتزاج ہندوستانی سازوں کے ارتقاء میں بھی نظر آتا ہے۔ مختلف قسم کے تان پورے ایران میں مقبول تھے۔ ہندوستان نے انہیں اپنی ضرورت کے مطابق تبدیلیوں کے ساتھ اپنا لیا ایک اور ایرانی ساز "قانون" ہے جسے آجکل کشمیری لوگ بجاتے ہیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی مثالیں موسیقی سے بہتر اور کہیں نہیں ملتی ہیں، تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کی ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں نے موسیقی کو اس کمال پر پہنچا دیا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی اس کے مدِّمقابل ہو۔

جائے یا احساسات کی تہذیب کے لیے یا بچے کی تخلیقی کاموں کو کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے یا ہاتھ کے کاموں میں مہارت پیدا کرنے کے لیے دی جائے تعلیم کے لازمی جز کی حیثیت سے اسکی اہمیت مسلم ہے۔

کچھ عرصے سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ مختلف ہندستانی زبانوں کے ادب کے فروغ کے لیے کون سا بہترین طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ ریاستیں اس سلسلے میں اپنے طور پر کام کر رہی ہیں۔ مگر میرے خیال میں کچھ ایسے اقدام ہونے چاہئیں جس سے پورے ہندوستان کی سطح پر مختلف زبانوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو اور ان کے کاموں کا اعتراف ہو۔

ساہتیہ اکیڈمی کا مقصد ہے کہ وہ عوام کے ادبی ذوق کی تربیت کرے اور ادب کی ترقی میں معاون ہو، اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ ہم ادب کا معیار رکھیں اس لیے ہندوستانی ادیبوں کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ساری کوششیں بہترین ادب کی تخلیق میں صرف کریں جو انسانی میراث میں ایک اضافہ سمجھا جائے۔

کچھ حضرات نے جن میں ایک حد تک ہمارے وزیر اعظم بھی شامل ہیں، اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اکیڈمیاں حکومت کی طرف سے نہ بنائی جائیں ان کے نزدیک یہ اوپر سے مسلط کرنے والی بات ہوگی۔ ان کے خیال میں اکیڈمیوں کو لوگوں کی طرف سے بننا چاہیے اور اس کے لیے حکومت کو انتظار کرنا چاہیے کہ ملک اتنی ترقی کرے کہ انجمنیں یا افراد جن کے پاس ضروری اختیارات ہوں اکیڈمیاں قائم کریں اور جب اس طرح اکیڈمیاں قائم ہو جائیں گی تو حکومت کا صرف یہ کام رہ جائے گا کہ ان کو تسلیم کرے مجھے افسوس ہے کہ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سے یورپ میں متعدد اکیڈمیاں قائم ہوئی ہیں۔ آج مغربی دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں ایک یا اس سے زیادہ اکیڈمیاں قائم نہ ہوئی ہوں یہ سب اکیڈمیاں حکمرانوں کے نمائندوں، یا آئین کے تحت حکومتوں نے قائم کی ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستانی حکومت اکیڈمیوں کے قیام میں بڑھ کر حصہ نہ لے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اکیڈمیوں کے قیام کے

---

1. للت کلا اکیڈمی کے جلسے میں دیے گئے خطبہ سے ۵ راگست ۱۹۵۴ء

کے تربیت پائے ہوئے ماہر کاریگر رشک کرتے ہیں۔ اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ ہمارے ملک ہندوستان جیسے غریب ملک کے عوام میں آرٹ کا یہ ذوق کیسے پیدا ہوا؟ تو میرے ذہن میں اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری مذہبی عمارتوں کی عظیم الشان فن تعمیر اور مجسمہ سازی کی بدولت۔ قدیم ترین دور سے مندروں میں صرف عبادت ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ حسن و خوبصورتی کے مرکز بھی ہوتے تھے عہد وسطیٰ میں عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئیں جن میں شان و شوکت اور سادگی کا خوبصورت امتزاج تھا ایک آدمی دور تو کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ان شاندار آرٹ کے نمونوں کو مسلسل دیکھتے رہنے سے اس میں خالص نفیس ذوق پیدا ہو گیا ایک ملک جس میں کنارک یا کھونیشور کا مندر یا تاج محل کی تعمیر ہوئی وہ صرف تخیل کی بلندی ہی نہیں بے مثال ہنرمندی کا بھی مظہر ہے۔ وہ ذہن جنھوں نے انہیں سوچا وہ ہاتھ جنھوں نے اس کی تعمیر کی وہ سرپرستی جس کی بدولت یہ عمارتیں وجود میں آئیں ان کی مدح سرائی ہم آج بھی کرتے ہیں اور بے اختیار اس کی داد دیتے ہیں۔

آج یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ کوئی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ انسان کے جذبات کی نشوونما اور تہذیب پر توجہ نہ دے اور اس کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوت ادراک کی تربیت کی سہولت مہیا کی جائے فنون لطیفہ کی کسی ایک شاخ کی مشق کرائی جائے اس عام سوال کے علاوہ کہ آرٹ کی تعلیم کے ذریعے انسانی شخصیت کے نازک اور لطیف پہلوؤں کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعے ہاتھوں کے کاموں میں مہارت حاصل ہوتی ہے بچے کی قوت تخیل کو عمل میں آنے کا موقع ملتا ہے۔ اب یہ بات مان لی گئی ہے کہ قبل ابتدائی یا نرسری کی سطح پر تعلیم دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچے کو رنگوں کو ملانے مختلف ساخت اور سائز کی چیزوں کو پہچاننے اور اس سے کچھ چیزیں بنانے کی تربیت دی جائے اس سے بچے کی تخلیقی جبلت آسودہ ہو گی اور اس کی غیر ضروری قوت کا رخ توڑ پھوڑ کے بجائے تخلیقی کاموں کی طرف ہو جائے گا اور اس طرح کا تعمیری رویہ وہ آگے چل کر سماج میں بھی اپنائے گا اور تہذیب و شائستگی سیکھے گا۔ اس لیے آرٹ کی تعلیم چاہے جذبات کی تربیت کے لیے کی

کے لیے ان کی مرضی کے مطابق تھی۔ مگراب ہندوستان آزاد ہے۔ اسے صحیح طور پر اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ دنیا کے سامنے آنا چاہیے

۱۹۴۹ء میں ہم نے اس مسئلے کو اٹھایا اور اپریل ۱۹۵۰ء میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن قائم ہوئی اس کے دستور میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ سب غیر ملکیوں میں ہندوستانی ثقافتی تعلقات کو فروغ دیگا اور اس کا دائرہ عمل پوری دنیا تک پھیلا ہوا ہوگا۔ یہ بات صاف ہے کہ جو کام اتنے بڑے پیمانے پر ہونا ہے وہ ایک دم تو ہو نہیں سکتا اس کی ابتدا کرنے سے پہلے اس بات کی یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ اس کی ابتدائی کوششیں رائگاں نہیں جائیں۔ اس لیے ہم نے کونسل کے کاموں کو مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے کام کا آغاز ہم نے مڈل ایسٹ ترکی اور مصر سے کیا۔

کچھ دوست مجھ سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کونسل کے کام کا آغاز اس مخصوص ڈویژن سے ہی کیوں ہوا؟ سوال بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ بھی صاف ہے آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان کو آزادی تقسیم کی شرط پر حاصل ہوئی ہے جس کے نتیجے میں فرقہ پرستی اور نفرت کی فضا پیدا ہو گئی پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو بڑی تعداد میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ان کو قتل کیا گیا اور ہندوستان میں لاتعداد مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سرحدوں پر مہاجرین کا ایک جم غفیر تھا۔ بیرونی دنیا کے سامنے یہ تلخ حقیقتیں معروضی طور پر پیش کی جاتیں تو ہمیں کوئی شکایت نہیں تھی مگر افسوس یہ ہے کہ نئے تشکیل شدہ ملک پاکستان نے ان کے سامنے تصویر کا ایک ہی رخ پیش کیا اور ہندوستان کے خلاف غلط پروپگنڈے کی مہم شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ملکوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ ہندوستان کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوئی ہے اور اب ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے ان کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ اب ہندوستان میں جو مسلمان باقی ہیں ان کو نہ شہری حقوق حاصل ہیں نہ مذہبی آزادی اب مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن کے قیام کے فوراً بعد

لیے اس بات کا انتظار کیا جائے کہ نچلی سطح سے قائم ہو، تو یہ انتظار ہمیں قیامت تک کرنا ہوگا۔[1]

یہ بات ہمیشہ سے میرے ذہن میں ہے کہ آرٹ کے فروغ میں حکومت کا رول ضمنی ہونا چاہیے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کو آرٹ کے فروغ میں گہری دلچسپی لینی چاہیے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آرٹ اس وقت تک پوری طرح فروغ نہیں پاسکتا جب تک غیر سرکاری ادارے اس کی ترقی میں کوشاں نہ ہوں۔ اسی لیے ان اکیڈمیوں کے قائم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ گو کہ انہیں حکومت نے قائم کیا ہے مگر یہ اس کی مداخلت کے بغیر خود مختار ادارے کی طرح کام کریں گی۔ حکومت نے انہیں قائم کیا ہے اس لیے کوئی تو آگے بڑھتا۔ اکیڈمیاں قائم ہو گئیں حکومت کا کام ختم ہو گیا اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس کے ممبران کی حیثیت سے پورے ملک کے ادیبوں میں تخلیقی تحریک پیدا کریں۔[2]

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تو زیادہ تر لوگوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں دنیا کے دوسرے ملکوں سے قریبی ثقافتی تعلقات قائم کرنے چاہئیں اور اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کام کو مناسب طور پر کرنے کے لیے ایک ادارے کی ضرورت ہے جو دنیا میں ہندوستان کی ثقافتی لحاظ سے نمائندگی کر سکے۔ اس کا سب سے بڑا کام یہ ہو کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ہندوستان کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، ان کو دور کرے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ پچھلی دو صدیوں سے ہندوستان آزاد نہ ہونے کے سبب سے جدید دنیا کے اسٹیج پر اپنا کوئی رول ادا نہیں کر پایا۔ اس عرصے وہ انگریزوں کے زیر حکومت تھا۔ اس لیے وہ دنیا کے سامنے اسی طرح پیش ہوا جیسا انگریزوں نے چاہا۔ ظاہر ہے کہ یہ نمائندگی خود ہندوستان کی نہیں تھی۔ بلکہ انگریز حکومت کے مقاصد کو پورا کرنے

1۔ ساہتیہ اکیڈمی کے پہلے جلسے کی تقریر سے ۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۵۴ء

2۔ للت کلا اکیڈمی کے افتتاحیہ جلسے کے خطبہ سے ۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء

پارلیمانی تقریریں

"میں نے آج سے چالیس سال پہلے اپنی زندگی کا پروگرام ملک کی خدمت کا بنایا تھا۔ یہ میں بات کہہ رہا ہوں ۱۹۰۷ء کی جب میری عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ تھی اور جب میں بنگال کی ریوالیوشنری پارٹی میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے کہ جو دنیا کے سامنے ہے۔ کوئی خواہش اب میرے اندر نہیں ہے۔ زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو گیا، جو تھوڑا باقی ہے۔ وہ نہ معلوم کب ختم ہو جائے گا۔"

صورت حال میں ڈرامائی تغیر ہوگیا ہے اور ان سب ملکوں نے اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ ان کے یہ تعصبات اور غلط فہمیاں بالکل بے بنیاد تھیں۔ انہوں نے یہ بھی جان لیا ہے ہندوستانی حکومت صرف ہندوؤں کی حکومت نہیں یہ سب ہندوستانیوں کی حکومت ہے۔[1]

[1] آئی سی سی آر کے جلسۂ عام کی تقریر سے ۱۴۔ فروری ۱۹۵۸ء

چاہیے۔ برٹش گورنمنٹ نے یہ سسٹم اس لیے جاری نہیں کیا تھا کہ ملک کے عوام کو تعلیم دی جائے۔ بلکہ اس لیے جاری کیا تھا کہ ان کو خاص طرح کے انگریزی جاننے والوں کی اپنے دفتر کا کاروبار چلانے کے لیے ضرورت تھی اس کے لیے انھوں نے یونیورسٹیاں قائم کیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم قائم نہیں رہ سکتی تھی جب تک کہ سیکنڈری ایجوکیشن بھی نہ ہو اور پرائمری ایجوکیشن نہ ہو۔ اس لیے سیکنڈری ایجوکیشن کی تعلیم قائم کی گئی۔ لیکن وہ صرف اس لیے قائم کی گئی تھی کہ یونیورسٹی میں جانے کا ایک ذریعہ "مینس" ہے۔ یہ نہیں سوچا گیا کہ ملک کے لاکھوں، کروڑوں باشندے جو یونیورسٹی تعلیم تک نہیں جا سکتے ان کے لیے سیکنڈری ایجوکیشن محض تعلیم میں ایک "مینس" کی جگہ نہیں رکھے گی بلکہ "اینڈ" ہو گئی اور اس لیے سیکنڈری ایجوکیشن کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیے اور اس میں ایسا ایلیمنٹ ہونا چاہیے کہ جو سو میں نوے آدمیوں کے لیے تعلیم میں "اینڈ" کا کام دیں، محض "مینس" کا کام نہ دے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہماری تعلیم کا پورا سسٹم غلط ہو گیا بہرحال سب سے زیادہ ضروری چیز یہ تھی کہ سیکنڈری ایجوکیشن کے متعلق انکوائری کی جائے اور اس کے بعد سیکنڈری ایجوکیشن کو نئے سرے سے آرگنائز کیا جائے۔ چنانچہ کمیشن قائم کیا گیا۔ نو مہینے کے اندر اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اب وہ رپورٹ سینٹرل ایڈوائزری بورڈ کے سامنے آئی۔ سینٹرل ایڈوائزری بورڈ نے نومبر میں ایک کمیٹی قائم کی کہ وہ اس رپورٹ پر غور کرے۔ اور غور کرنے کے بعد جنوری میں بورڈ کے جلسہ کے سامنے اپنی سفارشیں رکھے۔ چنانچہ جنوری میں بورڈ کا پھر جلسہ ہوا۔ اس کے سامنے وہ سفارشیں آئیں۔ بورڈ نے ان کو منظور کیا اور منظور کرنے کے بعد اپنا پروگرام بنا لیا۔ یہ کہہ دینا کہ جہاں تک ایجوکیشن کے ریفارمس کا تعلق ہے کچھ نہیں ہو رہا یہ بالکل غلط اور بے معنی ہے اور یہ بھی ایک آج کل فیشن ہو گیا ہے کہ جو شخص کھڑا ہوتا ہے۔ نہایت ہی سستی سی بات سامنے رکھ لیتا ہے کہ ایجوکیشن کا سسٹم ٹھیک نہیں ہے۔ ریفارم ہونا چاہیے۔ لیکن باتوں کے طوطا مینا بنانے سے تو کچھ ہوتا نہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ ریفارم ہو تو کس طریقے سے ہو۔ ایجوکیشن منسٹر نے اس پر غور کیا اور یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ جو پروگرام اس نے اس وقت ریفارم کا اپنے سامنے رکھا ہے وہ ہی صحیح پروگرام ہے اور ہمیں اسٹیٹ گورنمنٹوں نے پوری طرح سے کوآپریشن دیا تو ہم تھوڑے عرصے کے اندر سیکنڈری ایجوکیشن

پارلیمانی تقریر*

جناب! پرسوں بحث میرے دوست آچاریہ کرپلانی نے شروع کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ تعلیم کا جو سسٹم اس وقت ملک میں جاری ہے وہ نیچے سے لے کر اوپر تک درست نہیں ہے اور اس میں ریفارمس ہونے چاہئیں۔ جس وقت انھوں نے یہ بحث شروع کی تو مجھے خیال ہوا کہ غالباً وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایجوکیشن منسٹری نے ادھر ریفارم کا جو قدم اٹھایا ہے اور ابھی جنوری میں سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے جو کارروائیاں کی ہیں اس بارے میں کچھ اپنی تجویزیں پیش کریں۔ لیکن مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انھوں نے یہ کہا کہ ہم نے ایک کمیشن بٹھایا تھا یونیورسٹی ایجوکیشن کے لیے۔ پھر ایک کمیشن بٹھایا گیا سیکنڈری ایجوکیشن کے لیے اور اب شاید چند دنوں کے بعد ایک کمیشن بٹھایا جائے گا پرائمری ایجوکیشن کے لیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ جس ڈھنگ پر ایجوکیشن کا کام کررہی ہے اس کا انہیں کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔ شاید انھیں موقع نہیں ملتا کہ وہ ان چیزوں کو پڑھیں ورنہ ان کا کہنا کہ اب ایک کمیشن بٹھایا جائے گا، ابتدائی تعلیم پر غور کرنے کے لیے کتنا بے معنی ہے۔ کیونکہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے آج نہیں آج سے پانچ برس پہلے گورنمنٹ یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ وہ بیسک پیٹرن کی ہوگی۔ تمام اسٹیٹ گورنمنٹوں نے یہ چیز منظور کرلی ہے اور اسی پر عمل کررہی ہیں۔ اب جو سوال تھا وہ یونیورسٹی ایجوکیشن اور سیکنڈری ایجوکیشن کا تھا۔ یونیورسٹی ایجوکیشن سے بھی زیادہ اہم سوال تھا سیکنڈری ایجوکیشن کا۔ کیونکہ حقیقتاً اصلی خرابی جو ہمارے موجودہ سسٹم میں ہے وہ ہم کو وہیں ڈھونڈھنی

---

* ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ کو جب مولانا اپنی منسٹری، منسٹری آف ایجوکیشن، نیچرل ریسورسز اور سائنٹفک ریسرچ کے لیے پارلیمنٹ میں گرانٹ کا مطالبہ کر رہے تھے اسی دوران اپنی منسٹری کے خلاف الزامات کے جواب میں یہ تقریر انھوں نے لوک سبھا میں کی تھی۔

کریں۔ پہلے انہوں نے ایجوکیشن منسٹری کے خلاف اپنے دماغ میں ایک مخالفانہ نقشہ بنایا اور نقشہ بنانے کے بعد اب وہ اپنا ایک کیس بنانا چاہتے ہیں اور اس کا میٹیریل جمع کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط ہو۔ چنانچہ میں ابھی آپ کو بتلاؤں گا کہ انہوں نے کیا نقشہ بنایا۔ نقشہ یہ بنایا کہ ان ایجوکیشن منسٹر کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں جب بحث شروع ہوئی تھی تو وہ ہندوستانی کے حق میں تھے چنانچہ اب بھی ایجوکیشن منسٹر جو کچھ کام کر رہے ہیں جو کچھ مدد دے رہے ہیں وہ ہندی کے لیے نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہندوستانی کے لیے دے رہے ہیں۔ یہ انہوں نے نہیں بتایا....

شری ٹنڈن : مولانا مجھے معاف کریں اگر میں ان سے کہوں کہ جس ناپ تول کے ساتھ میں نے کہا تھا، آپ بھی ذرا اسی ناپ تول سے بات کیجیے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ہندی نہیں چاہتے۔ میں نے تو کچھ سینس آف پرو پورشن کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ اُدھر زیادہ جھکاؤ ہے۔ ایک محض غصہ میں اپنی تول نہ چھوڑ دیجیے۔ تول رکھیے اور تول رکھ کر بات کیجیے۔

مولانا آزاد : میرے غصہ کی فکر مت کیجیے۔

مولانا آزاد : ٹنڈن جی نے ابھی یہ کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایجوکیشن منسٹری ہندی کے لیے کچھ نہیں کرتی۔ ہندوستانی کے لیے کرتی ہے۔ بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ ایجوکیشن منسٹری کا زیادہ جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ یہ از سر تا پا غلط ہے۔ اس کے لیے انہوں نے دلیل کیا پیش کی۔ آپ یہ بات دیکھیں کہ کہاں تک دیانت داری کے ساتھ انہوں نے اپنا نقشہ بنایا۔ دلیل میں انہوں نے پہلی چیز یہ پیش کی کہ ایجوکیشن منسٹری واردھا کی ہندوستانی پرچار سبھا کو مدد دے رہی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ہندوستانی پرچار سبھا کے نام میں ہندی کا لفظ نہیں ہے۔ ہندوستانی کا لفظ ہے۔ اس کو ایجوکیشن منسٹری مدد دے رہی ہے۔ تو سننے والوں کے دماغ پر یہی اثر پڑے گا کہ واقعی ایجوکیشن منسٹری کا جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستانی پرچار سبھا واردھا کو مدد دے رہی ہے۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ اس کے اندر ایک پُرفریب تخیل ہے۔ واقعہ کیا ہے

کو ری آرگنائز کریں گے اور اس کے بعد جہاں تک یونیورسٹی ایجوکیشن کا تعلق ہے اس کے لیے بھی ضرورت تھی کہ کوئی نہ کوئی ایجنسی ایسی قائم ہو کہ جس کے ذریعہ سے ضروری ریفارمس پریکٹس میں لائے جائیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن مقرر کیا جا چکا ہے۔ وہ کام شروع کر دیا گیا ہے اور امید ہے کہ جہاں تک یونیورسٹی ایجوکیشن کا تعلق ہے اب نہایت تیزی کے ساتھ اس طرف قدم اٹھے گا۔

اس کے بعد شری پرشوتم داس ٹنڈن نے تقریر کی۔ چونکہ ایجوکیشن ریفارمس کا تذکرہ شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی کچھ الفاظ اس بارے میں کہے۔ لیکن دراصل ان کا اصل مقصد وہ نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ میں ان سے بھی کہوں گا کہ جہاں تک ایجوکیشن ریفارمس کا تعلق ہے آپ اپنے دماغ کو تکلیف نہ دیجیے۔ اسے دوسروں کے لیے چھوڑ دیجیے۔ . . .

شری ٹنڈن (ضلع الہ آباد مغربی) : مگر دوسرے بہت غلط سوچ رہے ہیں۔ چھوڑ کیسے دوں۔

مولانا آزاد : اسے بھی دوسروں پر چھوڑ دیجیے۔ دوسرے موجود ہیں جو غلطی کو پکڑیں گے۔ اس کے لیے آپ نہیں ہیں۔

مولانا آزاد : بہر حال وہ ہندی کے مسئلہ پر اور دراصل اس کے لیے وہ تیار ہو کر آئے تھے۔ ہندی کے متعلق میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ایک اہم معاملہ ہے۔ کانسٹی ٹیوشن میں اس کا بھروسہ دلایا گیا ہے کہ پندرہ سال کے بعد انگریزی ہٹے گی اور اس کی جگہ ہندی زبان دیوناگری اسکرپٹ میں آئے گی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر غور کریں۔ میں نہایت خوش ہوتا اگر شری ٹنڈن ہمیں بتلاتے کہ ایجوکیشن منسٹری نے جو پروگرام اپنے سامنے رکھا ہے اور کاموں کا جو ایک نقشہ بنایا ہے اس کے متعلق ان کی کیا تجویز ہے۔ وہ اپنی کچھ تجویزیں پیش کرتے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس طریقے سے انہوں نے اس بحث کو شروع کیا، شروع ہوتے ہی یہ چیز بالکل واضح ہو گئی کہ ان کے سامنے یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی کنسٹرکٹو تجویز پیش

راجندر پرشاد نے اس کی میٹنگ بلائی۔ ایک یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کو قائم رکھا جائے۔ یہ کام نہ روکا جائے۔ یہی رائے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تھی اور دوسرے ممبروں کی بھی کہ یہ گاندھی جی کی یادگار ہے۔ اس کو قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اس کو قائم رکھا گیا۔ پھر اس کے بعد اس کا ایک جلسہ ہوا اس میں یہ سوال اٹھا کہ اس کی آمدنی کا ذریعہ جو تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اگر اس کو قائم رکھنا ہے تو اس کو مدد ملنی چاہیے۔ چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس چیز پر گورنمنٹ کی توجہ دلائی ہیں نے پوچھا کہ ہمیں معلوم ہو کہ کیا اسکیم ہے اور کتنے روپیوں کی ضرورت ہے۔ تو ایک اسکیم بنا کر پیش کی گئی تھی جس کے لیے بہت زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ کہا گیا کہ دہلی میں اس کا آفس لایا جائے۔ اس کے ساتھ ایک پریس بھی ہو۔ جس کے معنی تھے کہ کئی لاکھ روپے کی نان ریکرنگ اور تقریباً ایک لاکھ روپے کی ریکرنگ مدد کی جائے۔ ایجوکیشن منسٹری نے اس سے انکار کیا لیکن اس سے اس نے اتفاق کیا کہ اس کو قائم رکھنے کے لیے جو ضروری رقم ہو۔ گورنمنٹ آف انڈیا اس کو دینے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک رقم منظور کی گئی۔ یہ بات بھی آپ یاد رکھیے کہ اگرچہ اس کا نام ابھی تک ہندوستانی پرچار سبھا ہے۔ لیکن پریکٹیکلی کام وہ جو کچھ کر رہی ہے ہندی کے لیے کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ رقم منظور کی گئی۔ اب میں پوچھتا ہوں اپنے دوست سے کہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی نسبت کیا سمجھتے ہیں۔ وہ ہندی کے وِرودھی ہیں یا حامی۔ وہ ہیں اس کے چیرمین اور جو اس کے اور ممبر ہیں وہ کیا ہیں۔

مولانا آزاد: بہرحال جس چیز پر میں آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں تک ہندی پرچار سبھا کا تعلق ہے جو مدد اس کو دی گئی اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ ایجوکیشن منسٹری کا جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے ہندی کی طرف نہیں ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی باڈی ہے جو خاص حالت میں قائم کی گئی تھی۔ سمجھا گیا تھا کہ یہ گاندھی جی کی یادگار ہے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے یہ کہا تھا کہ میں اس کو ہمیشہ قائم رکھوں گا چاہے میں تنہا ہی رہ جاؤں اس لیے یہ مناسب نہیں سمجھا گیا کہ اس کو ختم کیا جائے۔ اور جو وہ کام کرتی ہے۔ ہندی کے لیے کرتی ہے ہندوستانی کا سوال نہیں ہے۔ تو میں یہ توجہ دلانا چاہتا تھا کہ جو میرے دوست نے یہ زور دیا

میں آپ کو بتلاتا ہوں

ڈپٹی اسپیکر صاحب، وزیر تعلیم کو مجھ سے سبق لینا پڑے گا کہ لفظ کیسے بولنا چاہیے پُرفریب کا لفظ میرے لیے استعمال کرتے ہیں۔ غلط ہے۔ پُرفریب وہ بول رہے ہیں۔

مولانا آزاد: بحث میں پُرفریب کا لفظ کہنا ہرگز پارلیمینٹ کی زبان کے خلاف نہیں ہے۔ پُرفریب کے معنی یہ ہیں کہ بحث میں ایک شخص کہہ سکتا ہے دوسرے آنریبل ممبر نے ایک چیز کو جس روپ میں پُٹ کیا ہے اور پیش کیا ہے وہ صاف نہیں۔ پُرفریب ہے۔ پُرفریب کے معنی یہ ہیں کہ ذرا صفائی نہیں ہے۔ اور اس لیے میں یہ نہیں مانتا کہ اس لفظ کا کہنا پارلیمینٹری زبان کے خلاف ہے۔ بہرحال مجھ کو اس لفظ پر اصرار نہیں ہے۔

مولانا آزاد: میں سمجھتا ہوں کہ ہر ممبر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بحث کے متعلق یہ کہے کہ یہ بحث اس شکل میں کی گئی ہے۔ یا صحیح طریقہ پر کوئی چیز نہیں پیش کی گئی ہے۔ یہ بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ دیانتداری کے ساتھ نہیں پیش کی گئی۔ اس کا جواب دینا چاہیے کہ دیانتداری کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

مولانا آزاد: بہرحال مجھے کسی خاص لفظ پر اصرار نہیں ہے۔ اگر یہ الفاظ استعمال نہ کرنے چاہئیں تو میں اس پر اعتراض نہیں کرتا۔

مولانا آزاد: آپ غور کیجیے کہ ہندوستانی پرچار سبھا جو ہے اس کا معاملہ کس طرح منسٹری کے سامنے آیا۔ یہ سبھا دراصل گاندھی جی نے بنائی تھی۔ جیسا کل شری ٹنڈن جی نے بیان کیا کہ جب گاندھی جی کا ہندی ساہتیہ سمیلن سے اختلاف ہوا آپ ان سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے ایک سبھا بنائی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس کے چیرمین ہوئے کاکا صاحب کالیلکر اور بہت سے دوسرے لوگ اس کے ممبر ہوئے۔ گاندھی جی کی زندگی میں ہی جتنے آدمی گاندھی جی کی طرف دیکھنے والے تھے ان کی بڑی تعداد اس کی ممبر تھی۔ جب گاندھی جی کا انتقال ہو گیا تو ڈاکٹر

کہ پارٹیشن کے بعد اب ہندوستان کی ایسی حالت ہوگئی ہے کہ وہاں کوئی اس طرح کی سوسائٹی زندہ نہیں رہ سکتی۔ تو میں نے بھی انھیں سے اتفاق کیا کہ... ۱۰ کی ایک نان ریکرنگ گرانٹ لمپ سم میں اس کو دی جائے۔

اب میں اس طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کیونکہ اس معاملے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہونا چاہیے کہ اس طرح کی باتوں میں ہمارا دماغ کس طرف جاتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ سینٹرل گورنمنٹ قریب ساڑھے چودہ کروڑ روپیہ ہر سال خرچ کرتی ہے۔ تو اس رقم میں سے جو کہ ایجوکیشن منسٹری خرچ کرتی ہے اگر ایک مرتبہ ..... ۱۰ روپے کی رقم اردو کی ایک سوسائٹی کو دے دی گئی تو کیا یہ کوئی ایسی چیز ہے کہ اس پر اس درجہ شکایت کی جائے اور اس کی اتنی مخالفت کی جائے۔ غور کریں کہ ہمارا دماغ کتنا تنگ ہے کہ ہم اس ملک کی ایک دوسری زبان کو اگر..... ۱۰ روپیہ دیا گیا تو ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور اس کی ہم شکایت کرتے ہیں۔

اردو زبان کسی ایک مذہبی گروپ کی زبان نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو بولتے ہیں ان میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں۔ عیسائی بھی ہیں۔ لیکن میں اس میں نہیں جانا چاہتا۔ مان لیجیے کہ صرف مسلمان ہی اردو بولتے ہیں گو کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ پھر بھی آخر ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں۔ اگر ایسی سوسائٹی کو جو اردو زبان کی ایک قیمتی خدمت انجام دے رہی ہے ایک مرتبہ ..... ۱۰ روپیہ دیتے ہیں تو یہ کون سی ایسی چیز ہے جس کو اس قدر محسوس کیا جائے۔ اور یہ شکایت کی جائے کہ یہ اسلامک کلچر کی ترقی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ یہ جو انہوں نے اس کی شکایت کی تو کیا اس وجہ سے کہ ان کو ہندی کی محبت ہے۔ نہیں۔ ہندی سے کس کو اختلاف ہے۔ ہندی کی محبت میں اور ہندی کو ترقی دینے میں تو سب ایک رائے ہیں۔ تو وہ اس لیے یہ نہیں کہتے کہ ان کو ہندی کی محبت ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ دوسری کوئی زبان آگے بڑھے۔ یہ جذبہ کام کر رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اپنا قد اونچا کر لیجیے لیکن آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے۔ اپنے قد کو اونچا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسروں کو ٹھگنا بنایا جائے۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ کوئی

اور یہ نتیجہ نکالنا چاہا کہ ایجوکیشن منسٹری کا جھکاؤ ہندوستانی کی طرف ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

شری اے پی سنہا: ہم نے ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس کی تقریروں کو خاموشی سے سنا، پھر یہ حضرات محترم وزیر کی تقریر کیوں نہیں سن رہے ہیں۔ (ڈپٹی اسپیکر صاحب کو مخاطب کر کے) جناب! اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ ایوان کو محترم وزیر کی تقریر سننے کا بھی موقع دیں۔

مولانا آزاد: اس کے بعد پھر ٹنڈن جی نے ایک دوسری آئٹم کا ذکر کیا اور اس پر بہت زور دیا۔ وہ یہ کہ شبلی اکیڈمی کو اس برس ....۱۰ روپیہ کی نان ریکرنگ گرانٹ دی گئی ہے۔ یہ اکیڈمی کوئی ۳۰، ۴۰ برس سے قائم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے جتنی کتابیں شائع کی ہیں اردو زبان میں کی ہیں اور اس کی کتابوں کو گاندھی جی نے پسند کیا تھا۔ اس کی سرپرستی کی تھی اور کئی آرٹیکل اس کے متعلق لکھے تھے۔ بہرحال اس نے اردو زبان میں ایک مفید اور قیمتی کام کیا ہے۔ چونکہ شبلی اکیڈمی میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ کانگریس موومنٹ میں شریک تھے۔ تو کانگریس کے لوگوں سے بھی ان کی ملاقات اور ملنا جلنا ہے۔ کچھ آٹھ مہینے ہوئے کہ وہ بطور ایک ڈپوٹیشن کے پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس آئے اور انھوں نے اپنی اکیڈمی کی حالت بیان کی اور یہ کہا کہ پارٹیشن کے پہلے ان کی زیادہ تر کتابیں پنجاب اور سندھ میں جاتی تھیں۔ اب وہ بند ہو گئی ہیں۔ اور روپے کی قلت کی وجہ سے بھی بڑا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر اس کو کوئی فوری مدد نہیں ملتی ہے تو اس کو ہم بند کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہوں نے فوری مدد مانگی۔ یہ نہیں کہا کہ ہم کو ریکرنگ گرانٹ دی جائے اور ہر برس مدد دی جائے انہوں نے کہا کہ ہمارے نے شمار اور فگرس اس طرح کے ہیں کہ اگر ہم کو....۱۰ کی مدد مل جائے تو ہم ایڈجسٹ کر لیں گے اور یہ سوسائٹی قائم رہ جائے گی۔ پرائم منسٹر نے ایک چھٹی فائننس منسٹری کو لکھی اور ایک چھٹی ایجوکیشن منسٹری کو لکھی۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سوسائٹی قائم رہے اور اسی طرح کام ترقی رہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہو گی کہ اس تھوڑی سی رقم کی وجہ سے یہ مجبور ہو کر بند ہو جائے۔ اس لیے اس پر غور کرنا چاہیے۔ منسٹری نے بھی اس وقت یہ خیال کیا کہ یہ چیز بہتر نہیں ہے۔ اگر یہ تھوڑی سی رقم اس کو نہ دی گئی تو یہ سوسائٹی بند ہو جائے گی اور پاکستان بھی اس کا پروپیگنڈا کرے گا

مجھ سے یہ بھی خوش رہے وہ بھی خوش رہے۔ میری منسٹری نہ چلی جائے۔ میرے نزدیک کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے آج سے ۴۰ برس پہلے جب ان چاروں طرف بیٹھنے والے لوگوں کا پتہ بھی نہیں تھا۔ میں نے ۴۰ سال پہلے اپنی زندگی کا پروگرام ملک کی خدمت کا بنایا تھا۔ یہ میں بات کہہ رہا ہوں ۱۹۰۷ء کی جب میری عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ تھی اور جب میں بنگال کی ریوالیوشنری پارٹی میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے کہ جو دنیا کے سامنے ہے۔ کوئی خواہش اب میرے اندر نہیں ہے۔ زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو گیا۔ جو تھوڑا باقی ہے وہ نہ معلوم کب ختم ہو جائے گا۔ کیا چیز ہے کہ جس سے مجھے غرض ہو۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ جب ایک شخص نے غرض اپنے اندر سے نکال دی تو وہ بے پناہ ہو جاتا ہے "بے پناہ" آپ سمجھے؟ نہیں سمجھے۔ بے پناہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔ کیونکہ ہتھیار کی کاٹ جو چلتی ہے وہ اس جسم پر چلتی ہے۔ اس باڈی پر چلتی ہے کہ جس کے اندر غرض ہو۔ غرض کی کمزوری پر۔ اگر غرض نہیں ہے تو کوئی اس کو نہیں کاٹ سکتا۔ بلکہ میں آپ سے صاف صاف کہوں گا کہ ہندوستان پر۔ ملک پر جو مصیبت آئی۔ ٹو نیشن تھیوری اور پاکستان بنانے کا پوائنٹ آف ویو۔ اور پھر پاکستان کا بننا۔ اس مصیبت کی جتنی ذمہ داری گمراہ مسلمانوں پر اور مسلم لیگ پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس طرح کے دماغوں پر بھی ہے۔

کیونکہ آپ اس طرح ایک تنگ دلی کی جگہ اختیار کرتے ہیں کہ دوسری زبان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوسری جماعت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوسروں کے حقوق کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کو کہ جو الگ ہونا چاہتے ہیں ان کو موقع ملے گا اور وہ ایکسپلائٹ کریں گے اور کہیں گے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کیسے دے سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس چیز کا میں نے مقابلہ کیا۔ میں نے کہا کہ ہندوستان کا ہندو دماغ جو ہے۔ ہندو مائنڈ جو ہے وہ اس طرح کے دماغ کو ریپریزنٹ نہیں کرتا ہے۔ اس کو گاندھی جی ریپریزنٹ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ میں نے اس چیز پر مسلمانوں کی توجہ دلائی۔ میں لڑا کئی لاکھ

ایک آدمی بھی ایسا نارتھ انڈیا میں نہیں ہے جو کہ ہندی کی ترقی نہ چاہتا ہو یا ہندی کا مخالف ہو۔ جہاں تک نارتھ انڈیا کا تعلق ہے جو لوگ خود ہندی نہیں جانتے وہ بھی اپنے بچوں کو ہندی پڑھاتے ہیں۔ اگر ہندی کی ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ وہ اس طرح کے دماغوں کی رکاوٹ ہے۔

ابھی ۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ مدراس میں ایک سوسائٹی تامل زبان کی اینسائکلوپیڈیا بنا رہی تھی اس نے گورنمنٹ آف انڈیا سے مدد کے لیے درخواست کی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے خیال کیا کہ یہ ایک مفید اور اچھا کام ہے۔ اور ۸۰۰۰۰ روپیہ اس کے لیے منظور کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت کیا شور مچا تھا اور کیا کیا کہا گیا۔ اب یہ چیز کہ ہم نے تامل زبان کی اینسائکلوپیڈیا کے لیے ۸۰۰۰۰ ہزار روپیہ دیا یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس پر کسی کو پریشانی ہو جاتی۔ لیکن اس کے اندر بھی یہی جذبہ تھا۔ ہندی کی محبت نہیں بلکہ یہ کہ دوسری زبانوں کو کیوں آگے بڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ چاہتے ہیں کہ وہ باقی نہ رہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہندی کی ترقی نہیں چاہتے۔ دوسری زبانوں کی گراوٹ چاہتے ہیں۔ یہ جذبہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جذبہ کی وجہ سے ہندی اس تیزی سے ترقی نہیں کر رہی ہے جس تیزی سے اس کو ترقی کرنی چاہیے۔ جو مخالفت آج ساؤتھ میں ہو رہی ہے اس کی تہہ میں کیا چیز ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم ہندوستان کی کسی بھی زبان کی مخالفت نہ کریں۔ ہم ہر زبان کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہاں اس کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ خیال ہے کہ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ہمارا فرض ہے اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اس پر قائم رہے اور وفاداری کے ساتھ ہندی کو اونچا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن یہاں اس طرح کی ایٹیٹیوڈ اختیار کی جاتی ہے جیسی کہ کل میرے دوست نے اختیار کی کہ اگر کسی سوسائٹی کو ۔۔۔۔ ہا کی رقم دی گئی تو انہوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ یہ سب اسلامک کلچر کے لیے کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں اسلامی کلچر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں لیپ پوت کی اور لپٹی باتیں کروں۔ لیپ پوت کی باتیں وہ کرتا ہے کہ جس کے اندر غرض ہوتی ہے

نہیں ہوں۔ میں اس ہال سے پانچ گز کی دوری پر بیٹھتا ہوں۔ آپ مجھ سے مل سکتے ہیں اور پوچھ سکتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک ہندی کی ترقی کا تعلق ہے ایجوکیشن منسٹری اپنی ڈیوٹی سمجھتی ہے۔ وہ اس ڈیوٹی میں کوتاہی نہیں کرے گی۔

مسلمانوں کے دماغ میں انقلاب پیدا کیا۔ لیکن بہرحال میں اس مسئلہ میں جذبات کو کنٹرول نہیں کرسکا۔ اس لیے میں آپ سے کہوں گا کہ ان چیزوں میں جب تک آپ اس طرح ایک تنگ دماغ بنا رکھیں گے آپ اپنے مقصد کو کامیاب نہیں کرسکتے بلکہ آپ کے مقصد کو روز بروز نقصان ہوگا۔

تو بہرحال۔ اب میں کچھ تھوڑا وقت آپ کا اور لوں گا۔ اس کے بعد سیٹھ گووند داس جی نے تقریر کی۔

انہوں نے تقریر کرنا شروع کی کہ ہندی کے راستہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مگر دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک تو انگریزی ہے اور انہوں نے کہا کہ جو لوگ انگریزی پسند کرتے ہیں میں ان کو میکالے کا پیدا کیا ہوا بچہ سمجھتا ہوں۔

مولانا آزاد: اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اردو۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اردو کا یہاں تعلق کیا ہے۔

مولانا آزاد: ایجوکیشن منسٹری کا جہاں تک تعلق ہے اس نے اردو کا سیکشن قائم نہیں کیا ہے۔ ہندی کا سیکشن قائم کیا ہے۔ جو اس کا پروگرام ہے وہ ہندی کے لیے ہے۔ اردو کے لیے نہیں۔ اردو کا کیا تعلق۔

اب میں اور وقت نہیں لوں گا میں آپ کو یقین دلاؤں تاکہ دو منٹ کے لیے بھی آپ یہ نہ سمجھیں کہ ایجوکیشن منسٹری نے اپنا دماغ بند کیا ہے۔ اس کا دماغ کھلا ہے۔ اس نے ہر کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرے گی۔ اس کی اصلاح کرنے یا اس کا سدھار کرنے کے لیے آپ جو تجویز پیش کریں گے وہ اس کو خوش دلی کے ساتھ ویلکم کرے گی۔ لیکن آپ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اگر آپ کو بدگمانیاں پیدا ہوں اور کچھ چیزیں سنائی پڑیں تو آپ میرے پاس آئیں میں دور

یونسکو سے خطاب

"یہ جدید زمانے کا عجب تضاد ہے کہ جبکہ ہر قوم امن کی خواہاں ہے اور امن کی باتیں کرتی ہے۔ تقریباً ساری حکومتیں امن کے استحکام کے مقابلے میں جنگ کی تیاریوں میں اپنے اخراجات زیادہ کر رہی ہیں۔"

حیثیت رکھنے والی اقوام ہیں۔ جو مشترک بھائی چارے اور برابری کے حصے دار ہیں۔ اور اسی وسیلے سے سچی بین الاقوامی مفاہمت ممکن ہو سکتی ہے۔ دنیا نے یہ تکالیف بیکار ہی نہیں برداشت کیں۔ جنگ کے دردزہ نے نئے ایشیا کو نیا جنم دیا ہے۔ اسی لیے آج ایشیا کے ایک دارالسلطنت میں جگمگاتے ستارے جمع ہیں۔ جہاں یورپ وامریکہ کے نمائندے افروایشیائی اقوام سے مساویانہ انداز سے دنیا کے مشترک مسائل پر سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور گفتگو کریں گے۔

میں ان تاریخی عوامل سے اچھی طرح آگاہ ہوں جن کی بنیاد پر مشرق ومغرب کے درمیان عداوت کی دیوار کھڑی کی گئی تھی وہ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔ ان کے درمیان تناؤ اور غلط فہمیوں کا سبب ہی باقیات ہیں۔ پرانے رویّے اور اقدار جنہوں نے ان کے درمیان اس دیوار کو اٹھایا اور مضبوط کیا تھا۔ ان کی گرفت سے انسانی ذہن آزاد ہورہا ہے۔ یہ بات اب عالم آشکارا ہے کہ دیر سویر ان کی جگہ جدید جمہوری اقدار لے لیں گی۔ نوآبادیاتی نظام پرانی دنیا کا ستون اور علامت سمجھا جاتا تھا۔ اب اپنا اعتبار کھوتا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس پر عمل پیرا ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس کے لیے معذرت خواہ نظر آتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ نے امن عالم کے لیے دو کارنامے انجام دیے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد صدر ولسن کی تصوریت کے نتیجے میں انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد صدر روز ویلٹ نے مسٹر چرچل اور مارشل اسٹالن کی مدد سے ریاستہائے متحدہ کا خیال پیش کیا۔ صدر ولسن نے اپنے ملک کی اندرونی حالت کے پیش نظر جہاں پر غالب رجحان منرو کے اصول کے تحت اس کو نظرانداز کرنے کا تھا اسی لیے ریاستہائے متحدہ نے لیگ میں شرکت نہیں کی۔ جس کے نتیجے میں لیگ کی لیڈرشپ انگلینڈ اور فرانس کو تفویض ہوئی جو خود نوآبادیاتی طاقتیں تھیں اور پھر جلدی ہی لیگ پر طاقتور ملکوں کی سیاست کا تسلط ہونا شروع ہوگیا۔ اس معزز مجمع کے سامنے مجھے اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح لیگ آف نیشن اس کے اثر سے آہستہ آہستہ آزاد ہوئی اور آخر کو اس سے پیچھا چھڑا لیا۔

انجمن اقوام متحدہ نے سماجی اور معاشی مسائل کو سلجھانے کے لیے مختلف کمیشن اور کمیٹیاں بنائیں مگر زیادہ تر زور سیاسی مسئلوں پر رہا۔ ریاستہائے متحدہ نے ابتداء ہی میں یہ محسوس کر لیا

یونسکو سے خطاب*

دوستو!

مجھے مسرت ہے کہ یونسکو کی جنرل کانفرنس کے نویں اجلاس میں حکومتِ ہند، ہندوستانی عوام انڈین نیشنل کمیشن اور اپنی طرف سے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملا ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ دعوت کہ یہ کانفرنس دہلی میں منعقد ہو۔ یونسکو نے قبول کرلی۔ دنیا کے کونے کونے سے مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں میں انہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں میں جن الفاظ سے آپ کا استقبال کررہا ہوں۔ وہ محض رسمی نہیں ہیں بلکہ وہ میرے دلی اور پرخلوص احساسات کا مظہر ہیں۔

یہ دوسرا موقع ہے جب یونسکو اپنی کانفرنس ایشیا میں کررہا ہے۔ اس کا تیسرا اجلاس ۱۹۴۸ میں لبنان میں منعقد ہوا تھا۔ یہ اجلاس گوکہ دہلی میں ہورہا ہے لیکن قوی امید ہے کہ اس کا حلقۂ اثر دور دور تک ہوگا اور پورے ایشیا میں اس کی گونج سنائی دے گی۔ خاص طور سے جنوبی مشرقی ایشیائی ممالک یونسکو کے مقاصد اور پروگراموں سے مستفید ہوں گے۔ ہم تھوڑی دیر کو پیچھے مڑکر دیکھیں اور چند دہائی پہلے کی دنیا کا تصور کریں تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ اس نوعیت کی کانفرنس کا ان دنوں منعقد ہونا ممکن نہیں تھا ان دنوں دنیا حصوں میں بٹی ہوئی تھی ایک نام نہاد برتر یورپی دنیا دوسرے افرو ایشیائی پسماندہ ممالک یہ تو موجودہ رہے ہیں پہلی جنگِ عظیم کے بعد دنیا کی یہ تقسیم ختم ہوئی۔ اس لحاظ سے کہ اب بلا امتیاز مشرق و مغرب دنیا کے سب ممالک ساتھ ساتھ ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتے ہیں۔

ایسا اجلاس کا جسے خوش قسمتی سے مجھے خطاب کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ پہلی جنگ سے پہلے ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہمارا شمار تب ایک کم تر فرقے اور غلام قوم میں ہوتا تھا۔ آج ہم آزاد اور مساوی

---

* یہ تقریر ۵ نومبر ۱۹۵۶ء میں یونسکو کے نویں جنرل سیشن میں کی گئی تھی۔

لیے ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہونے کی گارنٹی دی۔ یونسکو نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ اقتصادی ترقی بہت کچھ تعلیم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت پر منحصر ہے اسی لیے اس نے زیادہ سے زیادہ ممبر ریاستوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ جلدی اور تیزی سے ایسے پروگراموں کی توسیع کریں مجوزہ پروگرام میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ آئندہ دو سال میں یونسکو کی براہ راست مدد جنوبی امریکہ کو بہم پہنچائی جائے۔

یونسکو کی امداد کا ایک خاص اور اہم پروگرام پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں ٹیکنیکی تعلیم کی توسیع و اشاعت ہے۔

یونسکو نے بہت سعی و جستجو سے یہ دریافت کیا ہے پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی اصطلاحیں مبہم ہیں۔ ان کاموں میں دی جانے والی امداد اسی صورت میں موثر ہوگی، جب یہ لین دین دوطرفہ ہو۔ ہندوستان کے لیے مختلف میدانوں میں سائنٹفک اور ٹیکنیکی کاموں کے لیے یونسکو سے امداد ہم حاصل کرتے رہے ہیں مگر اب ہماری باری ہے کہ ہم اپنے یہاں سے تعلیم اور ثقافت کے ماہرین کو ان ملکوں میں بھیجیں جہاں ان کی خدمات کی ضرورت ہے یونسکو کی ٹیکنیکی امداد سے ملحق اس ضمن میں ایک اور اسکیم ہے یعنی کوپن سسٹم کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کی نصاب کی کتابیں اور دوسرا امدادی سامان فراہم کیا جائے۔ اس سے ہم کو جدید دور کے کرنسی قوانین کی پیدا کردہ رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔ یہاں اس ریسرچ کا ذکر بھی ضروری ہے جو یونسکو نے ان پروگراموں کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل کے سلسلے میں کی ہے۔ وہ پروگرام جو کئی سال پہلے شروع ہوئے تھے مگر ان میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اب تجویز ہے ان سب کاموں کو ایک بڑے منصوبے میں تبدیل کر دیا جائے۔

ایک دوسرا میدان جس میں یونسکو تیزی سے سرگرم عمل ہے وہ یہ کہ مختلف علاقوں اور افراد کے درمیان ایک اچھی تہذیبی مفاہمت کی اشاعت و توسیع۔ بین الاقوامی تناؤ اور غلط فہمیوں کا ایک سبب جہالت اور تعصب ہے۔ ایک صدی پہلے یورپی اقوام کا خیال تھا کہ تہذیب کا مطلب مغربی تہذیب ہے۔ مدتوں مغرب کی فوجی طاقت میں برتری کو اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی برتری سمجھا جاتا رہا۔ اب دنیا کی دو بڑی جنگوں کے تہلکوں اور نو آبادیاتی نظام کے رفتہ رفتہ زوال نے دنیا کے

تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک سماجی اور معاشی مسئلوں پر مناسب توجہ نہیں دے گا۔ اس نے ان کاموں کے کرنے کے لیے کچھ مخصوص ایجنسیاں قائم کیں ان میں یونسکو سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے دستور میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ کیونکہ ساری آویزشوں کی آماجگاہ انسانی ذہن ہے۔ اس لیے انسانی ذہن ہی ہے جس میں امن کے محافظ جذبوں کو ابھارا جانا چاہیے یہی یونسکو کا سب سے بڑا مقصد اور یہی اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

یونسکو کا قیام اب سے تقریباً ٹھیک دس سال پہلے ۴ نومبر ۱۹۴۶ء میں عمل میں آیا۔ یہاں یونسکو کے ان کاموں کا جائزہ لینا جو اس نے اپنی زندگی کے پہلے دہے میں انجام دیے اس وقت بے محل ہوگا۔ یہاں تو اس کے چند نمایاں کاموں کا سرسری جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ سب حضرات کو علم ہے یونسکو کا سب سے اہم کام اقوام عالم کے درمیان عدم مساوات کا قلع قمع کرنا ہے تاکہ دنیا کے سب مرد اور عورتیں حقیقی جمہوری ماحول میں رہ سکیں اس کے ساتھ ساتھ اس کو تعلیم سائنس اور ثقافت کی اشاعت میں اپنی کوششوں کو اس طرح تقویت دینی ہے کہ انسانی ذہنوں میں امن کے محافظ جذبوں کو زیادہ سے زیادہ تقویت ملے۔ یونسکو کے پروگراموں جو اس کے زیر نگرانی یا اس کی تحریک پر متعدد ملکوں میں چل رہے ہیں، ان میں سب سے مقدم اور نمایاں کام وہ ہیں جن کا تعلق تعلیم سے ہے۔ اس بات کو اب دنیا بھر میں مانا جا رہا ہے کہ تعلیم کے معنی صرف ذہن اور دماغ کی تربیت کرنا نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی مکمل شخصیت کی ترقی یا سماج کی معاشی اور سماجی ترقی کے حوالے سے معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح اس کے تصور میں وسعت پیدا ہونے کے باعث یونسکو نے جو تحقیقاتی ریسرچ کے کام کیے ہیں ان میں تعلیم بالغان کا کام بھی ہے۔ جس سے ہندوستان نے خاص طور سے فائدہ اٹھایا ہے اور اسی لیے ہم سوشل ایجوکیشن کا ایک پانچ نکاتی پروگرام ترتیب دے سکے جس کا مقصد لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مالا مال کرنا ہے۔ یونسکو نے نہ صرف ان تحقیقی کاموں کو کیا بلکہ اس نے بہت سے ممبر ممالک کی ان پروگراموں کو چلانے میں لوگوں کی ٹریننگ اور بین الاقوامی سطح پر ماہرین کی خدمات مستعار لے کر ان کی مدد بھی کی۔

ہم یونسکو کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اس نے دنیا کے سب بچوں کے

کا جو افراد اور اقوام کے درمیان تناؤ کا سبب ہیں جائزہ لے۔نسلی غرور آج بھی انسانیت کے ماتھے پر بہت بڑا کلنک ہے۔ یونسکو نے ہمیشہ نسلی غرور کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے۔ اس کے جائزوں نے مختلف مروج توہمات کو رد کیا ہے۔ باوجود اس کے پوری دنیا میں یہ تصور تیزی سے پھیل رہا ہے کہ اصل میں نسلی برتری یا کم تری کی کوئی بنیاد نہیں ہے لیکن دنیا کے کچھ حصے ایسے ہیں جہاں بدقسمتی سے اب بھی شدت سے نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ یونسکو کو چاہیے کہ یہ لعنت جہاں بھی ہے اس کے خلاف پوری طاقت سے اپنے بس بھر جہاد کرے۔

بین الاقوامی مفاہمت کی وسیع پیمانے پر توسیع کے سلسلے میں یونسکو جو کوشش کر رہا ہے اس ضمن میں اسے کچھ بنیادی سیاسی اور ثقافتی تصورات کے سائینٹفک جائزے بھی لینا چاہیے۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے انسانی حقوق کے موضوع پر ایک تحقیقی جائزہ لیا تھا جس سے انسان کے بنیادی حقوق کے اعلان نامے کو مرتب کرنے میں مدد بھی ملی۔ اس کے بعد اس نے اپنی تحقیق کا موضوع جمہوریت کو بنایا اور شاید پہلی بار سرمایہ دار اور کمیونسٹ ملکوں کے مفکر ایک ساتھ مل کر بیٹھے اور جمہوریت کے لازمی عناصر پر غور کیا اس کے دوسرے سروں نے آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد کی ہے۔ اور ایسے طریقوں کی نشان دہی کی جن میں مختلف زاویہ ہائے نظر کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر اظہار رائے کر سکتے ہیں۔

میں یونسکو کے کاموں کی تفصیلی فہرست پیش کر کے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے سرسری جائزے سے بھی یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ گو یونسکو سے جو توقعات تھیں ان کو وہ پوری طرح کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن اس نے جو کیا ہے وہ بہت کم بھی نہیں ہے ہمارے ارادے بلند ہیں اور رہیں گے لیکن یہ امر بھی ناگزیر ہے کہ ساری امیدیں پوری نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ تکمیل کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ منزل مقصود کی راہ میں تعصب کی دیواریں حائل ہیں بے اعتمادی ہے اور سب سے زیادہ مالی وسائل کی کمی ہے۔ اور ان حالات میں یونسکو جو بھی کر پائی اس پر بے اطمینانی کا کوئی سبب نہیں ہے۔

یہ جدید زمانے کا عجب تضاد ہے کہ جبکہ ہر قوم امن کی خواہاں ہے اور امن کی باتیں کرتی

لوگوں کے دلوں میں بڑی حد تک مساوات کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اور افراد کے درمیان یہ باہمی انسانیت کا جذبہ اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتا جب تک کہ مختلف ممالک کے لوگوں میں ایک دوسرے کی تہذیب سے واقفیت اور اس کا پاس نہ ہو۔ اسی لیے یونسکو کے پروگراموں میں وہ پروگرام جس میں وہ ثقافت کی توضیح کلاسیکل ادب کے تراجم آرٹ البموں کی طباعت موسیقی کی ریکارڈنگ اور ثقافت سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کے تبادلے کے ذریعہ کرتا ہے، دنیا کے مختلف لوگوں کے درمیان بین الاقوامی مفاہمت پیدا کرنے کا یہ سب سے اہم ذریعہ ہے۔ مجھے اس کی مسرت ہے کہ یونسکو کے مجوزہ کاموں میں اس پروگرام کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یونسکو تاریخ کی تدریس کے طریقوں پر بھی غور کر رہی ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں تاریخ اپنے قومی عروج اور عظمت کے بیان کو سمجھا جاتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہے کہ اپنے شاندار ماضی کا بیان اس طرح ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے کارناموں کا یا تو ذکر ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو ان کو کم کر کے پیش کیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں تو دوسرے ملکوں اور تہذیب کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا پروپیگنڈا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ابتدا ہی میں بچوں کو دوسرے ملکوں کو کمتر ثابت کر کے اپنی قوم کی شان و عظمت کا حال بچوں کو پڑھایا جائے گا تو ان کا زاویۂ نظر بین الاقوامی نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تر تاریخ اب تک آپس کی مخالفت اور آویزشوں پر زور دیتی رہی ہے۔ ایک عام رجحان یہ ہے کہ تاریخ میں افراد اور قوموں کا آپس میں مقابلہ کیا جائے بغیر اس لحاظ کے بنی نوع انسان کے وجود کی بقا کا سبب آپس کی عداوت اور دشمنی نہیں بلکہ باہمی تعاون ہے۔ یونسکو نے شروع سے ہی اس پر زور دیا کہ تاریخ کی تدریس کے نئے طریقوں کو رواج دیا جائے اور ان کو رائج کرتے وقت اس خامی کی طرف خاص طور سے دھیان دیا جائے جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا انسان کی سائنٹیفک اور ثقافتی تاریخ کا منصوبہ جب پایۂ تکمیل کو پہنچے گا تو پوری دنیا کے مردوں اور عورتوں کے درمیان بھائی چارے اور مفاہمت کے لیے یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس اہم جائزے کے علاوہ جو یونسکو مختلف زمانے میں انسانوں کے درمیان باہمی تعاون کے ضمن میں کر رہی ہے اس نے اپنے ہاتھ میں ایک اور بڑا کام لیا ہے وہ یہ کہ ان مخصوص تصوّرات

کو جنگ کی تیاریوں میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ ماضی میں ان تصادموں کا سبب معاشی ابتری اور ایک دوسرے کے علاقے پر قبضہ کرنے کی ہوس ہوتی تھی پہلے زمانے میں جنگیں دوسرے کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی ہوس مذہب یا نسل کی بنیاد پر ہوتی تھیں بعض صورتوں میں اپنی بقا کے لیے لڑتے تھے جب غذا کی کمی سے دوچار ہوتے تھے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگ روزگار کے وسائل کی فراہمی کی خاطر ملکوں ملکوں پھرتے تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں جو جنگیں لڑی گئیں ان کی بنیاد قومیت اور زبان تھی۔ پھر دنیا جلدی ہی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک وہ جن کے پاس سب کچھ تھا ایک وہ جن کے پاس کچھ نہیں تھا اور نوآبادیاتی آویزش کو بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد فروغ ملا۔

جدید زمانے میں جنگ کے یہ قدیم اسباب معدوم ہو گئے ہیں سائینٹفک اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو آزادی و آسایش سے رہنے کے وسائل حاصل نہ ہوں رہی آبادی کی بات تو اس پر کنٹرول رکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی تعلیم بہت اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ افراد و اقوام کے درمیان آویزش کے معاشی اسباب اب ختم ہو گئے ہیں اور نہ نوآبادیاتی نظام کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے یہ دنیا کے بہت حصوں میں ختم ہو گیا ہے۔ اور جہاں ہے وہ چند دن کا ہے جیسے جیسے خود اپنے ملک کی تعین حدود کو حمایت مل رہی ہے۔ جغرافیائی اور لسانی بنیادوں پر لڑائیاں اب نہیں۔

اگر لوگ معقول پسندی سے کام لیں تو موجودہ زمانے سے زیادہ امن کے لیے فضا کبھی سازگار نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج دنیا میں ہر طرف خوف اور ایک دوسرے سے بدگمانی تناؤ اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ آج کی اس صورت حال کا بنیادی سبب کیا ہے؟ میرے خیال میں آپ لوگ بھی اس سے متفق ہوں گے کہ آج کل تصادم نظریاتی بنا پر ہوتے ہیں یہ آویزش لوگوں کے ذہنوں میں مادی چیزوں کے لیے نہیں ہے۔ ہمارے ایک طرف سرمایہ داری ہے دوسری طرف اشتراکیت۔ نہ صرف یہ تقسیم قومیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ کسی حد تک اسی نظریاتی اختلافات نے انفرادی طور پر بھی انسانوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہر ملک میں ہمیں مخالف کیمپ کے حامی ملتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کشمکش کی حیثیت اندرونی تصادم کی بھی ہو گئی ہے۔ اور بین الاقوامی بھی۔ اور کوئی حیرت

ہے۔ تقریباً ساری حکومتیں اپنے اخراجات امن کے استحکام کے مقابلے میں جنگ کی تیاریوں میں زیادہ خرچ کر رہی ہیں۔ یونسکو کا بجٹ صرف ۱۰ کروڑ ڈالر ہے لیکن جب ہم ان اخراجات کا مقابلہ ان ہزاروں کروڑوں سے کرتے ہیں جو صرف ایک ملک کی جنگی اسلحہ سازی پر خرچ کرتا ہے تو ہم حیران ہو جاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا دنیا اجتماعی طور پر پاگل پن میں مبتلا ہو چکی ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ یونسکو کا بجٹ دس کروڑ ڈالر ہے تو ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا زیادہ تر حصہ انتظامی امور پر صرف ہو جاتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کوئی تنظیم اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک اس کو چلانے والے اشخاص نہ ہوں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتظامی امور پر اخراجات کے بعد یونسکو کے پاس اس کے اصلی کاموں کے لیے جو حصہ بچ جاتا ہے وہ بہت کم ہے۔ اگر ہمیں ستاروں کا نظارہ کرنا ہے تو ہمیں یقیناً دوربین کی مدد لینی ہوگی مگر ہمیں دوربین میں اس قدر منہمک نہیں ہو جانا چاہیے کہ ستاروں کا نظارہ ہی ہمارے نظاروں سے نہ اوجھل ہو جائے۔ اس سے قبل متعدد مواقع پر میں اس بارے میں گفتگو کر چکا ہوں اور بار بار اس کو دہرانا نہیں چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ یونسکو کے ممبران اس مسئلے کی اہمیت سے خوب آگاہ ہیں وہ بھی اسی پر متردد ہیں کہ ایسے کون سے اقدام اٹھائیں کہ یونسکو کے انتظامی امور کے اخراجات میں خاطر خواہ تخفیف ہو سکے۔ آج میری زیادہ تشویش کا باعث یونسکو کے بجٹ کا وہ حصہ نہیں ہے جو اس کے انتظامی امور پر خرچ ہوتا ہے بلکہ پوری دنیا کے بجٹ کا وہ حصہ جو یونسکو کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ یونسکو کے مقاصد کیا ہیں؟ تعلیم سائنٹیفک ریسرچ اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ سے پوری دنیا کے لوگوں کا معیار زندگی کو بلند کرنا۔ یونسکو کا ایک مقصد افراد و قوم کے درمیان عدم مساوات کو ختم کرنا بھی ہے جو اس جدید دور میں بھی عام ہے۔ یہ سب قوموں کا مشترکہ مقصد ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو قیمت ادا کرنا ہو اس میں سب قوموں کو برابر کا شریک ہونا چاہیے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں گو کہ ساری دنیا اس کو قبول کرتی ہے اور اس کو دور کرنا اپنا لازمی فرض جانتی ہے مگر اس سلسلے میں جو عملی اقدام کیے گئے ہیں۔ اس کے عملی ثبوت بہت کمیاب ہیں۔

اس کا سب سے بڑا سبب وہ حالات ہیں جن میں جنگ کے خوف سے سارے وسائل

اس کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ حقیقتوں کو تسلیم کیا جائے۔ ہم کھلے دل سے بغیر کسی ابہام کے یہ مان لیں کہ ان دونوں نظریوں میں سے کسی کو بھی دنیا سے نہ ختم کیا جا سکتا ہے نہ کچلا جا سکتا ہے۔ کوئی انسان جس میں ذرا بھی سمجھ ہوگی۔ ایک لمحے کو بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا کہ ریاستہائے متحدہ اور روس میں سے کوئی بھی اپنے مخالف نظریہ کو مان لے گا۔ درحقیقت نہ اب نہ کبھی دنیا میں نظریوں میں یکسانیت نہیں رہی ہے۔ صدیوں سے مختلف ممالک مختلف نظریوں کے حامل رہے ہیں تو پھر ہمیں موجودہ نظریاتی اختلاف کو قبول کرنے میں کیا قباحت ہے۔ جس طرح ہم نے مذہبوں اور عقیدوں کے اختلاف کو قبول کیا ہے؟

موجودہ جدید سرمایہ دارانہ سماج نے صنعتی انقلاب کے زمانے میں نشوونما پائی۔ اس نے غیر معمولی طور پر انسان کی قوت پیداوار کو بڑھا دیا مگر تقسیم کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کر پایا اور اس لیے ان مسائل کے نئے حل کی تلاش ہوئی اور اس کے نتیجہ میں اشتراکیت کے مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے اس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری نظام قدیم شکلوں میں اب بھی وہاں قائم ہے۔ پورا مغربی یورپ تیزی سے سماجی تسلط اور فلاحی قوانین کی طرف بڑھ رہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں پرائیویٹ ادارے اب بھی ہیں مگر پبلک کنٹرول نے جو حدیں قائم کر دی ہیں وہ ان میں رہ کر کام کر رہے ہیں۔ بظاہر صرف براعظم امریکہ میں سرمایہ داری نظام کے امکانات کافی روشن ہیں یہ صحیح ہے کہ امریکہ نے بہت سی تبدیلیوں کو دیکھا ہے اور سرمایہ داری کی کچھ نا مہذب شکلوں کو برداشت کیا ہے جس کی بنیاد محنت کشوں کے استحصال پر تھی لیکن پھر بھی سرمایہ دارانہ نظام میں پرائیویٹ ادارے اب بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہیں۔ یہاں لوگوں کی اکثر معاشرہ میں مروج نظام سے مطمئن معلوم ہوتی ہے۔ اس نے لوگوں کے معیار زندگی کو اونچا کر دیا ہے اور تقریباً اپنی پوری آبادی کو آرام و آسایش مہیا کرنے کی یقین دہانی کی ہے۔

اگر امریکہ میں سرمایہ داری نظام فروغ پا رہا ہے اور اس کو تبدیل کرنے کی نہ تو لوگوں کے دل میں خواہش ہے اور نہ اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ تو بالکل یہی روس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لوگوں نے جس بحران اور مسائل کا سامنا کیا ہے اس کا حل انہوں نے اشتراکیت کی صورت میں تلاش کیا ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زار کے دور حکومت میں روسی لوگوں کو جمہوریت کا اصلی تجربہ

کی بات نہیں ہے کہ موجودہ صورت حال کی وجہ سے ہر طرف تلخی کی فضا ہے۔ یہ تصادم نظریات کی بنا پر ہے اس سے نظریاتی سطح پر ہی برد آزما ہونے کی ضرورت ہے اس لیے یونسکو اس تصادم کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک واقعی یہ یونسکو کا فرض ہے کہ وہ ان نظریاتی جھگڑوں کو طے کرے اور اقوام عالم کے سامنے ان کا حل پیش کرے یہ اصلی مسئلہ ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا ہے اور اس کو ہم اسی صورت میں نظر انداز کر سکتے ہیں کہ اپنے لیے خطرہ مول لے لیں۔

جہاں تک یونسکو اور اس کے مخصوص اداروں کا تعلق ہے ہمیں علم ہے کہ اس نے خود کو کسی خاص نظریہ سے وابستہ نہیں کیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ اور روس دونوں انجمن اقوام متحدہ کے بنیادی ممبر ہیں اور خود یونسکو میں اہم ممبران ممالک مختلف نظریوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پھر چین کا انجمن اقوام متحدہ اور یونسکو سے علیحدگی کا کیا جواز ہے؟ اس کی بنیاد نظریاتی تو نہیں ہو سکتی کیونکہ سوویت یونین یوگوسلاویہ اور دوسرے بہت سے کمیونسٹ ممالک یونسکو کے ممبر ہیں۔ اس لیے چین کی علیحدگی غیر منطقی بھی ہے۔ اور غیر دانش مندانہ بھی۔ میں جانتا ہوں کہ اس سلسلے میں شاید یونسکو انجمن اقوام متحدہ کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہے مگر معاملہ اتنا صاف ہے کہ امید ہے کہ انجمن اقوام متحدہ بھی چین کی دوسری اقوام کی طرح اپنے جائز حق کے حصول کے لیے تیاری کرنے میں مدد کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔ اگر کسی صورت میں انجمن اقوام متحدہ چین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اس کا یہ دعویٰ کہ وہ اصلی عالمی تنظیم ہے، غلط ثابت ہوگا کیونکہ چین کو علیحدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تقریباً ایک چوتھائی انسانی آبادی اس سے نکل گئی۔ یونسکو میں چین کی بحیثیت ممبر کے شرکت میں جو بھی تکنیکی اعتراض ہوں مگر اس تجویز پر کسی قسم کا تکنیکی یا دوسری طرح اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ ان نظریاتی اختلافات کو دور کرنے میں پیش قدمی کرے جنہوں نے جدید زمانے کو تقسیم کر رکھا ہے۔ نظریاتی مسائل سے اس کا خاص تعلق ہے۔ اور اس کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی ذہن میں محافظ جذبوں کو پیدا کرے۔ یونسکو کس طرح اپنے اس فرض کو پورا کر سکتی ہے جب تک وہ ان نظریاتی ٹکراؤ کا حل نہ تلاش کرے جو امن عالم اور انسانی بقا کے لیے خطرہ ہیں۔ یہ یونسکو کا اولین فرض ہے کہ انجمن اقوام متحدہ کے سب اداروں میں یونسکو ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو انسان کے ذہنی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک دوسرے کو اپنا تعاون بھی دیں گی۔

میرے مخاطب دونوں کیمپوں کے حضرات ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا اس کی صحت سے ان کو انکار نہیں ہوگا مگر مجھے ایسا خیال ہے کہ دونوں نظاموں کے ماننے والے لوگوں کو یہ خوف ہے کہ کہیں دوسرا فریق خفیہ طور پر تخریبی کارروائی نہ کر رہا ہو یا نہ کر دے۔ جبکہ نظریاتی طور پر آزادانہ بحث ومباحثہ کے حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس خوف اور غلط فہمی کے اسباب باہمی گفت وشنید سے طے ہو سکتے ہیں اور اس طرح خفیہ تخریبی کارروائیوں کا سبب آپ ہی آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی فریق اس سے انحراف کر کے پُر تشدد خفیہ طریقوں کا استعمال کرے تو اس کو فوراً انجمن اقوام متحدہ کے علم میں لانا چاہیے اور میرے خیال میں اقوام متحدہ کو اس کا حق ہونا چاہیے کہ آزادانہ گفتگو کے ذریعہ جو معاہدہ آپس میں ہوا ہے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر سکے۔

پچھلے زمانے میں اور ممالک کی روس سے لڑنے کی وجہ اس کے وہ ارادے تھے جن سے وہ بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹ تحریک کو کمنٹراں کے تحت چلانا چاہتا ہے۔ روس نے اپنے ابتدائی دور میں علی الاعلان کہا تھا کہ اس کی کمیونسٹ پارٹی پوری دنیا میں انقلاب لانے کے لیے سرگرم رہے گی۔ ٹروٹسکی کو یقین تھا کہ جرمنی اور دوسرے ممالک میں بس انقلاب آنے ہی والا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ روسی لیڈروں نے عام طور پر اور اسٹالن نے خاص طور پر صرف اپنے ہی ملک کے لیے اشتراکی نظام کی باتیں شروع کر دیں۔ جب انگلستان اور ریاستہائے متحدہ دوسری جنگ عظیم میں روس کے حلیف بن گئے تو کمیٹرن ختم کر دیا گیا۔

آپ حضرات کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جنگ کے خاتمہ پر اسٹالن نے چین کی کمیونسٹ پارٹی کو مارشل چیانگ کائی شیک سے تعاون کرنے کی ہدایت کی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ خیال تقویت پانے لگا کہ روس اپنے یہاں اشتراکی نظام قائم کر کے اپنے شہریوں کی زندگی کا معیار بلند کر کے اپنی مثال سے کمیونزم کی زیادہ بہتر طریقے سے خدمت کر سکتا ہے۔ اسٹالن کی موت کے بعد موجودہ لیڈروں نے بغیر کسی شک وشبہ کے یہ اعلان کیا کہ کسی ملک کو دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر کسی ملک میں اشتراکی نظام آئے گا تو وہ اس ملک کی کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں کا ثمرہ ہوگا۔ موجودہ لیڈروں کے موجودہ رویّے سے امید ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دوسرے ممالک کے اندر قی

نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ رائے شماری کے بکس صرف نام کو ہیں اور لوگوں کی آزادی اور سیاسی حقوق کو ہمیشہ خفیہ پولس کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ روسی نظام میں سیاسی جمہوریت تھی ہی نہیں اس لیے انھیں اس سماجی معاشی نظام کو ماننے میں کوئی قباحت نہیں تھی جو ان کی امیدوں اور عقیدوں کے لیے چیلنج تھا۔ وطن پروری اور روسی نظام کے ساتھ وفاداری نے اسے اور تقویت دی۔ خانہ جنگی جو انقلاب کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی اس نے غیر ملکی مداخلت کو دعوت دی اس لیے عوام غیر ملکی لوگوں اور حکومت مخالف لوگوں کو ایک سمجھنے لگے۔ اور پھر چالیس سال میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس نے ان کے اس عقیدے کو اور مستحکم کر دیا کہ زیادہ سے زیادہ ترقی صرف اشتراکیت کی راہ پر چل کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افراد اور جماعتوں کے اصولوں میں کچھ تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ کم و بیش روس کے لوگوں اور مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک نے اشتراکی طرز زندگی کو اسی عقیدے اور ایقان کے ساتھ قبول کر لیا ہے جس طرح ریاستہائے متحدہ نے آزاد اداروں اور سرمایہ داری نظام کو قبول کیا ہے۔

میں نے اس سے قبل عرض کیا تھا کہ چونکہ ان دونوں نظاموں میں تصادم نظریوں کا ہے اس لیے یونسکو کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اس تصادم کا حل تلاش کرے جو نظریاتی سطح پر ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس امر کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان دونوں نظریوں کا وجود ہے اور یہ باقی رہیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ہر نظام فکر کے ماننے والے ملک کو اپنے نظریہ کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہے بشرطیکہ وہ پُرامن اور نظم و ضبط کے ساتھ کی جائے۔

یونسکو اظہار رائے کی آزادی کا ہمیشہ حامی رہا ہے یہ دونوں نظام فکر بھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں جو عین یونسکو کی روح کے مطابق ہے جہاں ہر نظام فکر کے لوگوں کو اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کی مکمل آزادی ہوگی تو ان میں سے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے پر دھونس جمائے یا پُرتشدد طریقوں کو اپنائے۔ ہر شخص اصولاً اس بات کو مانتا ہے کہ سب قوموں کو اپنی قسمت کا آپ فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ وہ اپنے ملک کے لیے کسی بھی نظام کا انتخاب کرے اور کسی ملک کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس سلسلے میں دوسرے پر اپنی رائے تھوپے۔ جب ایک مرتبہ سب بڑی قوموں نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس نقطۂ نظر کو مان لیا کہ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ رواداری سے پیش آئیں گی بلکہ مختلف میدانوں میں

ضروری اور مناسب ہے کہ رائے عامہ اس تبدیلی کا خیر مقدم اور اس کی ہر طرح ہمت افزائی کرے۔ یہ ایک انسانی فریضہ ہے کہ لوگ اپنی ان رایوں کا اظہار مختلف طریقوں سے کھلے دل سے کریں جن سے کسی نہ کسی صورت میں آزادی اور جمہوریت کو تقویت ملتی ہے۔

ان دونوں نظاموں نے یہ بات قبول کر لی یہ دونوں ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں اور آپس میں رواداری برتنے کو تیار رہیں تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ ایک دوسرے کا پاس کریں گے اور آپس میں مفاہمت بڑھے گی۔ ایک دفعہ جب باہمی نفرت اور بدگمانی ختم ہو جائے گی یہ ہر نظام کے ماننے والے دوسرے کے تجربات سے کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ واقفیت کی بنا پر آپس میں قُرب بھی بڑھے گا۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ان میں سے کوئی نظام ختم ہونے والا نہیں۔ ان دونوں کے درمیان جو اختلاف ہیں وہ بھی رہیں گے لیکن یہ اختلافات بڑی حد تک طریقۂ کار اور ٹیکنیک میں ہیں۔ انسانیت اور ثقافت کی اعلیٰ اقدار میں نہیں جو تیزی سے پورے عالم انسانیت کی ایک ہی ہو رہی ہیں۔

یونسکو کا یہ خاص کام ہے کہ وہ " ایسے نظاموں کے درمیان جن کی دشمنی انسانی فلاح کے لیے خطرہ ہے باہمی رواداری اور مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے کام کرے وہ اپنے فوری مقاصد کے حصول کے وسائل تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

ایک دفعہ جنگ کا خوف اور آپس کی بدگمانی کا خاتمہ ہو جائے تو وہ بھاری رقم جو آج جنگی اسلحے کی تیاری پر صَرف ہو رہی ہے یونسکو کے تعمیری کاموں پر صَرف ہو سکتی ہے جو اس کا اصلی کام ہے صرف مسلسل جنگ اور موت سے خالی دنیا ہی میں یونسکو سے عالمی پیمانے پر تعلیم صحت اور معیار زندگی کو بہتر بنانے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کا وعدہ اس نے پورے یقین کے ساتھ زور شور سے کیا ہے۔

جب یہ خطبہ لکھا جا چکا تھا تو مصر سے اچانک لڑائی کی خبر آئی۔ اس المیہ کے اثرات اس قدر سنگین ہیں کہ میں اس کا یہاں ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے یہ امید ظاہر کی تھی جنگ کے قدیم اسباب جو زیادہ تر علاقائی مذہبی اور قومیت سے تعلق رکھتے تھے وہ اس جدید دور میں نہیں رہے ہیں مگر میں اب بہت رنج کے ساتھ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میری خام خیالی تھی پچھلے دنوں مصر میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اب تک پرانے طریقوں

معاملات میں اس کی مداخلت کا وہم اور خوف نکل جائے گا۔

ہمیں روس کی اس تبدیلی پر جو پچھلے دو تین سال میں آئی ہے غور کرنے کی ضرورت ہے اس بڑی تبدیلی کی وجہ سے یہ امید بندھتی ہے کہ نظریاتی اختلاف کا پُرامن حل ممکن ہے۔

کچھ عرصے پہلے مغربی سیاسی جمہوریت کے حامی اکثر اسی بات کے شاکی نظر آتے تھے کہ روس میں آزادانہ اظہار رائے کا حق نہیں ہے۔ اوپر سے ان کو حکم ملتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بات صرف شہریوں پر انفرادی طور پر ہی نہیں لاگو ہوتی بلکہ دوسرے ملکوں کے سیاسی طرز حکومت پر بھی لاگو ہوتی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس بات میں وزن ہے اسٹالن کے زمانے میں یوگوسلاویہ اور روس میں تصادم کا سبب اپنی پسند کے کمیونسٹ طرز حکومت کے انتخاب کا حق ہے۔ مارشل ٹیٹو کا کہنا تھا کہ یوگوسلاویہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس ملک میں روس کی تقلید کرے وہ اپنے ملک کے لیے اس کی ضرورتوں کے مطابق کمیونسٹ نظام قائم کرسکتا ہے۔ اسٹالن نے اس کو منظور نہیں کیا اور ہم سب جانتے ہیں کہ کس طرح کچھ سالوں تک یوگوسلاویہ روس کی دشمنی اور تنقید کا نشانہ بنا رہا مگر وہاں اب نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی کی پچھلی کانگرس کے دوران روسی لیڈروں نے بغیر کسی جھجک کے اس کا اقرار کیا ہے کہ اشتراکیت کی مختلف بنیادیں ہوسکتی ہیں اور ہم نے دیکھا کہ روس اور یوگوسلاویہ کے درمیان تناؤ بھی ختم ہوگیا۔ پولینڈ کے حالیہ واقعات مزید اس نقطہ نظر کی تصدیق کرتے ہیں کہ روسی لیڈر اب اس کے حق میں نہیں ہیں کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو حکم صادر کریں۔

دنیا کے سب ترقی پسند ذہنوں نے افسوس سے اس بات کو محسوس کیا کہ ماضی میں روس میں اشتراکی نظام کا مطلب لوگوں کی زندگی پر حکومت کرنا اور فرد کی آزادی کو سلب کرنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس کے لوگوں کو سیاسی آزادی اور اپنے شہری حقوق کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ امر قابل مبارک باد ہے کہ روسی لیڈر موجودہ نظام کو حریت پسند بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ روس میں صنعتی اور معاشی جمہوریت تو پہلے ہی سے ہے مگر وہ دن روس اور پوری دنیا کے لیے بہت خوشی کا ہوگا جب وہ اپنی ان کامیابیوں کے ساتھ وہاں فرد کی آزادی اور سیاسی جمہوریت کا قیام بھی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے روس صحیح سمت میں قدم اٹھا رہا ہے یہ

ہندوستان چھوڑ دو

ہماری آزادی

"میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ سویا ہوں گا کہ کسی نے چپکے سے میرا پاؤں دبایا میں نے آنکھیں کھولیں تو بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے دھیرو بھائی ڈیسائی ایک کاغذ لیے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے۔ قبل اس کے کہ دھیرو بھائی مجھے بتلائیں کہ بمبئی کا ڈپٹی کمشنر میری گرفتاری کا وارنٹ لایا ہے۔"

اور قدیم حکمت عملی پر چل رہے ہیں اور اپنے خوابوں کی دنیا تک پہنچنے کے لیے ہمیں اب بھی ایک طویل راستہ طے کرنا ہے۔

یونسکو کا سیاسی مسائل سے براہ راست تعلق نہیں ہے مگر ہم ان کو اس لیے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری دلچسپی کے کاموں خاص طور سے امن عالم اور بین الاقوامی مفاہمت سے متعلق کاموں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں نہایت ادب سے فوری طور پر سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کی درخواست کروں گا۔ یہ معاملہ کیا ہے؟ اسرائیلی فوجوں نے مصری حد پار کر کے مصر پر حملہ کر دیا۔ انگلستان اور فرانس الٹی میٹم دے کر قاہرہ پر حملہ آور ہو گئے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں اس المناک سین میں انجمن اقوام متحدہ کا کیا رول ہے؟ یہ بات میرے گلے نہیں اترتی کہ انگلستان اور فرانس جیسی دو بڑی قومیں جو یونسکو کے بنیادی ممبر بھی ہیں ان کو مصر کے خلاف یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا؟ جیسے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ریاستہائے متحدہ کا زوردار رزولیوشن جو شاید اس سے نمٹنے کے لیے حل تلاش کرنے میں معاون ہوتا کو پاس نہیں ہونے دیا گیا اس صورت حال کو دیکھ کر یہ تکلیف دہ احساس ہوتا ہے کہ آج بھی امن عالم اور بنی نوع انسانی کے مستقبل کو اپنے محدود قومی اور تجارتی مفاد کے مقابلے میں کم اہم سمجھا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کہنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ ان حالات میں یونسکو کے کاموں کے کیا معنی ہیں؟

ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یونسکو ابھی اس ذہنی فضا کو بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جس میں لوگوں کے دلوں میں امن کے لیے شدید محبت اور لگاؤ ہو اور جس کے بغیر ساری تکنیکی اور سائنسی ترقی ایک خوفناک تلوار کی طرح ہے جو ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔ وہی بات کہ عورتوں اور مردوں کے ذہنوں میں امن کے محافظ جذبوں کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں یونسکو کو اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کرنی چاہئیں۔ یہ منزل اب بھی دور ہے۔ جس کے لیے یہ تنظیم وجود میں آئی۔ یونسکو کو بحران کی حالت میں بھی حساس انسانی ضمیر کی طرح ہونا چاہیے ورنہ وہ انسانیت کی بہتری کے لیے کام کرنے والی فعال طاقت نہیں بن پائے گی۔

ے ڈرا دھمکا کر گفتگو کی جائے۔ جو واقعات پیش آئے انہوں نے میرے

اس قیاس کی تصدیق کردی۔

وردھا میں بیرونی اخبارات کے نمائندوں کا ہجوم ہوگیا تھا انہیں ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ معلوم کرنے کی بہت فکر تھی۔ ۱۵ جولائی کو گاندھی جی نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر تحریک شروع کی گئی، تو وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک بے تشدد انقلاب ہوگا۔

رزولیوشن کے منظور ہونے کے بعد گاندھی جی کے سکریٹری مہادیو دیسائی نے مس سلیڈ سے کہا کہ انہیں وائسرائے سے مل کر رزولیوشن کے منشا کی وضاحت کرنا چاہیے۔ مس سلیڈ ایک برطانوی امیر بحر کی لڑکی تھیں، مگر انہوں نے گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوکر ہندوستانی طریق زندگی اختیار کرلیا تھا۔ وہ عرف عام میں میرا بہن کہلاتی تھیں۔ گاندھی جی کے انتہائی عقیدت مندوں میں سے تھیں اور ان کے آشرم میں کئی سال رہ چکی تھیں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ وائسرائے کو مجوزہ تحریک کی نوعیت اور اس کے طریق کار کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ مس سلیڈ وائسرائے سے ملنے کے لیے وردھا روانہ ہوئیں اور ملاقات کی درخواست کی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی بغاوت کی باتیں کرتے ہیں، اس لیے وائسرائے ان سے ملاقات کرنا منظور نہیں کرسکتے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کردیا کہ حکومت جنگ کے زمانے میں کسی قسم کی بغاوت کو برداشت نہیں کرسکتی چاہے وہ تشدد پر مبنی ہو یا عدم تشدد پر۔ نیز حکومت کسی ایسی جماعت کے نمائندے سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے، جو اس قسم کی باتیں کرتی ہے۔ اس انکار کے بعد میرا بہن وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملیں اور ان سے طویل گفتگو کی۔ اس وقت میں دہلی میں تھا۔ انہوں نے اس گفتگو کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کیا، پھر وردھا واپس گئیں اور گاندھی جی سے اس ملاقات کا حال بیان کیا۔

اس کے فوراً بعد مہادیو دیسائی نے ایک بیان جاری کیا کہ معلوم ہوتا ہے گاندھی جی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ گاندھی جی نے برطانیہ کے خلاف کھلی بے تشدد بغاوت کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مہادیو دیسائی کے اس بیان پر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔

ہندوستان چھوڑ دو*

ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن شائع ہوا تو پورے ملک میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس رزولیوشن کے کیا نتیجے نکل سکتے ہیں۔ ان کو تو بس یہ نظر آرہا تھا کہ بالآخر کانگریس، برطانیہ کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے عوامی تحریک شروع کررہی ہے۔ چنانچہ عوام اور حکومت دونوں ہی بہت جلد اس رزولیوشن کو "ہندوستان چھوڑ دو" کے نام سے موسوم کرنے لگے ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں کی طرح عوام بھی گاندھی جی سے کامل عقیدت رکھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ انہوں نے کوئی ایسی تدبیر سوچی ہے، جو حکومت کے نظام کو درہم برہم کردے گی اور اس طرح وہ مصالحت پر مجبور ہو جائے گی۔ میں یہاں اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سوچتے تھے کہ گاندھی جی ہندوستان کو جادو کے ذریعہ یا ایسے طریقوں سے آزادی دلوادیں گے جو انسانی فہم و طاقت سے ماوراء ہیں اس لیے وہ ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ فوراً اس کے لیے کوئی خاص کوشش کریں۔

رزولیوشن منظور کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ دیکھے گی کہ حکومت پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر حکومت نے مطالبے کو تسلیم کرلیا، یا کم سے کم صلح جوئی کا رویہ اختیار کیا، تو مزید گفتگو کے لیے گنجائش رہے گی اور اگر اس کے برعکس حکومت نے مطالبے کو رد کر دیا تو گاندھی جی کی رہنمائی میں اس کے خلاف ایک تحریک شروع کی جائے گی مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ

★ یہ باب مولانا کی کتاب انڈیا ونز فریڈم سے لیا گیا ہے، جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مقدمے میں ہمایوں کبیر نے ان سب مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ جو مولانا کو ان کی خود نوشت سوانح لکھنے کے لیے تیار کرنے میں انہیں پیش آئیں۔ ہمایوں کبیر کا یہ دعویٰ ہے کہ اپنی وفات سے چند سال پہلے مولانا نے اس کے پورے مسودے کو دیکھ کر شائع ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ ہمایوں کبیر کا یہ کہنا ہے کہ یہ مولانا کی خواہش تھی کہ "تیس صفحات" ان کی وفات کے تیس سال بعد شائع ہوں۔ چنانچہ یہ تیس صفحات ۱۹۸۸ء میں شائع ہو گئے۔

آسانی سے جھکنے والی نہیں ہے اس سے ان کے اعتماد کو دھکا لگا، مگر اب بھی ان کو یقین تھا کہ حکومت کوئی سخت قدم نہیں اٹھائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے بعد پروگرام تیار کرنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا اور وہ بتدریج تحریک کی رفتار کو تیز کر سکیں گے۔ میں ان کی اس خوش فہمی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ ۲۸ جولائی کو میں نے ان کو ایک مفصل خط میں لکھا کہ حکومت پوری طرح تیار ہے اور بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے فوراً بعد کوئی قدم اٹھائے گی۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ نتیجہ نکالنے میں مجھے جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہیے۔ وہ بھی صورتِ حال کا مطالعہ کر رہے ہیں اور انہیں اب بھی یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔

۳ اگست کو میں کلکتہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا۔ مجھے پورا یقین تو نہ تھا مگر دل سے یہ کہتا تھا کہ میں کلکتہ سے ایک طویل عرصے کے لیے جدا ہو رہا ہوں۔ مجھے اس کی بھی اطلاعیں مل چکی تھیں کہ حکومت نے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں اور اس کا ارادہ ہے کہ رزولیوشن منظور ہوتے ہی تمام لیڈر گرفتار کر لیے جائیں۔

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۵ اگست کو منعقد ہوا، جس میں ۷ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لیے رزولیوشن کا ایک مسودہ تیار کیا گیا۔ میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں، کمیٹی کی پچھلی میٹنگ سے اس وقت تک صورت حال میں جو تبدیلی ہوئی تھی، اس کا مختصر خاکہ پیش کیا اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اسباب کی وضاحت کی، جنھوں نے ورکنگ کمیٹی کو اپنا رویہ بدلنے اور ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس وقت اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے، ہماری قوم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں سکتی۔ ہندوستان نے جمہوری ممالک کے ساتھ تعاون کرنا چاہا تھا، مگر برطانوی حکومت نے باعزت تعاون کی راہیں بند کر دیں۔ اب صورت یہ ہے کہ جاپانی حملہ آور دروازے تک آگیا ہے اس لیے قوم اپنے اندر حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ برطانیہ اگر مناسب سمجھے تو ہندوستان کو خالی کر سکتا ہے، جیسے اس نے سنگاپور، ملایا اور برما کو خالی کر دیا ہے، ہندوستانی ملک کو چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ یہ ان کا وطن ہے، اس وجہ سے وہ اپنے میں اتنی طاقت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں اور نئے حملہ آور کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ "بے تشدد انقلاب" کی اصطلاح جواہرلال نے ایجاد کی تھی اور پھر گاندھی جی بے تشدد انقلاب کی باتیں کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں اس کا کوئی مخصوص مفہوم رہا ہو، مگر عام پبلک نے ان کے اس بیان کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ کانگریس نے اب فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ بجز تشدد کے (ہندوستان کی) برطانوی حکومت کو مجبور کرنے کے تمام ذریعے استعمال کرے گی کہ وہ اقتدار سے دست بردار ہو جائے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے پہلے سے اندازہ کرلیا تھا کہ انگریز پر (ہمارے فیصلے کا) کیا اثر پڑے گا۔ اور مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا جب وائسرائے نے گاندھی جی یا ان کے نمائندے سے ملنے سے انکار کردیا۔ جبکہ ورکنگ کمیٹی طے کرچکی تھی ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے بلایا گیا۔

۱۴ جولائی سے ۵ اگست تک میرا تمام تر وقت ملک کے مختلف حصوں کے کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کرنے میں صرف ہوا۔ میں ان کے ذہن نشین کرنا چاہتا تھا کہ اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ مان لیا یا کم سے کم ہمیں کام کرنے کا موقع دیا تو تحریک کے چلانے میں گاندھی جی کی ہدایتوں کی سختی سے پابندی کی جائے گی اگر حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کرلیا تو عوام کو اختیار ہوگا کہ وہ حکومت کے تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے جو طریقہ بھی مناسب سمجھیں، خواہ تشدد یا عدم تشدد کا، اسے اختیار کریں جب تک لیڈر آزاد ہیں اور اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں ملک میں جو کچھ ہوگا وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے لیکن اگر حکومت ان کو گرفتار کرے گی تو اس کے نتائج کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان ہدایتوں کو خفیہ رکھا گیا تھا اور ان کی اشاعت کبھی نہیں کی گئی۔ اس وقت کی صورتِ حال کا جو نقشہ میرے سامنے تھا، وہ یہ تھا کہ بنگال، بہار، یوپی، سی پی، بمبئی اور دہلی پوری طرح تیار رہیں اور وہاں تحریک میں بہت زور اور طاقت ہوگی۔ آسام اس وقت برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور فوجی افسران اور سپاہیوں سے بھرا پڑا تھا اس لیے وہاں کسی قسم کا عملی اقدام ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن آسام جانے کے تمام راستے بنگال اور بہار سے گزرتے تھے اس لیے ان دونوں صوبوں میں پروگرام کی اہمیت دوچند ہوگی، باقی صوبوں میں مناسب فضا پیدا کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی، مگر مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح صورتِ حال میرے سامنے واضح شکل میں نہیں تھی۔

وائسرائے نے میرا یہ ہن سے ملاقات کرنے سے انکار کردیا تو گاندھی جی نے محسوس کیا کہ حکومت

بھولا بھائی سے کہا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو میرے پاس آزادی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ میں جلد کھانا کھا کر سو رہوں تاکہ صبح کو جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے لیے تیار ہو جاؤں۔ بجائے اس کے کہ آزادی کے ان چند گھنٹوں کو افواہوں کے بارے میں قیاس آرائی میں صرف کروں، بہتر ہے کہ سو رہوں۔ بھولا بھائی نے اس سے اتفاق کیا اور میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا۔

میں ہمیشہ سے صبح سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ اگلی صبح کو بھی میں حسب معمول چار بجے اٹھا۔ مگر میری تھکاوٹ اب بھی باقی تھی اور سر بھاری بھاری سا تھا۔ میں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں، چائے کی ایک پیالی لی اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ منظور شدہ رزولیوشن کی ایک نقل خط کے ساتھ پریزیڈنٹ روزولٹ کو بھیجی جائے گی۔ ہم نے سوچا کہ پریزیڈنٹ روزولٹ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے میں جس قدر دلچسپی لے رہے ہیں، اس کے پیش نظر کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ میں نے پریزیڈنٹ روزولٹ کے نام خط لکھنا شروع کیا، مگر اسے ختم نہ کر سکا۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے یا شاید اسپرین کی وجہ سے نیند آنے لگی اور میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ سویا ہوں گا کہ کسی نے چپکے سے میرا پاؤں دبایا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو بھولا بھائی دیسائی کے صاحبزادے دھیرو بھائی دیسائی ایک کاغذ لیے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے۔ قبل اس کے کہ دھیرو بھائی مجھے تبلائیں کہ بمبئی کا ڈپٹی کمشنر میری گرفتاری کا وارنٹ لایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈپٹی کمشنر برآمدے میں انتظار کر رہا ہے۔ میں نے دھیرو بھائی سے کہا کہ ڈپٹی کمشنر سے کہہ دیں کہ مجھے تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔

میں نے غسل کیا اور کپڑے پہنے۔ میں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں کو، جو اس وقت تک اٹھ کر میرے پاس آ چکے تھے، ضروری ہدایات بھی دے دیں۔ اس کے بعد میں برآمدے میں آیا۔ بھولا بھائی اور ان کی بہو ڈپٹی کمشنر سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے مسکرا کر بھولا بھائی سے کہا کہ ان کے دوست پچھلی شام کو جو خبر لائے تھے صحیح نکلی۔ پھر میں نے ڈپٹی کمشنر سے مخاطب ہو کر کہا "میں تیار ہوں"۔ اس وقت پانچ بجے تھے۔

میں ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھا۔ ایک دوسری کار میں میرا سامان رکھا گیا اور وہ ہمارے

سوائے چند کمیونسٹوں کے جنھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام ممبروں نے ورکنگ کمیٹی کے تیار کیے ہوئے رزولیوشن کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور دو روز کی بحث و گفتگو کے بعد ۸ اگست کو رات گئے یہ رزولیوشن بھاری کثرت رائے سے منظور ہو گیا۔ رزولیوشن کا مکمل متن ضمیمہ میں درج ہے۔

میں بمبئی جاتا تو عام طور پر مرحوم بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس موقع پر بھی وہیں ٹھہرا تھا۔ اس وقت وہ علیل تھے اور ان کی طبیعت کچھ عرصے سے ناساز تھی، اس لیے جب میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے سے واپس آیا اور معلوم ہوا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہیں تو کچھ تعجب ہوا۔ رات کافی گزر چکی تھی، میں تھکا ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سو گئے ہوں گے میں نے ان کو اس قدر دیر تک جاگتے پر ہلکی سی فہمائش کی، مگر انھوں نے بتلایا کہ میرے ایک عزیز محمد طاہر، جن کا بمبئی میں کاروبار تھا، مجھ سے ملنے آئے تھے اور بہت دیر تک میرا انتظار کیا۔ جب میں واپس نہیں آیا تو وہ میرے نام ایک پیغام چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ محمد طاہر کے بمبئی پولیس میں ایک دوست تھے، ان سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ صبح سویرے تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لیے جائیں گے۔ طاہر کے دوست نے یہ بھی بتلایا تھا کہ اسے یقین کے ساتھ تو نہیں معلوم ہے، مگر اطلاع یہ ہے کہ ہم سب کو ہندوستان کے باہر — غالباً جنوبی افریقہ بھیج دیا جائے گا۔

اس قسم کی افواہیں کلکتہ میں روانگی سے قبل سننے میں آئی تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افواہیں بالکل بے بنیاد نہیں تھیں۔ جب حکومت نے ہم سب کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ بھی خیال آیا ہو گا کہ ہم کو ہندوستان میں رکھنا مصلحت کے خلاف ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جنوبی افریقہ کی حکومت سے گفتگو شروع کی گئی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عین وقت پر کوئی رکاوٹ پیش آگئی، جس کی وجہ سے بعد میں فیصلہ بدلنا پڑا۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ حکومت نے طے کیا ہے کہ گاندھی جی کو پونا میں نظر بند کیا جائے گا اور ہم لوگوں کو احمد نگر قلعہ میں قید کیا جائے گا۔

بھولا بھائی اس خبر سے سخت پریشان تھے اور اسی وجہ سے اب تک میرا انتظار کر رہے تھے میں بہت ہی تھکا ہوا تھا۔ اس لیے اس قسم کی افواہیں بیٹھ کر سننے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے

تھا کہ حکومت کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی اگرچہ میں نے ان کو بار بار آگاہ کیا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں، مگر ظاہر ہے ان کو اپنی رائے پر زیادہ اعتماد تھا۔ اب چونکہ ان کے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے، وہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے۔

ہم نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ گاندھی جی نے کہا "تم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی حکومت کو اطلاع کرنا کہ تم بحیثیت صدر کانگریس اپنے فرائض کو جاری رکھنا چاہتے ہو اس مقصد کے لیے تم کو اپنے پرائیویٹ سکریٹری اور دوسری سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جب تم پچھلی مرتبہ گرفتار ہوئے تھے اور نینی جیل میں نظر بند تھے، تو حکومت نے تم کو یہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ اسی قسم کی سہولتوں کا تم کو پھر مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کو ایک مسئلہ بنا لینا چاہیے" میں گاندھی جی سے اتفاق نہ کر سکا۔ میں نے کہا کہ موجودہ صورت حال بالکل مختلف ہے۔ ہم نے اپنا راستہ جان بوجھ کر اختیار کیا ہے۔ اس لیے اس کے نتائج کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلے کے بارے میں لڑنے کو کہیں، جو کانگریس نے اٹھایا ہو، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اتنے معمولی مسئلے پر کہ مجھے خاص سہولتیں دی جائیں لڑنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ میں اس مطالبہ کو حق بجانب نہیں سمجھتا تھا کہ کانگریس کے کاموں کو انجام دینے کے لیے پرائیویٹ سکریٹری رکھنے کی اجازت ملے۔ موجودہ حالات میں یہ معاملہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر لڑائی کی جائے۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بمبئی کا پولیس کمشنر، جو ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا، اندر آیا اس نے ہم سے اپنے ڈبے میں جانے کے لیے کہا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ صرف مسز نائیڈو، گاندھی جی کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ جواہر لال اور میں اپنے ڈبے میں آگئے۔ ہماری گاڑی اس وقت تیزی کے ساتھ کلیان کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن وہ کلیان میں نہیں ٹھہری اور پونا کا راستہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا کہ غالباً ہم لوگ پونا میں نظر بند کیے جائیں گے اور جب وہاں گاڑی رکی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گرفتاری کی خبر کسی طرح پونا پہنچ گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف پولیس تھی اور پبلک میں سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی، البتہ پل کے اوپر بڑا اژدہام تھا۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی، لوگوں نے "مہاتما گاندھی کی جے" پکارنا شروع کر دیا۔ جونہی لوگوں نے

پیچھے پیچھے چلی۔ ہم سیدھے وکٹوریا ٹرمنس آئے۔ یہ لوکل گاڑیوں کا وقت تھا مگر اسٹیشن بالکل خالی تھا، شاید تمام گاڑیاں اور مسافر تھوڑی دیر کے لیے روک دیے گئے تھے۔ جونہی میں کار سے اترا، اشوک مہتا نظر پڑے۔ وہ بھی گرفتار کر لیے گئے تھے اور وکٹوریا ٹرمنس لائے گئے تھے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ حکومت نے صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو نہیں بلکہ بمبئی کے مقامی کانگریسی لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا ہے اور سارے ملک میں یہی کیا جا رہا ہوگا۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ مجھے اس کے پاس لائے۔ اس وقت ایک انجن، گاڑی میں ڈائننگ کار لگا رہا تھا۔ یہ کوری ڈر (CORRIDOR) والی گاڑی تھی، جیسی کہ عام طور پر بمبئی اور پونا کے درمیان چلتی ہیں۔ میں ایک ڈبے میں پہنچا دیا گیا، جہاں میں کھڑکی کے پاس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد فوراً ہی جواہر لال، آصف علی اور ڈاکٹر محمود نظر آئے۔ جواہر لال نے مجھے بتلایا کہ گاندھی جی کو بھی اسٹیشن لائے ہیں اور وہ دوسرے ڈبے میں بیٹھائے گئے ہیں۔ ایک یوروپین فوجی افسر نے آکر ہم سے پوچھا کہ چائے تو نہ پییں گے؟ میں چائے پی چکا تھا، مگر اور منگوا لی۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرا فوجی افسر آیا اور اس نے ہم لوگوں کو گننا شروع کیا۔ وہ کسی وجہ سے چکرایا ہوا سا تھا، کیونکہ اس نے ہم لوگوں کو متعدد بار گنا۔ جب وہ ہمارے ڈبے میں آیا تو اس نے ذرا بلند آواز سے کہا "تیس"۔ جب اس نے دو تین مرتبہ یہی کیا، تو میں نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا "۳۲"۔ اس سے وہ اور پریشان ہو گیا، اور اس نے پھر گننا شروع کیا۔ اس کے بعد ہی گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی چل پڑی۔ میں نے مسز آصف علی کو پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ جب گاڑی چلنے لگی تو انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "میری فکر نہ کیجیے گا، میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی کام نکال لوں گی۔ بے کار نہ بیٹھوں گی"۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انھوں نے جو کہا تھا، وہ کر دکھلایا۔

میں ابھی بتا چکا ہوں کہ ہماری گاڑی میں کوری ڈر تھا۔ مسز نائیڈو ہمارے ڈبے میں آئیں اور کہا کہ گاندھی جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم کوری ڈر سے ہوتے ہوئے ان کے ڈبے میں گئے، جو ذرا فاصلے پر تھا۔ گاندھی جی بہت ہی افسردہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اس قدر اداس اور رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو اس اچانک گرفتاری کا اندیشہ نہیں تھا۔ ان کا اندازہ یہ

جو ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ کاریں فوراً روانہ ہوگئیں اور سیدھی جاکر قلعہ کے اندر کے پھاٹک پر رکیں۔ وہاں ایک فوجی افسر منتظر کھڑا تھا۔ پولیس کمشنر نے ایک فہرست نکال کر اسے دیدی۔ وہ ایک ایک نام پکارتا گیا اور ہمیں قلعہ میں داخل کرتا گیا۔ دراصل اس طرح پولیس کمشنر ہم کو فوجی محکمے کے حوالے کر رہا تھا۔ اب سے ہم فوجی حراست میں آگئے۔

نعرے لگائے، کمشنر نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دے دیا۔ اسے حکم ملا تھا کہ کسی قسم کے مظاہرے یا نعرے کی اجازت نہ دی جائے۔

جواہر لال کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے تو ڈبے سے باہر کود پڑے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھے کہ "تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"، پولیس کمشنر ان کے پیچھے لپکا اور انہیں ان کے ڈبے میں واپس لانے کی کوشش کی، جواہر لال نے اس کا کہنا نہیں سنا اور غصے میں باتیں کرنے لگے اس اثنا میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر اتر پڑے۔ چار سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا اور گاڑی میں واپس جانے کے لیے کہا۔ جب انہوں نے جانے سے انکار کیا تو پولیس والوں نے ان کو زبردستی اٹھا کر ڈبے میں کر دیا۔ میں نے جواہر لال سے پکار کر کہا کہ اندر آجائیں۔ جواہر لال غصے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مگر میری درخواست کو قبول کر لیا۔ پولیس کمشنر میرے پاس آیا اور دو تین مرتبہ اس نے معذرت کی۔ "جناب والا، مجھے سخت افسوس ہے، مگر مجھے ان باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور میں ان کو بجا لانے پر مجبور ہوں"

میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز نائیڈو اور گاندھی جی گاڑی سے اتار لیے گئے ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ آغا خاں کے مکان میں، جو آغا خاں محل کے نام سے مشہور ہے، نظر بند کیا گیا ہے۔ ایک اور شخص بھی جو بمبئی میں گرفتار کیا گیا تھا، گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا مگر پولیس نے اس کو روک دیا، پھر بھی وہ اس وقت تک باز نہیں آیا جب تک کہ پولیس نے اس کو پکڑ کر زبردستی نہیں روکا۔ میرا خیال ہے وہ گاندھی جی کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ موجودہ تحریک میں لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کو رضا کارانہ طور پر گرفتار نہ کرائیں، بلکہ جب سختی اور زبردستی کی جائے، تب وہ جیل میں جانے پر راضی ہوں۔

جب گاندھی جی اتار لیے گئے، تو پھر گاڑی روانہ ہوئی۔ اب میں سمجھا کہ ہمیں احمد نگر لے جایا جا رہا ہے۔ ہم دن کے ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر پہنچے۔ سوائے چند پولیس افسران اور ایک فوجی افسر کے پلیٹ فارم پر کوئی نہیں تھا، ہم سے اترنے کے لیے کہا گیا اور کاروں پر سوار کر دیا گیا۔

مولانا کی آخری تقریر

پریڈ گراؤنڈ۔ دہلی

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
غالب

تو ہندی ختم ہو جائے گی۔ لوگ اس سوال کو ہر وقت اسی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسی کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا اور دستور بننے کا وقت آیا۔ دستور ساز اسمبلی نے کافی بحث کے بعد...... اکثریت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ "اس ملک کی زبان ہندی ہوگی" جس کے نتیجے میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا اور اردو کی ایک رقیب ....کی حیثیت ختم ہو گئی۔ اب جب اس پر ہمارے کانسٹی ٹیوشن کی مہر ثبت کی جا چکی ہے تو ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہو جاتا ہے کہ اسے مانے وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ تب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی ملک میں کیا جگہ ہے؟ اب اس کی وہی حیثیت ہے جو دستور کی دوسری چودہ زبانوں کی ہے۔ بہت سے لوگ اسے اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ پچھلے دنوں کی تلخی ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کیا ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ مل چکی اور ہم نے اس پر دستور کی چھاپ لگا دی۔ اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کا جو جائز مقام ہے وہ ابھی اسے ملنا باقی ہے۔ اس کا یہ حق اسے ملنا چاہیے۔ کسی زبان کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے گورنمنٹ بھی مانے اور لوگ بھی مانیں

اردو ایک ایسی زبان ہے جو ملک میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی اس کے بولنے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقے میں اردو بولی جاتی ہے میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یوپی۔ بہار۔ دلی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں لاکھوں ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ جس مقصد کے لیے کانفرنس بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی اور اب جب وزیراعظم نے اس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"

مولانا کی آخری تقریر*

جناب صدر اور دوستو!

میں سمجھتا ہوں کہ آج آپ نے یہ مجلس اس لیے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اردو کو جو واقعی جگہ ہے وہ اسے دی جائے۔ آپ یہ نہیں چاہتے کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے اور وہ اردو کو مل جائے۔ آپ اردو کے حامی ہیں لیکن ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے مخالف نہیں ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت سندر لال جی نے کہا، یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہندی کا مخالف ہو یہی صحیح اسپرٹ ہے اسی اسپرٹ سے مسئلہ کے حل کا راستہ صاف ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ تیس چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اردو کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو اور جو لوگ ہندی کے حامی تھے ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا تو اردو ختم ہو جائے گی اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا

★ انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے ۱۷-۱۵ ارفروری ۱۹۵۸ء کو ہندوستان میں اردو کی حیثیت پر غور کرنے کے لیے کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس اس پریڈ گراؤنڈ میں ہوئی تھی جس کے متصل دہلی کا تاریخی لال قلعہ ہے اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ مولانا ڈائس پر بیٹھے پنڈت جی کی امید و یقین سے بھری تقریر سن رہے تھے۔ پنڈت جی کے علاوہ جن لوگوں نے تقریریں کی تھیں وہ تھے کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت سندر لال، مولانا حفظ الرحمٰن (ایم۔پی) اور ڈاکٹر تارا چند (ایم پی) اسی گراؤنڈ میں جہاں مولانا نے اردو کے مستقبل کے بارے میں امید و یقین کا اظہار کیا تھا اور لوگوں سے زبان کی بنا آپس میں دشمنی کے جذبات سے اوپر اٹھنے کی اپیل کی تھی۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد ۲۲ فروری کو وہیں انھیں ابدی نیند سونا تھا۔

چند تبرکات

اہم خطوط

یادداشتیں

اور

بیانات

خطوط

مولانا خط لکھنے کے فن میں ماہر تھے۔ ان کے بہترین بیس خط وہ ہیں، جو انہوں نے احمد نگر جیل سے لکھے ہیں۔ ان خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" ہے۔

مولانا آزاد پر کام کرنے والوں نے جو خطوط کے مجموعے مرتب کیے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ "کاروانِ خیال" مرتبہ عبدالشہید خاں، مکاتیب ابوالکلام مرتبہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری نقشِ آزاد مرتبہ غلام رسول مہر۔ اس کے علاوہ ایک سو سات غیر مطبوعہ خطوط اور یاد داشتیں ہیں، جو NATIONAL ARCHIVES کے "مسودات" کے سیکشن میں محفوظ ہیں۔ کچھ خطوط جواہر لال نہرو میوزیم اور لائبریری کے خاص COLLECTION میں ہیں۔ ہم نے اس انتخاب میں مولانا کے کچھ خط مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے نام، اور ان حضرات کے خطوط مولانا کے نام شامل کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔

سیشن کے بعد کریں گے۔ اور اس میں ابھی کافی وقت ہے۔ کانگریس کمیٹی کی طرف سے کوئی سرگرمی نہیں ہو رہی ہے۔ سینٹرل کانگریس کمیٹی کے پاس اصل میں والنٹیئر نہیں ہیں۔ اب تک جو کام ہوئے وہ خلافت کمیٹی کے والنٹیئروں نے کیے جو تعداد میں چار ہزار ہیں۔ اب یہ والنٹیئر مسٹر داس کے چارج میں ہیں وہ چاہیں تو ان سے بہت اچھی طرح کام لے سکتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں دخل اندازی کیے بغیر اپنی رائے دے دی ہے۔

اب میں یہاں رہ کر چاہتا ہوں کہ ایک کامیاب ہڑتال کراؤں، پُرامن اور ضبط و نظم کے ساتھ ہو۔ جو حکومت نہیں چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنا کام مسلمانوں میں مکمل کر لیا اور میں مطمئن ہوں۔

میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ آپ مجھے مطلع کریں کہ کیا میں کانگریس کے سیشن تک رکوں یا خلافت کمیٹی کے سپرد کام کر کے واپس آ جاؤں؟

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس کا جواب بذریعہ تار عنایت فرمائیں۔

آپ کا چاہنے والا بھائی

ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کا خط مہاتما گاندھی کے نام

البلاغ

پرنٹنگ و پبلشنگ ہاؤس

۴۵۔ رپن لین، کلکتہ

۶ دسمبر۔ ۱۹۲۱ء

مائی ڈیر مہاتما جی!

میں اس مہینے کی ۲ تاریخ کو یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے رفیق کار مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی معاون ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور میری غیر موجودگی میں پولس نے تلاشی لی اور سب مسودات اور اہم نوٹس اپنے ساتھ لے گئی۔ اگر یہ چیزیں تلف ہو گئیں تو یہ بات میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہوگی۔

کلکتہ میں جو تشدد کے واقعات ہوئے ہیں، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو ہم نے بمبئی میں سنے تھے۔ حکومت نے یہ مضبوط ارادہ کر لیا ہے کہ اس تحریک کو کچل دے اور اس کی جڑیں اکھاڑ دے وائسرائے نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ صوبائی حکومت، اس تحریک کو کچلنے کے لیے جو اقدام اٹھائے گی تو اس کو پوری مدد ملے گی۔ بہرحال لوگ پُرامن ہیں اور مجھے بھروسہ ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ کانگریس اور خلافت دونوں مسٹر داس کے تحت ہیں، انہیں بحیثیت ڈائریکٹر سارے اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ خیال تھا کہ میں وقت پر واپس نہیں آسکوں گا۔

میرے خیال میں اب ان انتظامات میں دخل اندازی، یا اس اسٹیج پر کوئی تبدیلی ہمارے مقصد کے لیے مضر ثابت ہوگی۔

اب یہ مسٹر داس پر منحصر ہے کہ وہ سول نافرمانی کا پروگرام تیار کریں، جس کے لیے کلکتہ کے عوام پوری طرح تیار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ مسٹر داس ان کاموں کو کانگریس کے

بنام مولانا ابوالکلام آزاد

آشرم۔
سابرمتی
۸رمئی ۱۹۲۶ء

ڈیر مولانا صاحب

جب مجھے آپ کا تار ملا اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ختم ہوگیا تھا۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ کانگریس کا خاص اجلاس بلانے سے کچھ فائدہ ہوگا؟ میرے خیال میں تو اس کا فائدہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب ہمارے پاس کوئی پالیسی یا پروگرام ہو، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ نہ ہماری کوئی پالیسی ہے نہ پروگرام۔ بلکہ ہم ایک دوسرے پہ بداعتمادی کر رہے ہیں اور جہاں بداعتمادی نہیں ہے وہاں واقعات پر اتفاق رائے نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال میں کانگریس کے اجلاس سے اس بددلی اور افسردگی میں اضافہ ہی ہوگا جو آج کل پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ مشکل جو ہماری پریشانی کا سب سے بڑا سبب ہے، اس کو وقت ہی دور کرے گا۔

کاش ہمارے لیے یہی ممکن ہوتا کہ ہم ان ذرائع کو دریافت کر لیتے، جن سے ہمیں فسادات کے اسباب اور ہر فساد کی نوعیت معلوم ہوسکتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس چھوٹے سے کام کرنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔

آپ کا مخلص
گاندھی

ٹیلی گرام مہاتما گاندھی کی خدمت میں

احمد آباد

۶ مئی ۱۹۲۶ء

مہربانی کرکے یہ کوشش کیجیے کہ کانگریس کا خاص اجلاس جولائی یا اگست میں ہو جائے۔ ہندو مسلم معاملات پر گفتگو کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر ہم نے اس کو کھو دیا تو ہماری وہ ساری کوششیں ضائع ہو جائیں گی، جو ہم اس سلسلے میں ایک عرصے سے کر رہے ہیں اور پورا ملک فرقہ وارانہ مذہبی تنازعہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

ابوالکلام

ٹیلی گرام مولانا ابوالکلام آزاد کے نام

۲۰؍اکتوبر ۱۹۳۲ء

تار کا شکریہ، اس وقت جبکہ میں اس الگ تھلگ مقام پر ہوں، صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا کرے ہمیں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان اصلی اتحاد پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہو، جو پورے ہندوستان کی ایکتا کی نشانی ہے، جس کے لیے آپ، میں اور ہمارے کانگریس کے ساتھی ایک مدت سے خواہش مند ہیں اور دعا کر رہے ہیں۔

چونکہ میں صحیح صورت حال اور اصل واقعات سے ناواقف ہوں، صحیح غلط کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، متعلقہ پارٹیاں جس حل کو قبول کریں گی، میرے لیے بھی قابل قبول ہوگا۔ میری نیک خواہشات آپ کے اور ان سب دوستوں کے ساتھ ہیں جو ایک مدت سے انتشار کے شکار اس ملک میں کھوئی ہوئی شانتی کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان جذبات میں میرے ساتھ سردار پٹیل بھی شامل ہیں۔

گاندھی

ٹیلی گرام مہاتما گاندھی کی خدمت میں

کلکتہ

۱۹؍اکتوبر ۔ ۱۹۳۲ء

مسلم لیڈروں کی کانفرنس میں متفقہ طور پر یہ طے ہوگیا ہے کہ اگر ان کی دوسری مانگیں پوری ہو جاتی ہیں تو وہ جداگانہ انتخاب پر زور نہیں دیں گے۔ موجودہ صورت حال میں اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں ہے۔ آپ کی غیر موجودگی ہماری کامیابی کی راہ میں حائل ہے۔ گزارش ہے کہ آپ ہمیں اپنا پیام بھیجیں اور اس بات پر بھروسہ رکھیں کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ابوالکلام

سول نافرمانی تحریک تقریروں کے ذریعہ جاری رکھوں گا۔ ایسے کانگریسیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جن کا میں انتخاب کروں گا اور جو عدم تشدّد کے اصول پر یقین رکھتے ہیں، میں نے ارادہ کرلیا ہے۔ ان حالات کے تحت جو شرائط ہیں، میں ان کی تائید کرنے کو تیار رہوں۔

میں اس نازک وقت میں سول نافرمانی کی تحریک شروع نہیں کروں گا جبکہ لوگوں کی خدمت اور مستقل مدد کی ضرورت ان کے متعلقہ علاقوں کو ہے۔

آپ کا مخلص

گاندھی

بنام مولانا ابوالکلام آزاد

بردولی

۳۰ر دسمبر ۱۹۴۱

ڈیر مولانا صاحب!

ورکنگ کمیٹی میں گفتگو کے درمیان مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے بمبئی کے رزلیوشن کی تشریح میں سخت غلطی کی ہے۔ میں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ کانگریس نے موجودہ جنگ یا دوسری جنگوں میں عدم تشدد کے اصول کی بنا پر حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں حیران تھا کہ سب ممبر بری اس اس تشریح سے اختلاف کیوں کر رہے ہیں اور اس پر مصر کیوں ہیں کہ اس کی مخالفت عدم تشدد کی بنا پر نہیں ہونی چاہیے۔ بمبئی رزلیوشن کو پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ اس کا تھا ہی نہیں۔ اس غلطی کو جاننے کے بعد میرے لیے کانگریس کی رہنمائی اس معاملے میں کرنا ممکن نہیں ہے جس میں جنگ کو روکنے کی کوششیں اس طرح کی جائیں جس میں عدم تشدد ناگزیر نہ ہو۔ میں یہ نہیں کر سکتا مثلاً میں انگریز دشمن کی بنا پر جنگی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں میں خود کو شامل کرنا نہیں چاہتا۔ رزلیوشن کا مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان اس شرط پر جنگ میں حصہ لینے کو تیار ہے کہ اس کو آزادی کی گارنٹی دی جائے۔ اگر یہ میرا نظریہ ہوتا اور ہندوستان کی آزادی کے حصول میں تشدد سے کام لینے کے حق میں ہوتا تب بھی میں آزادی کی قیمت کے طور پر اس میں شریک نہ ہوتا یہاں تک کہ خود کو غیر محب وطن ہونے کا مجرم کہلوانا گوارا کر لیتا۔ یہ میرا پکا عقیدہ ہے صرف عدم تشدد ہی ہندوستان اور پوری دنیا کو اپنے ہاتھوں آپ تباہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔ بہر حال میں اپنے مشن کو جاری رکھوں گا اس میں میرے ساتھ کوئی تنظیم ہو یا افراد ہوں یا میں بالکل اکیلا ہوں۔ اس لیے آپ نے جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی اس سے مجھے سبکدوش کر دیں۔ میں ہر قسم کی جنگوں کے خلاف

کی بندش سے ہے۔ درحقیقت آپ جب یہ کام شروع کیا تو آپ کے ذہن میں اس موضوع کا پورا نقشہ تھا۔ یہ کام بلاشبہ بہت مشکل تھا۔ خاص طور سے اس لیے اور کہ میرے طرز تحریر سے بھی آپ کو براہِ راست کوئی مدد نہیں ملی۔

بعض مقامات پر آپ میری اردو تحریر کو بھی تھوڑا سا بدل دیا۔ کہیں اضافہ کیا کہیں اسے مختصر کر دیا جو انگریزی اسلوب کے لیے موزوں اور مناسب تھا۔ میں نے ان سب مقامات کو بغور دیکھا۔ جہاں جہاں آپ نے تصحیح کی ہے اور یہ دیکھ خوشی ہوئی کہ آپ بعض جگہ میری تحریر کو بہتر کر دیا ہے۔ مگر میرا اسلوب کہیں نہیں بدلا۔ مثلاً وائسرائے کے اعلان نامے پر اظہار رائے کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔

صفحے پر صفحے پڑھ جانے کے بعد بمشکل اس قدر بتانے پر مستعد ہوتا ہے ۔۔۔ یہاں "بمشکل" میرے استعاراتی طرزِ اظہار میں کلیدی لفظ ہے آپ میرے استعارے کے پس منظر کو برقرار رکھا اور اس کا ترجمہ یوں کیا:

> After reading page after page the curtain is at last lifted with hesitation We have a glimpse.

میں "بمشکل" کے ذریعہ جو کہنا چاہتا تھا آپ نے اس میں عبارت کا اضافہ کر کے اس پر اور زور دے دیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری تحریر کو خوب صورت بنایا ہے یہ تو اس کی ایک مثال ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

میں غالباً الہ آباد ۳۰ کو پہنچوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس وقت تک وہاں رکو گے۔

آپ کا مخلص

اے۔کے۔آزاد

بنام جواہر لال نہرو

۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء

مائی ڈیر جواہر لال!

جب ۱۵ مارچ کی صبح کو (ریل میں) آپ نے میرے خطبے کا انگریزی ترجمہ مجھے دیا تو میں نے ایسے ہی اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک مجھے اسے اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب مصروفیت نسبتاً کم ہے۔ اب میں نے اسے اچھی طرح دیکھا اور اسے دیکھ کر بے اختیار میرا دل چاہا کہ اپنی مخصوص اعتدال پسندی بالائے طاق رکھ کر آپ کی دانشوری اور غیر معمولی علمی صلاحیت کو اپنا پُرخلوص خراج تحسین پیش کروں۔ آپ کی انگریزی زبان کی قابلیت اور اس پر جو آپ کو عبور حاصل ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا اب تک میں سمجھتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض بہترین اہلِ قلم کو اس کام کو کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا۔ جبکہ آپ نے اس کام کو بغیر کسی خاص کوشش کے چند گھنٹوں میں کر دیا۔

ترجمہ کا کام بعض لحاظ سے تخلیقی کام سے زیادہ مشکل ہے، کیونکہ اس میں مصنف کے ادبی اسلوب کے ساتھ ساتھ تحریر کی ادبی خوبیوں کو بھی باقی رکھنا ہوتا ہے اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو دونوں زبانوں پر یکساں طور پر عبور رکھتا ہو۔ آپ کے ترجمے میں خاص طور سے میں نے یہ بات محسوس کی کہ آپ نے میری تحریر کی خصوصیات اور میرے اردو کے ادبی اسلوب کو اس خوبی سے برقرار رکھا کہ کوئی تعجب نہیں اگر قارئین یہ سمجھیں اصل میں یہ خطبہ اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں ہی تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کے تعمیری تخیل کی گرفت قابل تعریف ہے کہ آپ نے جزئیات کو بھی اپنی نظروں میں رکھا جس کی وجہ سے مضمون میں روانی اور سلاست باقی رہی آپ نے مکمل طور پر میرے ذہن تک رسائی حاصل کر لی۔ جس کا تعلق میرے طرزِ تحریر میں جملوں کی ساخت اور الفاظ

بنام جواہر لال نہرو

مائی ڈیر جواہر لال!

یونیورسٹی گرانٹ کمیشن ڈرافٹ بل پر جب کیبنیٹ نے غور کیا تھا تو آپ نے یہ رائے دی تھی کہ اسے پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے پہلے یونیورسٹیوں کو بھیجا جائے اور ان کی رائے طلب کی جائے۔

میں نے اس معاملہ پر غور کیا میں سمجھتا ہوں کہ اس ڈرافٹ بل کو یونیورسٹیوں کے پاس اب پھر بھیجنا بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر ہم بھیجیں گے تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ ہم ایک ایسی بات کو جواَب طے شدہ سمجھ لی گئی ہے، پھر غیر ضروری بحثوں کے حوالے کر دیں گے

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے تمام وائس چانسلرز کو بلایا تھا انھوں نے دو دن کے غور و بحث کے بعد تین رزولیوشن پاس کیے۔ یہ بل ٹھیک ٹھیک ان رزولیوشنوں کے مطابق بنایا گیا ہے اور یونیورسٹی کے وائس چانسلرز اب اس کے متوقع نہیں ہیں کہ دوبارہ ان سے مشورہ کیا جائے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ اب یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی شکل میں یہ پاس کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ یونیورسٹیوں کی حالت ایکیڈمک اور ایڈمنسٹریشن، دونوں کے لحاظ سے سخت خراب ہو رہی ہے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن میں اہم تبدیلیاں فوراً ہونی چاہئیں اور اگر موثر طریقہ پر نہیں ہوتیں تو نیشنل لائف کو روز بروز سخت نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن میں یونیورسٹی ایجوکیشن کی دیکھ بھال کا اختیار سینٹرل گورنمنٹ کو دیا گیا ہے، اور سینٹرل گورنمنٹ بھی اپنا فرض انجام دے سکتی ہے کہ ایک ریذیڈنٹ باڈی اس غرض سے قائم ہو۔ اب اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کو کوئی قدم اس بارے میں بھی اٹھانا چاہیے جب یونیورسٹیوں کے موجودہ وائس چانسلر

مولانا کی تحریر کا عکس

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ یونیورسٹیوں کی حالت اکیڈمک اور ایڈمنسٹریشن دونوں کے لحاظ سے سخت خراب ہو رہی ہے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن میں اہم تبدیلیاں فوراً ہونی چاہییں اور اگر موثر طریقہ پر ایسا نہیں ہوا تو نیشنل لائف کو روز بروز سخت نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن میں یونیورسٹی ایجوکیشن کی دیکھ بھال کا اختیار سنٹرل گورنمنٹ کو دیا گیا ہے اور سنٹرل گورنمنٹ یہی اپنا فرض انجام دے سکتی ہے کہ ایک انڈیپنڈنٹ باڈی اس غرض سے قائم ہو۔ اب اگر آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کو کوئی قدم اس بارے میں نہیں اٹھانا چاہیے جب یونیورسٹیوں کے موجودہ وائس چانسلروں میں سے ایک ایک آدمی اس سے اتفاق کرے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کا اتفاق کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ وائس چانسلروں اور ایگزیکٹو باڈیز کے ممبروں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یونیورسٹیوں کی خرابیوں کے لیے ذمہ دار ہیں اور کبھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ کوئی دروازہ اصلاح کا کھلے۔ اس صورت میں بل لانا اور اسے بار بار رائے کے لیے یونیورسٹیوں کو بھیجنا بیکار سے ہیں۔ یونیورسٹی ایجوکیشن اصلاح کے مقصد کو گڈ بائی کہنا چاہیے اور بل کو سلیکٹ کمیٹی کے لیے ڈراپ کر دینا چاہیے

بنام مولانا ابوالکلام آزاد

واردھا

۱۶ / مئی ۱۹۴۰ء

مائی ڈیر مولانا!

آپ کا تار ملا۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کی تاریخ ۱۵/جون آپ نے منظور کر لی۔ شکریہ۔ اس تاریخ میں یہ سہولت ہے کہ میں اب سرحدی صوبوں کے دورے پر جا سکوں گا اور ۱۲/جون کو واپس آجاؤں گا۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کسی فرد کی آسانی کے لیے ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو ان سب باتوں کا خیال کیے بغیر مقررہ وقت پر ہونا چاہیے۔ مجبوری کی بات اور ہے۔ میرا خیال ہے اور مہاتما جی بھی اس سے متفق ہیں کہ ابھی ہمیں کچھ انتظار کرنا چاہیے کہ موجودہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ حالات کے بدلنے کی رفتار بہت تیز ہے۔ ایک مہینے میں بہت کچھ تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ بات مناسب ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ جلدی نہ ہو۔

میں یہاں آج ہی آیا ہوں اور مہاتما جی سے گفتگو ہوئی ہے اور مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اس پر ان کا ردعمل بھی کم و بیش وہی ہے جو میرا ہے۔ شاید ہی آپ کی نظر سے میرا وہ بیان گزرا ہو جو پانچ چھ دن پہلے میں نے پریس کو دیا تھا۔ اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ راجندر بابو کا اس دن کا بیان پڑھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اب مجھے ریڈیو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آصف علی نے بھی اس قسم کی کوئی اپیل سیاسی پارٹیوں سے کی ہے کہ ساتھ مل کر دفاع میں انگریزوں کی مدد کریں۔ میرے خیال میں آصف علی نے یہ بہت نامناسب بات کی ہے ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ان کے بیان کا یہ مطلب

میں سے ایک ایک آدمی اس سے اتفاق کرے، تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کا اتفاق کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ وائس چانسلروں اور ایگزیکٹو باڈیز کے ممبروں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یونیورسٹیوں کی خرابیوں کے لیے ذمہ دار ہیں اور کبھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ کوئی دروازہ ریفارم کا کھلے۔ اس صورت میں بل بنانا اور اسے بار بار رائے کے لیے یونیورسٹیوں کو بھیجنا بیکار ہے ہمیں یونیورسٹی ایجوکیشن ریفارم کے مقصد کو گڈ بائی کہنا چاہیے اور بل کو ہمیشہ کے لیے ڈراپ کر دینا چاہیے۔

(اس خط کا مسودہ مولانا کی لکھائی میں دستیاب ہے اس پر مولانا کے نہ تو دستخط ہیں اور نہ تاریخ درج ہے)۔

تیار نہیں ہیں۔ ہندوستان کی آزادی تسلیم کی جانی چاہیے۔ انگریزوں کی نوآبادی یا اس طرح کی کسی اور حیثیت سے نہیں۔ ہندوستانی عوام اپنا دستور بھی قانون ساز کے ذریعے خود بنائیں گے۔ اور اس کام کے لیے آدمیوں کا کوئی چھوٹا سا گروپ قابل قبول نہیں ہوگا۔ صرف اس بنیاد پر ہم بات کرنے کو تیار ہیں۔ اگر اسی بنیاد پر گفتگو نہیں ہو سکتی تو بیکار باتوں سے کیا فائدہ۔ انگریز سلطنت اب خاتمہ پر ہے۔ عنقریب یہ قصہ پارینہ ہونے والی ہے۔ اب صرف یہ بیوقوفی اور غرور ہی تو ہے کہ اس کے باوجود انگریز حکومت ہندوستان میں آمرانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کے رویہ میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ انگریز پارلیمنٹ کے ممبروں کا رویہ ہمارے ساتھ سرپرستانہ اور حاکمانہ ہے اور وہ جس انداز سے ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں وہ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ایسے تباہی کے آثار بھی اگر ان کی آنکھیں نہیں کھول سکتے اور ان کی آنکھیں سچائی کا سامنا نہیں کر سکتیں تو پھر ہم ایسے نابینا لوگوں کا ساتھ کیوں دیں

یہ کہنا کہ نازی ازم انگریزی شہنشاہیت سے زیادہ بدتر ہے اس لیے ہم انگریزی راج کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ہماری انتہائی درجے کی توہین ہے اگر ہم اس قدر مجبور و لاچار ہیں کہ ہم خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ بہتر ہے کہ جلد از جلد ہمارا وجود ختم ہو جائے۔ ہم معاملات کو نہیں بدل سکتے مگر ہم ہر قسم کی فرماں روائی اور تسلط کے خلاف لڑیں گے۔

گاندھی جی نے مجھے آپ کا وہ خط دکھایا جو آپ نے انھیں ڈاکٹر گوپی چند اور سردار سمپورن سنگھ کے تقرر بحیثیت پنجاب اسمبلی پارٹی کے لیڈر کے بارے میں لکھا تھا۔ میں بالکل آپ سے متفق ہوں کہ یہ نامناسب تھا مگر یہ بات میرے ذہن میں صاف نہیں ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ میں جلدی ہی دو دن کو ستیہ گرہ کیمپ میں شرکت کرنے کو جا رہا ہوں۔ افتخار نے مجھے بلایا ہے اگر آپ مجھے کچھ ہدایات دینا چاہیں تو جلدی بھیجیے۔ گاندھی جی کے خط کے اپنے جواب کی ایک کاپی بھیج رہا ہوں۔ یہ بھی کانگریس اور اکالیوں سے متعلق ہے۔

میرا پروگرام فی الحال یہ ہے مگر بالکل صحیح تاریخوں کا تعین ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

لکھنؤ میں پی سی سی کی میٹنگ کے لیے مئی ۱۸، ۱۹، ۲۰،

الہ آباد میں پی سی سی کی میٹنگ کے لیے مئی ۲۱، ۲۲، ۲۳،

سمجھا جائے گا کہ ورکنگ کمیٹی اس لائن کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہے جبکہ جہاں تک مجھے علم ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

راجندر بابو کا ایک خط ۱۴ مئی کا لکھا ہوا آیا۔ اس کی ایک کاپی آپ کو بھیجی گئی۔ گاندھی جی کے کہنے کے مطابق اس کا جواب میں نے لکھا ہے اس کی نقل بھی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہوگا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یو پی سی سی اپنی ۱۸ تاریخ والی میٹنگ میں اس کی روشنی میں ایک رزولیوشن پاس کرے گی۔

میرا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف ہے کہ ہماری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں پہلے کی طرح اپنی تنظیمی اور دوسری تیاریوں کو جاری رکھنا چاہیے۔ ستیہ گرہ کی ٹریننگ اور اس کے لیے نئے ناموں کو درج کرنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ستیہ گرہ جلدی شروع نہیں کرنا چاہیے چاہے ہم اس کے لیے تیار ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن مرکزی اقتدار کے کمزور ہونے کے امکانات کی صورت میں جو بھی حالات ہوں ہمیں ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ہندوستان کے دفاع میں ہاتھ ملانے کی بات مضحکہ خیز ہے۔ دفاع کس کے خلاف؟ انگریز سلطنت کی مدد کے لیے؟ میرے خیال میں یہ غلط اور توہین آمیز ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی موثر کام کر سکیں۔

ہندوستان کا دفاع بھی ہم ستیہ گرہ کی تحریک کو آگے بڑھا کر اس کے تحت کر سکتے ہیں۔ مجھے تو غیر ملکی حملے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے تو اندرونی خلفشار کا خدشہ ہے اور اس کا بھی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی مداوا نہیں ہے کہ ہم خود کو ستیہ گرہ کے ذریعہ منظم کریں۔

میرا ذہن اس سلسلے میں بالکل صاف ہے کہ ہم نے جو پوزیشن اختیار کی ہے اس سے ایک انچ بھی نہیں ہٹنا چاہیے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ نئی انگریز حکومت یا وائسرائے جو جال بچھائے گا ہم اس میں نہیں آئیں گے۔ میرے خیال میں وہ کچھ اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ گاندھی جی اور دوسرے اور لوگوں کو مدعو کریں گے یا پھر کچھ مبہم بیانات دیں گے۔ اور ان سب باتوں کا ہمارا صاف جواب ہونا چاہیے کہ ہم کسی طرح شہنشاہیت کی حفاظت میں تعاون دینے کو

بنام مولانا ابوالکلام آزاد

الٰہ آباد

۵ مارچ ۱۹۴۲ء

مائی ڈیر مولانا صاحب!

مجھے آپ کا تین مارچ کا لکھا ہوا اے۔آئی۔سی۔سی کے آفس کی ویمنز برانچ کے بارے میں خط ملا۔ میں آپ کو تار نہیں بھیج رہا ہوں کیونکہ چند لفظوں میں زیادہ کہنا مشکل ہے۔

ایڈوائزری کمیٹی بنانے کا آپ کا خیال اچھا ہے۔ لیکن جس کمیٹی میں پورے ہندوستان سے لوگ لیے جائیں گے۔ اس کے جلسے بہت ہی کم ہو جائیں گے۔ لیکن بنیادی مسائل پر غور کرنے کے لیے کبھی کبھی اس کے جلسے ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اس طرح کی کمیٹی مقرر کرنے کا سوال ہے وہ بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ اس کو بنانے میں ہمارا زاویۂ نظر کیا ہوگا۔ اس میں کم و بیش صوبائی نمائندے ہوں گے یا یہ پھر کم سے کم ہندوستان کے بڑے حصّوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی؟ اگرچہ یہ بات نظری طور پر ٹھیک لگتی ہے۔ لیکن وہی مسئلہ ہے کہ ان لوگوں کا آپس میں ملنا کم ہوگا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا ایک طریقہ ممکن ہے۔ اس میں ایسے زون کے نمائندے ہوں جو ایک ایڈوائزری کمیٹی سے لیے جائیں اور ان نمائندوں کو مقرر کرنے کے لیے مقامی یا صوبائی لوگوں سے کسی حد تک مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہمیشہ اس کی ضرورت نہیں ہے آپ کی مجوزہ کمیٹی سے ممکن ہے کہ بہتری ہو اور یہ سرگرمیاں کے لیے مددگار ہو۔ آپ نے جو نام تجویز کیے ہیں، ٹھیک ہیں۔ کچھ اور نام بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں چنیدہ لوگوں کا انتخاب مشکل ہوگا۔ کیا اس طرح کی کمیٹی میں سروجنی نائیڈو کی شرکت بہتر نہیں ہوگی؟ ورکنگ کمیٹی کی ممبر کی حیثیت سے بے شک انہیں ایڈوائزری کمیٹی میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب بھی ضرورت ہو ان کو ایڈوائزری کمیٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

اے آئی سی سی کی عورتوں کی شاخ کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اسے عورتوں سے

لاہور میں پی سی سی کی میٹنگ کے لیے مئی ۲۴، ۲۵،
پشاور میں پی سی سی کی میٹنگ کے لیے مئی ۲۶، سے ۳۰، تک
سری نگر وکشمیر میں پی سی سی کی میٹنگ کے لیے مئی ۳۱، سے ایک ہفتہ تک

آپ کا مخلص
جواہر لال نہرو

وجے لکشمی آج دہلی جارہی ہے وہ اس مسئلے پر ارونا آصف علی سے گفتگو کرے گی اور میں اس خط کی کاپی مسز کرپلانی کو بھی بھیج رہا ہوں۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ میری بہن اس سال آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی صدر ہے وہ اور دوسری کانگریسی عورتیں اس ویمنز کانفرنس کے ذریعے کام کررہی ہیں۔ کچھ صوبوں خاص طور سے گجرات میں کانگریسی عورتیں ویمنز کانفرنس چلارہی ہیں۔ یہ اچھا ہوگا کہ ہم ہر قسم کا تعاون جہاں تک ممکن ہو ویمنز کانفرنس کو ان کاموں میں دیں جو ہمارے خیال میں ہونے چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہندوستان کے اور حصوں میں ممکن نہ ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی طرح کی تنظیمیں بنانے میں ہماری قوت اور محنت ضائع ہوگی۔

آپ کا مخلص

جواہر لال

متعلق ہندوستان بھر میں ہونے والے کاموں کا مواد جمع کرنا چاہیے اور اسے ہندوستان کی سب عورتوں کی تنظیموں سے رابطہ رکھنا چاہیے۔ خاص طور سے کانگریسی عورتوں کے کاموں کا جو انھوں نے کانگریس کے تحت کیے ہیں۔ اور اسے ایسی تجاویز پیش کرنا چاہیے جو ان کے مختلف کاموں میں رابطہ پیدا کریں۔ اور اسے اس سلسلے میں صوبائی کانگریس کمیٹی کو خاص ہدایات بھیجی جائیں۔ وہ براہ راست کوئی کام نہیں کر سکتی نہ کوئی تنظیم بنا سکتی ہے۔ پھر میں کہوں گا موجودہ نازک دور میں لمبے عرصے کے پروگراموں پر زیادہ توجہ نہیں دینا چاہیے بلکہ فوری مسائل پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ کانگریس نے خاکہ بنایا تھا عورتیں خود اپنی مدافعت میں اپنی استعداد کے مطابق مقامی پروگراموں کو خود چلائیں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ایسی کوششیں کی جائیں کہ عورتیں اسی طرح سوچنے لگیں۔ کیونکہ عوام کی اخلاقی حالت کا انحصار بہت کچھ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ عورتیں کیا سوچتی اور کیا کرتی ہیں۔ اگر ان کو اپنے علاقوں میں کام دیا جائے گا تو ان میں مجبوری اور لاچاری کا احساس کم ہوگا اور وہ یہ محسوس کریں گی کہ وہ خود ان اہم کو آپریٹیو کاموں کا ایک حصہ ہیں۔ کچھ علاقوں میں فوری مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں اس اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے بڑھتی ہیں۔ اس کا سامنا کرنے میں خود عورتیں بہت مدد کر سکتی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ میں اپنے تھوڑے سے تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ عورتیں یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ موجودہ صورت حال میں وہ کیا کریں۔ اگر ان کی ذرا بھی رہنمائی کی جائے تو اس کے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ میں اس بات کے بالکل خلاف ہوں کہ عورتوں کو مجبور ولاچار سمجھا جائے جو خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتی ہیں۔ ان کو خطرے کے مقامات سے بھاگ جانا چاہیے کسی بھی زمانے میں یہ بڑی غلط پالیسی ہے جس سے وہ اور زیادہ لاچار و مجبور ہو جائیں گی جتنی کہ وہ ہیں۔ اور موجودہ زمانے میں یہ بات بالکل بے معنی ہے کہ کیونکہ خطرے کے مقام کو آپ محدود نہیں کر سکتے کیونکہ ہر جگہ خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ گھر کی چہار دیواری میں بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے کو حل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عورتوں کو اس کا احساس دلایا جائے کہ یہ مسائل ہیں اور وہ اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور ذہنی طور پر ان کو اس کے لیے اور اس طرح کے اور معاملات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میری بہن

جلیانوالہ باغ کی برسی پر مولانا آزاد کا پیغام

۱۳ر اپریل ۱۹۳۹ء

"یہی زمین ہے جہاں موت کے سکون نے ہماری نئی قومی جدوجہد کا ہنگامہ بیدار کیا تھا۔ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں کا خون ایک ساتھ اور ایک ہی وقت بہا، اور اسی موت کے خون سے ہم نے اپنے لیے زندگی کا خون بہم پہنچایا۔ بیس سال گزر گئے۔ ہر سال ہم ۱۳ر اپریل کو اس واقعہ کی یاد میں جمع ہوتے ہیں اور آج بھی اسی تاریخ نے ہمیں یہاں جمع کر دیا ہے۔ میں آج اسی سرزمین پر، اسی مہینے اور اسی تاریخ میں ہر ہندو، مسلمان اور سکھ سے درخواست کروں گا کہ اس واقعہ کی یاد اپنے دل کے ایک ایک ریشے کے اندر تازہ کرے اور پھر اپنے اعتقاد اور عمل کا احتساب کر کے دیکھے کہ اس واقعہ نے زندگی اور حرکت کا جو پیغام ہمیں دیا تھا وہ ہمارے دل و دماغ پر ثبت ہے یا محو ہو چکا ہے۔"

مولانا کی تحریر کا عکس

یہی زمین ہے جہاں موت کی خاموشی نے ہماری نئی قومی

بیداری کا ہنگامہ بیدار کیا تھا۔ ہندوؤں، مسلمانوں

سکھوں کا خون ایک ساتھ اور ایک ہی وقت بہا اور

اسی موت کے خون

سے ہم نے اپنی زندگی کا خون بہم پہنچایا تھا

بیس سال گزر گئے۔ ہر سال ہم ۱۳ اپریل کو

اس واقعہ کی یاد میں جمع ہوتے ہیں اور آج بھی

اسی تاریخ نے ہمیں یہاں جمع کر دیا ہے =

میں آج یہاں اسی سرزمین پر کھڑا ہو کر اسی مہینے اور تاریخ میں

ہر ہندو، مسلمان اور سکھ سے درخواست کروں گا کہ اس واقعہ

کی تمام یاد اپنے دل کے ایک ایک ریشے کے اندر

تازہ کریں اور پھر اپنے اعتقاد اور عمل کا احتساب

کریں اور دیکھیں کہ اس واقعہ نے زندگی اور

حرکت کا جو پیام ہمیں دیا تھا وہ ہمارے

دل و دماغ پر ثبت ہے یا محو ہو چکا ہے

پنڈت جواہر لال نہرو
اور
مولانا آزاد
کے پیغامات کا تحریری عکس

VICEREGAL LODGE,
SIMLA

The children of today are the citizens of the future. They must therefore prepare themselves so that they can perform their arduous tasks with honour and dignity to themselves and glory to their country and their nation.

[illegible]

طالب علموں کے لیے پیغام

کاٹھیاواڑ کچھ کے طالب علموں کا ایک کنونشن راج کوٹ میں ۱۳ اور ۱۴ اپریل کو ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے لیے مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو، دونوں نے اپنے پیغامات بھیجے تھے۔ یہ دونوں پیغامات ان دونوں کی لکھائی میں اردو اور انگریزی میں ایک ہی صفحے پر درج ہیں۔

پریس ریلیز

نظریۂ پاکستان مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے

۱۷؍اپریل ۱۹۴۶ء

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جناح صاحب کی پاکستان کی اسکیم کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بہت سی قومیتیں جن کے مذہب الگ ہیں، رہتی ہیں، مگر ان میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان ہیں، تو ان کی ریاستیں بھی جداگانہ ہونی چاہئیں۔ جب مسٹر تھامس ایڈورڈ نے جناح صاحب کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ ہندوستان کے ہزاروں شہروں، گاؤں اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں ہندو مسلمان ایک ساتھ بھی تو رہتے ہیں، تو جناح صاحب نے جواب دیا کہ یہ امر کسی طرح ان کی علیحدہ قومیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چونکہ جناح صاحب کا خیال ہے کہ ہر شہر، ہر گاؤں اور دیہات میں جہاں یہ دونوں قومیں ہیں، ان میں برابر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے، اس لیے یہ مناسب ہے کہ ان دونوں کی ریاستیں الگ الگ ہو جائیں۔

میں تھوڑی دیر کے لیے اس پر تیار ہوں کہ اس مسئلے کے اور سب پہلوؤں کو نظرانداز کر کے اسے صرف مسلم مفاد کے پیش نظر رکھ کر اس پر سوچوں۔ اس پر بھی تیار ہوں کہ اس اسکیم سے واقعی مسلمانوں کو فائدہ پہنچے تو نہ صرف میں اس کو قبول کر لوں گا بلکہ لوگوں کو بھی اس کو ماننے پہ تیار کروں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم کو خالص مسلم فرقہ پروری کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یہ ان کے لیے سودمند نہیں ہے۔ نہ اس سے ان کے اندیشے جو بالکل جائز ہیں دور ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر یہ اسکیم مان لی جائے تو اس کے کیا نتائج ہوں گے۔ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، دوسری میں ہندوؤں کی۔ اور ہندوستان کی ریاست میں ساڑھے تین کروڑ

پریس ریلیز

ہندوستان ٹائمز اگست ۱۹۴۵ء

بیگم آزاد فنڈ

مجھے اخباروں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ملک کے متعدد حصوں میں بیگم آزاد کی یادگار قائم کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ میں ان سب دوستوں کا دل سے مشکور ہوں۔ جنھوں نے از راہ محبت اس مشکل کام کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو میری رائے ہے اس کا اظہار کر دوں۔ میرے خیال میں کسی شخص کی پبلک یادگار کچھ اصولوں کے تحت قائم ہونا چاہیے۔ یہ یادگار ان لوگوں کی قائم ہونا چاہیے جنھوں نے ملک کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہو۔ یا پھر لوگوں کی نظر میں کسی امتیاز کی وجہ سے خاص مقام رکھتے ہوں اگر ان اصولوں کے تحت ہم اس مسئلے پر سوچیں تو یہ یادگار قائم کرنے کا خیال ہم کو صحیح نہیں معلوم ہوگا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان سب دوستوں سے درخواست کروں جو یہ فنڈ جمع کر رہے ہیں، اب اس کو جمع کرنا موقوف کر دیں اور جو فنڈ جمع ہو گیا ہے اسے کملا نہرو میموریل ہاسپٹل الٰہ آباد میں منتقل کر دیں ان سب حضرات کا میں ایک مرتبہ پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نامبارک سازش سمجھ لیا اور اس کی مخالفت شروع کر دی اور انھیں اس میں ہندستانی مسلمانوں اور ہندوستان کے اس پار جو مسلم ریاست کی تشکیل ہو گی اس کے مسلمانوں کے گٹھ جوڑ سے جو حالات پیدا ہوں گے اس کے اثرات کا انھوں نے اندازہ کر لیا تھا۔ ان کی مخالفت سے مسلم لیگ کے پاکستان کے حامیوں کو اور تحریک ملی۔ اور سادہ لوح مسلمانوں نے بے بنیاد منطقی دلائل سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر اس کی مخالفت ہندو کر رہے ہیں تو یہ ضرور مسلمانوں کے لیے مفید ہو گا۔ جنونی اور جذباتی ماحول میں صحیح طور پر سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں خاص طور سے جوشیلے مسلمان نوجوانوں نے اس کی زور و شور سے حمایت شروع کر دی۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کی یہ جنونی اور جذباتی کیفیت ختم ہو جائے گی اور وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو وہ بھی یہ بات سمجھ لیں گے۔ یہ پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کے مفاد میں نہیں ہے۔

میں ایک فارمولا بنانے اور کانگرس سے اسے منظور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جس میں پاکستان اسکیم میں جو خوبیاں ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور کمیوں اور خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان اسکیم کی بنیاد اس اندیشے پر ہے کہ مرکز میں ہندو اکثریت ہو گی اور وہ مسلمانوں کے اکثریت والے علاقے میں دخل اندازی کرے گا۔ کانگرس اس اندیشے کو اس طرح دور کر سکتی ہے کہ صوبائی یونٹوں کو اس طرح خود مختار کر دے کہ بقیہ اختیارات (RESIDUARY POWER) بھی صوبوں کو دے دیے جائیں۔ مرکز کے متعلق امور کی دو فہرستیں دی جائیں۔ ایک لازمی ہو، دوسری امتیازی۔ تاکہ اگر کوئی صوبائی یونٹ چاہے تو خود سارے امور کے انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھے سوائے چند کہ جو مرکز کے اختیار میں ہوں گے۔ اس طرح مسلم اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کو اس کی آزادی ہو گی کہ پوری طرح وہ اپنے طور پر اپنے صوبوں کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ان مسائل میں مجموعی طور پر پورے ہندوستان کے معاملات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

مسلمان چھوٹی چھوٹی اقلیتیں بن جائیں گے۔ سترہ فیصدی یوپی میں، بارہ فیصدی بہار میں نو فیصدی مدراس میں اور اس طرح ان کی حیثیت اس سے زیادہ کمزور ہو جائے گی، جتنی اب ان صوبوں میں ہے، جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال سے یہ مقامات ان کا وطن ہیں جہاں انھوں نے اپنی تہذیب و کلچر کے مشہور ترین مراکز قائم کیے ہیں۔

وہ ایک صبح اٹھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ جلاوطن اور غیر ملکی ہیں، وہ جو پہلے ہی سے معاشی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہیں، اب ایک خالص ہندو راج میں، اس کے رحم و کرم پر رہیں۔

دوسری طرف پاکستان میں بھی ان کی حالت کمزور اور غیر محفوظ ہوگی کیونکہ پاکستان میں کہیں بھی ان کی اتنی اکثریت نہیں ہوگی کہ جتنی ہندوستان کی ریاست میں ہندوؤں کی ہوگی۔ ان کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ وہاں کی تعلیمی، معاشی اور سیاسی قیادت بھی وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہوگی اور اگر یہ نہ بھی ہو اور پاکستان میں مسلمانوں کی بہت کثرت بھی ہو تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کیسے حل ہو جائیں گے۔ دونوں ریاستوں میں ٹکراؤ ہوگا اور ایک دوسرے کی اقلیتوں کا ان کے پاس کوئی حل نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ ایک دوسرے کی اقلیتوں کی تبدیلی اور ان کے مال و جائداد کو ضبط کرنے کا سسٹم شروع کریں۔ اس لیے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں ان کی وہ حیثیت ہوگی جو ایک بڑی ریاست، جیسے انڈین یونین کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہوتی۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب پاکستان مسلمانوں کے مفاد کے اس قدر خلاف ہے تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے لیے اس میں کیا کشش ہے جو وہ اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا جواب چند ہندو فرقہ پرستوں کے رویّے میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کی بات شروع کی تو انھیں اس منصوبے کو اتحادِ اسلامی کی

ایشین ریلیشنز کانفرنس کی اہمیت

ہندوستان ٹائمز کے لیے

مارچ ۱۹۴۷ء

ایشین ریلیشنز کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے۔ اس قسم کی پہلی کسی کانفرنس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ہندوستان میں جب بدھ ازم کا بہت زور تھا، اس وقت ضرور بھکشوؤں کی ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی تھی، جس میں سیلون، برما، اور دور دراز انڈونیشیا سے نمائندے آئے تھے اور انھوں نے اس میں شرکت کی تھی، مگر اس کانفرنس کی نوعیت مذہبی تھی، اس لیے اس میں بدھ مت سے متعلق مسائل پر بحث ہوئی تھی۔ ان دنوں انسانی دلچسپیوں کا دائرہ نہ اتنا وسیع تھا نہ اتنے مختلف النوع کلچر تھے۔ مگر اس کانفرنس میں جو دہلی میں ہو رہی ہے، اس میں مختلف ملکوں کے مذہبی اور قومی نمائندے شرکت کر رہے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ نے بھی مسلمان علماء کی ایک بہت بڑی کانفرنس بلائی تھی کہ شیعہ اور سنی فرقوں کے اختلافات کے سبب اسلام کا اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ شیعہ اور سنی فرقے بھی الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں مفاہمت کرانے کے لیے بہت بڑا اجتماع بغداد میں ہوا تھا۔ ایران، بخارا، سمرقند اور دوسرے مذہبی فکر اور مذہبی تعلیم کے مراکز کے نمائندے اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی نوعیت بھی وہی تھی جو ہندوستان میں منعقدہ بھکشوؤں کی کانفرنس کی تھی۔ یہ بھی مذہبی نوعیت کی کانفرنس تھی جس میں ایک ہی عقیدے کے لوگوں نے شرکت کی تھی۔ ان کانفرنسوں میں انسانی زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کو زیر بحث نہیں لایا گیا تھا۔ جیسا کہ اس کانفرنس میں لایا جا رہا ہے۔

یہ پہلا موقع ہے جب ایشیائی لوگ ایک مشترک پلیٹ فارم پر اپنے مشترک مسائل پر گفتگو کرنے کو جمع ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لوگ اپنی اپنی قومی آزادی کی لگن کا تقابل بھی

اس وقت ہندوستان کی جو صورت حال ہے اس میں ایک مرکزی متحد حکومت کے قیام کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوگئی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تباہ کن کوشش بھی ناکام ہوگی۔ اس لیے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ صرف کانگریس کا فارمولا ایسا ہے جس میں اس کی پوری گنجائش ہے کہ جس میں صوبوں کو اور مجموعی طور پر پورے ہندوستان کو ترقی کے مواقع فراہم ہوسکتے ہیں۔ کانگریس کا فارمولا اس مسلم اکثریت کے اس اندیشے کو بھی دور کرتا ہے جس نے پاکستان اسکیم بنائی ہے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں ان کو خالص ہندو راج میں رہنا ہوگا۔

میں بھی ان لوگوں میں ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ فرقہ وارانہ اختلافات اور تلخی ہندوستان کی زندگی کا عارضی دور ہے۔ اور مجھے پورا الیقین ہے کہ یہ دور اس وقت ختم ہوگا جب ہندوستان کے ہاتھ میں خود اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ مجھے اس موقع پر مسٹر گلیڈاسٹون کا قول یاد آتا ہے کہ پانی سے ڈرنے والے کا بہترین علاج یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈھکیل دیا جائے کہ وہ تیرنا سیکھ لے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ بات اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی کہ وہ اپنے تصوّر میں سوچ رہا تھا۔ جب ہندوستان اپنی ذمہ داری خود سنبھالے گا اور اسے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار مل جائے گا تو یہ فرقہ وارانہ تناؤ شک وشبہات سب ختم ہو جائیں گے اور وہ جدید مسائل کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلافات ہوں گے مگر ان کی نوعیت معاشی ہوگی، سیاسی نہیں سیاسی پارٹیوں کے درمیان بھی اختلافات ہوں گے مگر ان اختلافات کی بنیاد مذہب نہیں سیاست ہوگی۔ ملک کی نئی پالیسیوں اور پروگرام کے خاکے قومیت کے بجائے کلاس کی بنیاد پر بنیں گے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف خوش فہمی ہے، حالات ممکن ہے ایسے نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ نو کروڑ مسلمان ایک عنصر بن جائیں تو انھیں کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اور جو بھی حالات ہوں ان کے پاس اتنے اختیارات اور قوت ہوگی کہ وہ خود اپنی حفاظت کرسکیں گے۔

(یہ بیان پریس کے لیے ۱۶ اور ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو جاری ہوا تھا۔ یہ اقتباس جو اس انتخاب میں شامل ہے وہ ایسوسی ایٹ پریس نے جاری کیا تھا۔)

دیتا ہوں جو اس کانفرنس کے روح و رواں ہیں۔ اس کانفرنس کی نوعیت غیر سیاسی اور غیر جانب دار ہے، اس کے لیے میں ان کی فہم و بصیرت کی داد دیتا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس کانفرنس میں محدود سیاست اور فرقہ وارانہ پارٹی بندی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس کانفرنس سے وسیع انسانی کلچرل نقطۂ نظر کو فروغ ملے گا۔ اور یہ سب شرکائے کانفرنس میں باہمی مفاہمت اور رفاقت کا احساس پیدا کرے گی۔

ہم ان سب ملکوں کے مشکور ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی دعوت قبول کی. یہ سب لوگ دور دراز مقامات سے یہاں آئے۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ سب لوگ جب جائیں گے تو اپنے ساتھ ہندوستان سے دوستی اور نیک خواہشات کا پیغام لے جائیں گے۔

(یہ بیان ہندوستان ٹائمز کے ضمیمے کے لیے خاص طور سے تحریر کیا گیا تھا۔)

کریں گے۔ یہ اس پر غور کریں گے کہ وہ کون سی معاشی قوتیں ہیں، جن سے ان کے رسم و رواج تشکیل پاتے ہیں، اور مشترکہ طور پر ان اقدامات کا یقین کریں گے، جن کو اٹھانے سے ان کے عوام بھرپور اور اچھی زندگی گزار سکیں۔

ان ڈیلی گیٹوں میں خواتین بھی شامل ہیں، جو مختلف ملکوں سے آئی ہیں۔ تاریخ میں پہلی دفعہ یہ خواتین ایشیائی خواتین کے مسائل پر غور کریں گی۔ اس قسم کا اجتماع پہلی مرتبہ ہو رہا ہے۔

اس کانفرنس میں ایسی تنظیم کے ڈھانچے کی بنیاد ڈالی جانی چاہیے جو یہاں جمع لوگوں کے باہمی اشتراک کا وسیلہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ابھی اس کو قائم نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اس کانفرنس میں اس پر گفتگو ہونا چاہیے کہ یہ تنظیم کن خطوط پر قائم کی جائے اور اس کا طریقۂ کار کیا ہو۔

میرے خیال میں ایک انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آنا چاہیے، اس کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی ہو، جو اس کانفرنس میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ انسٹی ٹیوٹ صرف کانفرنسیں ہی نہ بلائے بلکہ لائبریریاں قائم کرے جن میں ان سب ممالک کا جدید ادب ہو، جو اس کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں۔ اس کو اگر ماہانہ نہیں ایک سہ ماہی رسالہ نکالنا چاہیے، جس میں ان امور پر غور و فکر باہمی مفاہمت سے ہونا چاہیے، جو سب مشرق کی لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ ایشیائی لوگوں کی یک جہتی کی تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہندوستان پر ڈالی گئی ہے۔ اور اس نے اس میں سبقت لی۔ اب وہ وقت آگیا ہے جب اس کے لیے اور مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ہماری دنیا مثالیت پسندوں کا خواب نہیں بلکہ حقیقی واقعات کا صاف اور واضح بیان ہے۔ وقت اور فاصلے اب انسانی اتحاد کے مقاصد کے تابع نہیں ہیں اس کانفرنس میں ایک ایسی عالمی کلچرل کانفرنس کا خاکہ بنانا چاہیے، جس میں صرف مشرق ہی کے نہیں مغرب کے لوگ بھی حصہ لے سکیں۔ میں ان لوگوں کو مبارک باد

حیات ابوالکلام
کے
تاریخ وار واقعات

عید کا چاند

ہم نے ایسے جدید طریقے ایجاد کر لیے ہیں، جن کے ذریعے ہمیں خبریں وقت پر مل سکتی ہیں، ہمیں ان کا پورا استعمال کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں ہمیں کوئی ایسا طریقہ استعمال کرنا چاہیے، جس سے ہندوستان میں ہر جگہ ایک ہی وقت رمضان اور عید کی پہلی تاریخ مانی جائے۔

یہ مشکلات اس لیے پیش آتی ہیں کہ علما حضرات لکیر کے فقیر ہیں، چاند نکلنے کی تار برقی سے جو اطلاع دی جاتی ہے انھیں اس کی "صحت" میں شبہ ہوتا ہے۔ بہرحال ہمیں اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھنا چاہئیں، رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ لوگ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

(یہ نوٹ مولانا نے جناب محمد صالح کے خط کے جواب میں بول کر ۱۸ جولائی ۱۹۵۴ء کو لکھوایا تھا)

حیاتِ ابوالکلام کے
تاریخ وار واقعات

۱۸۸۸ء	۱۷ راگست، پیدائش مکہ معظمہ
۱۸۹۲ء	رسم بسم اللہ
۱۸۹۸ء	آمد ہندوستان۔ آغاز شاعری
۱۸۹۹ء	والدہ کی وفات
۱۸۹۹ء	ماہنامہ "نیرنگِ خیال" کا کلکتہ سے اجراء
۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء	شادی
۱۹۰۱ء	۲۲ رجنوری ہفتہ وار "المصباح" کا اجراء
۱۹۰۲ء	۵ رجنوری قدیم ترین دستیاب تصنیف "اعلانِ الحق"
۱۹۰۲ء	ہفتہ وار "احسن الاخبار" کلکتہ کی ادارت
۱۹۰۳ء	درس نظامی سے فراغت۔
۱۹۰۳ء	مارچ ماہنامہ "خدنگ نظر" لکھنؤ کے معاون مدیر
۱۹۰۳ء	"ایڈورڈ گزٹ" شاہجہاں پور کی ادارت۔
۱۹۰۳ء	۲۰ رنومبر ماہنامہ "لسان الصدق" کا اجراء
۱۹۰۴ء	یکم اپریل تا ۳ راپریل انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شرکت۔
۱۹۰۵ء	اپریل و مئی "لسان الصدق" کا آخری شمارہ آگرہ کے مشہور مفید عام پریس سے شائع ہوا۔
۱۹۰۵ء	سفر عراق
۱۹۰۵ء	اکتوبر ماہنامہ "الندوہ" لکھنؤ کے معاون مدیر۔

کر دیں اور حدودِ بنگال سے نکل جائیں۔ بعد میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھا دی گئی۔ اس سے پہلے حکومت دہلی، پنجاب اور یو پی نے اپنے اپنے صوبوں میں آنے کی ممانعت کر چکی تھیں۔	
اپریل صوبہ بدر ہونے کی وجہ سے ۱۷، ۲۴ اور ۳۱ مارچ کی اشاعت کے بعد "البلاغ" بند ہوگیا۔	۱۹۱۶ء
۷ اپریل۔ رانچی، (بہار) چلے گئے اور شہر سے باہر مورآبادی میں مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا۔	۱۹۱۶ء
"تذکرہ" اور "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد"	۱۹۱۹ء
یکم جنوری کو قید سے رہائی۔	۱۹۲۰ء
۲۸، ۲۹ فروری بنگال پراونشل خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے، حکومت کو ترکِ موالات کی دعوت دی۔	۱۹۲۰ء
مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب اس کے انگریزی اور پشتو تراجم بالترتیب بمبئی اور پشاور سے شائع ہوئے انگریزی ترجمہ مرزا عبدالقادر بیگ اور پشتو ترجمہ ملک سیدا خاں شنوازی نے کیا تھا۔	۱۹۲۰ء
صدارت اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس ناگپور ۲۳ ستمبر تحریک ترک موالات کی دعوت کے لیے اپنی نگرانی میں ہفت روزہ "پیغام" جاری کیا۔	۱۹۲۱ء
۲۵ اکتوبر صدارت پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ۔	۱۹۲۱ء
۱۸، ۲۰ نومبر صدارت اجلاس جمعیۃ العلمائے ہند لاہور	۱۹۲۱ء

۱۹۰۶ء	مارچ "الندوہ" سے علیحدگی
۱۹۰۶ء	اپریل سہ روزہ "وکیل" امرتسر کی ادارت
۱۹۰۶ء	بڑے بھائی ابونصر آہ کی وفات
۱۹۰۶ء	نومبر "وکیل" سے علیحدگی اور کلکتہ واپسی
۱۹۰۶ء	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت اسی اجلاس میں مسلم لیگ کی تاسیس بھی عمل میں آئی
۱۹۰۷ء	جنوری ہفتہ وار "دارالسلطنت" کلکتہ کی ادارت۔
۱۹۰۷ء	اگست ستمبر۔ "وکیل" امرتسر کی ادارت۔
۱۹۰۸ء	اگست وستمبر۔ والد کی شدید علالت کی بناپر "وکیل" سے مستعفی۔
۱۹۰۸ء	۵ اگست والد کا انتقال۔
۱۹۰۹ء	مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر
۱۹۱۲ء	۱۳ جولائی ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔
۱۹۱۳ء	الہلال پریس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو ۲۳ ستمبر کو جمع کرادی گئی۔
۱۹۱۴ء	۱۴، ۲۱ اکتوبر کا مشترکہ شمارہ حکومتِ بنگال نے ضبط کر لیا۔
۱۹۱۴ء	۱۶ نومبر ضمانت ضبط۔ دس ہزار کی نئی ضمانت کا مطالبہ اور مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸ نومبر کی اشاعت کے بعد خود ہی "الہلال" بند کر دیا۔
۱۹۱۵ء	۱۲ نومبر ہفتہ وار "البلاغ" جاری کیا۔
۱۹۱۶ء	۲۸ مارچ۔ حکومت ہند نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت حکم دیا کہ چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک

سید عبداللطیف مرحوم نے کیا جو ہندوستان و پاکستان
میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۳۹ء	قائم مقام صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس۔
۱۹۴۰ء	انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک رہے۔
۱۹۴۰ء	۱۹/مارچ صدارت اجلاس انڈین نیشنل کانگریس رام گڑھ
۱۹۴۰ء	گرفتاری، دو برس کی سزا، نینی جیل میں قید۔
۱۹۴۱ء	۴/دسمبر رہائی۔
۱۹۴۲ء	مارچ، اپریل ۱۹۴۲ء کرپس مشن سے گفتگو۔
۱۹۴۲ء	۹/اگست گرفتاری، قلعۂ احمد نگر میں نظر بند
۱۹۴۳ء	۹/اپریل بیوی کی کلکتہ میں وفات۔
۱۹۴۳ء	چھوٹی بہن حنیفہ، آبرو بیگم کی بھوپال میں وفات
۱۹۴۵ء	اپریل احمد نگر سے بانکوڑا منتقل۔
۱۹۴۵ء	۱۵/جون رہائی
۱۹۴۵ء	۲۶/جون شملہ کانفرنس میں شرکت۔
۱۹۴۶ء	"غبارِ خاطر"۔ "کاروانِ خیال"
۱۹۴۶ء	اپریل، جون وزارتی مشن سے گفتگو۔
۱۹۴۷ء	۱۵/جنوری، رکنیت جمہوری حکومت وزارتِ تعلیم
۱۹۴۷ء	۱۵/اگست، آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم
۱۹۵۱ء	کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر۔
۱۹۵۶ء	مئی تا جولائی۔ یورپ اور مغربی ایشیا کا خیرسگالی دورہ
	یونسکو کی نویں جنرل کانفرنس منعقدہ دہلی، صدارت۔

۱۹۲۱ء	۱۰ دسمبر گرفتاری، مقدمہ ایک سال کی قید کی سزا، پریسیڈنسی جیل علی پور میں قید۔ اسی مقدمے میں وہ بیان دیا، جو "قولِ فیصل" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا عربی ترجمہ "ثورۃ الہند السیاسیہ" کے عنوان سے قاہرہ سے اور ترکی ترجمہ قسطنطنیہ سے چھپا۔ عربی ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے اور ترکی ترجمہ عمر رضا مدیر "جہان اسلام" قسطنطنیہ نے کیا تھا۔
۱۹۲۳ء	۱۶ جنوری رہائی۔
۱۹۲۳ء	یکم اپریل عرب دنیا کو تحریک آزادی سے روشناس کرانے کے لیے اپنی نگرانی میں پندرہ روزہ "الجامعہ" عربی میں جاری کیا۔
۱۹۲۳ء	۱۵ ستمبر صدارت اجلاس خاص آل انڈیا نیشنل کانگریس دہلی۔
۱۹۲۵ء	۲۹ دسمبر صدارت آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور۔
۱۹۲۷ء	۱۰ جون الہلال دوبارہ جاری کیا۔
۱۹۲۷ء	۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت کے بعد "الہلال" بند ہو گیا
۱۹۲۹ء	صدر مسلم نیشنل پارٹی
۱۹۳۰ء	قائم مقام صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس۔
۱۹۳۱ء	گرفتاری
۱۹۳۱ء	ستمبر ترجمان القرآن جلد اول
۱۹۳۲ء	گرفتاری
۱۹۳۶ء	اپریل ترجمان القرآن جلد دوم
	ترجمان القرآن جلد اوّل دوم کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹ

کتابیات

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھ
ان میں ایک دور کی تاریخ نظر آئے گی

۱۹۵۷ء	دوسرے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ دوبارہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت۔
۱۹۵۸ء	۱۵، فروری انجمن ترقی اردو کے اجلاس دہلی میں آخری تقریر۔
۱۹۵۸ء	۲۲، فروری وفات اور جامع مسجد دہلی کے سامنے اردو پارک میں تدفین۔

دو باتیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی زندگی کے دوران تقریباً آٹھ ہزار کتابوں پر مشتمل اپنا ذاتی ذخیرہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے کتب خانہ کو بطور عطیہ پیش کر دیا تھا۔ اس ذخیرہ میں مختلف موضوعات مثلاً تاریخ، فلسفہ، مذہب، جغرافیہ اور ادب سے متعلق بنیادی ماخذ اور نادر مطبوعہ کتب شامل ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ کتب خانہ میں کافی تعداد بیش قیمت مخطوطات اصل یادداشتوں اور سرکاری و نیم سرکاری مراسلت کے بنیادی مسودات کی موجود ہے۔ یہ سب مواد ارباب علم و فضل کے لیے انتہائی قابلِ قدر ہے اور آئی۔سی۔سی۔آر کے کتب خانہ میں برائے حوالہ و مطالعہ دستیاب ہے۔

مولانا آزاد کا شمار نابغۂ روزگار میں ہے۔ ان کی شخصیت ایک عظیم الشان ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھوں نے جو کچھ کہا یا لکھا اس نے خطابت اور صحافت میں ایک گہری معنی آفرینی حاصل کرلی۔

مولانا آزاد کی نگارشات، فلسفہ، مذہب، ادب، سیاست، تاریخ اور جغرافیہ جیسی متنوع علمی شاخوں میں ادب العالیہ کا درجہ رکھتی ہیں مختلف ملکی اور غیر ملکی مفکرین اور اہلِ قلم نے بے شمار کتب اور مضامین مولانا آزاد پر قلم بند کیے ہیں۔

اگرچہ مولانا آزاد کی ہمہ جہت علمی شخصیت نے غیر معمولی طور پر دوسروں کی علمی دلچسپیوں کو مہمیز کیا ہے تاہم اب بھی مولانا سے متعلق مطالعہ کا وسیع میدان محققین کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

دراصل مولانا آزاد پر مزید تحقیق کے لیے اربابِ فکر و نظر کی راہ میں ایک معقول رہبر کی کمی بڑا سنگ راہ ہے۔ اس رہبر کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کونسل نے یہ طے کیا کہ

کے خصوصی آزاد نمبر وسے تعلق رکھتا ہے۔

پہلے شعبہ کے حصہ "الف" میں مولانا آزاد کی تصنیفات پوری کتابیاتی تفصیل کے ساتھ بہ لحاظ نام کتاب حروف تہجی کی نہج پر ترتیب دی گئی ہیں دوسرے حصّے "ب" میں ان رسائل کو جن کے مولانا مدیر یا معاون مدیر رہے ان کے ناموں کے تحت حروف تہجی کے انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔

دوسرے شعبے کے حصّہ "الف" میں کتابیاتی حوالے بہ لحاظ مصنّف کے ناموں کے حروف تہجّی کے نہج پر دیے گئے ہیں۔

حصہ "ب" میں جو مضامین اور اداریہ شامل ہیں ان کو بھی مصنّف یا ٹائیٹل کے ناموں کے تحت حروف تہجّی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر مضمون یا اداریے کے لیے اس تصنیف یا رسائل اور اخبار کا حوالہ اس کے نام۔ جگہ۔ شمارے کی تاریخ اور صفحات کے ساتھ دیا گیا ہے جس میں وہ شائع ہوا۔

حصہ "ج" میں خصوصی آزاد نمبر حروف تہجّی نہج پر مندرج ہوئے ہیں۔

کیوں کہ اس کتاب میں درج کی ہوئی مطبوعات عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ ہندی۔ سندھی اور اردو کی زبانوں پر مشتمل ہیں لہٰذا بجز اُردو مختلف زبانوں کی نشان دہی کے لیے ہر اندراج کے آخر میں قوسین کے درمیان زبانوں کے اشارے دیے گئے ہیں۔

گلزار نقوی
پاکیزہ سلطان

مولانا آزاد پر ایک جامع ببلیو گرافی مرتب کر کے شائع کی جائے۔

اس ببلیو گرافی میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اس میں مولانا آزاد کی تحریروں کی مکمل فہرست اور مولانا آزاد پر دوسرے ماہرین کی لکھی ہوئی منتخب کتابوں اور مضامین کی کتابیات شامل ہیں۔

اس ببلیو گرافی میں شامل دوسرے سیکشن کا خاص مقصد کم و بیش ان تمام اہم کتب اور رسالہ جاتی مضامین کی فہرست، مرتب کرنا ہے جو کہ گذشتہ پچھتر سالوں میں شائع ہوئے اور اس کے ذریعہ مزید تحقیق و تدقیق، بحث و مباحثہ اور متعلقہ موضوع پر ایک بھرپور تجزیاتی مطالعہ کے لیے ایک ٹھوس اساس پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا آزاد پر دستیاب شدہ مواد کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ آزادیات کے ماہرین کی کاوشوں کا بیشتر حصہ سوانحی خاکوں اور مولانا کی واردات زندگی کے اندراجات پر مشتمل ہے۔ تجزیاتی مطالعہ پر منحصر تصنیفات جن میں مولانا کی فکر و فلسفہ کو گہری نظر سے جانچا اور پرکھا گیا ہو بہت کم ہیں۔ مولانا کے مجموعی کارہائے نمایاں کے پیش نظر اب تک کی تحقیقی کاوش نہایت محدود ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں ان کی قدر و منزلت کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے بہت سی تفصیلی علمی تخلیقات کی ضرورت ہے۔

یہ کتابیاتی کوشش مولانا کے کارناموں پر مزید مطالعہ کے لیے تحقیقی مواد فراہم کرنے والے ایک اہم وسیلہ کی صورت میں پہلا قدم ہے اس کتابیاتی صحیفہ میں جہاں تک ممکن ہوا ہے مولانا پر لکھی ہوئی تمام اہم اور قابل ذکر تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ترتیب

یہ ببلیو گرافی دو شعبوں میں منقسم ہے۔ پہلے شعبہ کے دو حصے الف اور ب ہیں۔ پہلے حصہ میں مولانا آزاد کی اپنی تصانیف ہیں، دوسرا حصہ ان رسائل و جرائد پر مشتمل ہے جن کے وہ مدیر یا معاون مدیر تھے۔

شعبہ کے "الف"، "ب"، "ج" تین حصے ہیں۔ پہلے حصے یعنی الف میں مولانا آزاد پر لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ دوسرے حصے 'ب' میں مولانا آزاد پر لکھے ہوئے وہ مضامین اور اداریے شامل ہیں جو مختلف اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ اور تیسرا حصہ 'ج' رسائل و جرائد

حصّہ اوّل

تصانیف مولانا آزاد

(الف) کتابیں

۱۔ **آزاد کی تقریریں** مرتبہ انور عارف

دہلی، ادبی دُنیا۔ ۱۹۶۱ء

"مختلف مواقع پر کی گئی مولانا کی تقاریر کا مجموعہ۔"

۲۔ **آزادیٔ ہند** مترجمہ رئیس احمد جعفری

لاہور، حق بک اکیڈمی، ۱۹۵۹ء

"جنگ آزادی کے سیاسی حالات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۳۔ **آزادی کی کہانی** مترجمہ مہیندر چترویدی

بمبئی، اورینٹ لونگ مینس، ۱۹۶۵ء (ہندی)

"مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کا ہندی میں ترجمہ۔"

۴۔ **ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی** مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی

لاہور، چٹان، ۱۹۶۰ء

"عبدالرزاق ملیح آبادی کو بیان کی گئی مولانا آزاد کی سوانح عمری۔ دونوں ۱۹۲۱ء میں جیل میں تھے۔ کتاب میں مولانا نے اپنے ابتدائی حالات قلمبند کرائے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح سرسید احمد خاں سے متاثر تھے۔"

۱۰ اسپرٹ آف اسلام
اے سمری آف دی کمنٹری آف مولانا ابوالکلام آزاد آن الفاتحہ
مرتبہ اشفاق حسین
بمبئی، ایشیا پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء (انگریزی)
"قرآن کریم کا پہلا باب۔ قرآن کے بہت سے تراجم و تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب اشفاق حسین نے مولانا کی تفسیر کی بیحد تعریف کی ہے۔ اس میں وہ قرآن کے پہلے باب سورۃ الفاتحہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ جو ایک دعائیہ ہے۔"

اسپیچ ایٹ مرزاپور آن اِاینڈ ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء
(غیر مطبوعہ) (انگریزی)
"مولانا آزاد نے یکم جولائی اور ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے مرزاپور اسکوائر میدان میں تقریریں کی تھیں۔"

۱۲۔ اسپیچ بمقام مرزاپور اسکوئر یکم جولائی ۱۹۲۱ء
(غیر مطبوعہ) (انگریزی)
"مولانا آزاد نے ترک موالات کے دوران کلکتہ کے اس میدان میں تقریر فرمائی۔

۱۳۔ اسپیچز آف مولانا ابوالکلام آزاد
۱۹۳۹-۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۴۳، ۱۹۴۵، ۱۹۵۷
(انگریزی) غیر مطبوعہ

۵۔ **ابوالکلام کے افسانے** مرتبہ عبدالغفار شکیل
علی گڑھ، سرسید بکڈپو، ۱۹۶۱ء
"مشتملات : (۱) مولانا آزاد اور افسانہ نگاری، مقدمہ از مرتب، ص ۵ تا ۸
(۲) محبت، ص ۹ تا ۳۶۔ (۳) حقیقت کہاں ہے؟ ص ۳۷ تا ۴۷۔ (۴) ہولناک
رات، ص ۴۸ تا ۵۷۔ (۵) نپولین پر دوسرا حملہ، ص ۵۸ تا ۶۲۔ (۶) سودا بنت عمارہ،
ص ۶۳ تا ۶۷۔ (۷) اروی بنت الحارث، ص ۶۸ تا ۷۳۔ (۸) چڑیا چڑے کی کہانی،
ص ۷۴ تا ۹۵۔ (۹) شہید رسم، ص ۹۶ تا ۹۹۔ (۱۰) قمار باز، ص ۱۰۰ تا ۱۰۳،
وغیرہ۔"

۶۔ **اتحاد اسلامی**
میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ب ت
"اتحاد کے موضوع پر مولانا کی ایک تقریر۔ پانچ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔"

۷۔ **اذکار آزاد** مرتبہ ایس عباس حامی مدراسی
لاہور، قمرالدین، ب ت۔
"مولانا آزاد کی تحریروں کا مجموعہ۔"

۸۔ **ارمغان آزاد**۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا کلام اور ان کے ابتدائی مضامین۔
مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری
کراچی، آزاد اکادمی، ۱۹۷۲ء
"مولانا آزاد کی شعری تخلیقات کا مجموعہ۔"

۹۔ **احرار اسلام** لکھنؤ، صدیق بک ڈپو، ب ت

۳ ص۔ (۹) پریسی ڈینشیل ایڈریس، ۲۴ تھ میٹنگ آف دی سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، نئی دہلی، ۱۶ر جنوری، ۱۹۵۷ء، ۱۳ ص۔ (۱۰) اسپیچ، سیونتھ میٹنگ آف دی آل انڈیا کونسل فار ٹیکنکل ایجوکیشن، ۲۲ر فروری ۱۹۵۷ء، نئی دہلی، ۴ ص۔ (۱۱) ایڈریس، اسٹیٹ ایجوکیشن منسٹرز کانفرنس، نئی دہلی، ۲۰ر ستمبر ۱۹۵۷ء، ۷ ص۔ (۱۲) ویلکم ایڈریس، فورتھ انٹر یونی ورسٹی یوتھ فیسٹول، ۱ر نومبر ۱۹۵۷ء، نئی دہلی، ۳ ص۔ (۱۳) پریسی ڈینشیل ایڈریس، ۲۵ تھ میٹنگ آف دی سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، نئی دہلی، ۶ر فروری ۱۹۵۸ء، ۱۰ ص۔ (۱۴) پریسی ڈینشیل ایڈریس، جنرل اسمبلی میٹنگ آف دی انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء، ۶ ص"

۱۷۔ **اسپیچز بائی مولانا آزاد** ۲ جلدیں۔ نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۵۶ء۔ (انگریزی)

"ان تقاریر کا انگریزی ترجمہ سید عبداللطیف نے کیا۔ ایشیا پبلیشنگ ہاؤس سے ۶۷۔۱۹۶۶ میں شائع ہوا اور یہی نسخہ حیدرآباد سے ۱۹۷۸ میں شائع ہوا ہے۔"

۱۸۔ **اسلام اور آزادی**

دہلی۔ صابری پبلیشرز، ۱۹۵۷

"آزادی اور عالم انسانیت کی اخوت پر مبنی اسلامی اصولوں کا احاطہ کرتی ہے۔"

۱۹۔ **اسلام اور مسیحیات**

دہلی، تاج اردو اکیڈمی، ۱۹۶۵۔

"قرآنی آیات، ملفوظاتِ محمدیؐ اور شریعت اسلام کے بارے میں بعض غلط توجیہات کو مسترد کیا گیا ہے۔ عیسائیت کے بعض مبلغوں نے اسلامی تعلیمات پر بے جا تنقید کی تھی اور اسلام و پیغمبر اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کیے تھے۔ عیسائی

۱۴۔ اسپیچز آف مولانا ابوالکلام آزاد، ج ۱، ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۹ تا ۸ر جولائی ۱۹۴۶ء کلکتہ نیشنل لائبریری، ب ت
(غیر مطبوعہ) (انگریزی)
"مولانا آزاد کی تقاریر و بیانات جو کہ امرت بازار پتریکا کلکتہ میں شائع ہوئیں۔"

۱۵۔ اسپیچز آف مولانا ابوالکلام آزاد، ج ۲، ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۸ (غیر مطبوعہ)
(انگریزی)
مولانا آزاد کی تقاریر و بیانات جو کہ امرت بازار پتریکا کلکتہ میں شائع ہوئی تھیں۔

۱۶ اسپیچز ان آگورل ایڈریسیز اینڈ پریسی ڈینشیل ایڈریسز
۱۹۵۵-۵۸۔ (انگریزی) (غیر مطبوعہ)
"مشتملات: (۱) اسپیچ، لینگ آف دی فاؤنڈیشن اسٹون آف دی نیشنل میوزیم، نئی دہلی، ۱۲ر مئی ۱۹۵۵، ۳ ص۔ (۲) ان آگورل ایڈریس، یونیسکو سیمی نار آن ڈولپمینٹ آف پبلک لائبریریز ان ایشیا، نئی دہلی، ۶ر اکتوبر ۱۹۵۵، ۶ ص (۳) ایڈریس، سکنڈ انٹر یونی ورسٹی یوتھ فیسٹیول، ۲۳ر اکتوبر، ۱۹۵۵، نئی دہلی۔ ۷ ص (۴) پریسیڈینشیل ایڈریس، ٹوئنٹی تھرڈ میٹنگ آف دی سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، نئی دہلی، ۱۴ر جنوری ۱۹۵۶، ۱۱ ص (۵) پریسی ڈینشیل ایڈریس، سکنڈ کانفرنس آف دی انڈین نیشنل کمیشن فار یونیسکو، ۶ر فروری ۱۹۵۶ نئی دہلی ۷ ۸ ص۔ (۶) ویلکم ایڈریس ٹو دیئر امپریل مجیسٹیز دی شہنشاہ اینڈ دی ایمپریس آف ایران، نئی دہلی، دی ناٹنتھ فروری، ۱۹۵۶، ۳ ص۔ (۷) ایڈریس۔ نائنتھ سیشن آف دی جنرل کانفرنس آف یونیسکو، ۵ر نومبر ۱۹۵۶، ۱۲ ص ۔ (۸) کن کلوڈنگ ایڈریس۔ نائنتھ سیشن آف دی جنرل کانفرنس آف یونیسکو،

۲۵۔ **افادات آزاد : مذہبی اور ادبی استفسارات کے جوابات۔**
مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری
کراچی، ادارہ تصنیف وتحقیق، ۱۹۸۹ء (اردو)
"مولانا آزاد کے اخبار الہلال اور البلاغ میں شائع شدہ مذہب اور اردو ادب کے بعض مسائل پر قارئین کے سوالات کے جوابات کا مجموعہ۔"

۲۶۔ **افسانۂ ہجر و وصال** لاہور، الہلال بک ایجنسی ۱۹۳۵
"کتاب میں مبادیاتِ اسلام پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کو صراطِ مستقیم سے پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے۔"

۲۷۔ **البیرونی اور جغرافیہ عالم۔** مرتبہ عنیاالحسن فاروقی، اور سید مسیح الحسن
دہلی، ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز، ۱۹۸۸ء "سیاح اور عالم البیرونی کے سوانح جس نے جغرافیہ عالم پر تحقیق کی۔"

۲۸۔ **التبلیغ۔** کراچی، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ب ت۔
"پیشوا، دہلی، ۱۹۳۴ء کاری پرنٹ۔ اس تقریر میں مولانا آزاد نے اسلام کی تبلیغ، اس کی اہمیت اور ضرورت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔"

۲۹۔ **الجہاد فی سبیل اللہ۔**
مراد آباد، نظامیہ خلافت اسٹور ب ت (اردو)
"مقدس جنگ جہاد کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے اور تاریخ اسلام کے کئی جہادوں کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔"

مبلغوں کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اصل میں یہ الہلال میں مضمون کی شکل میں شائع ہوا ہے۔"

۲۰۔ **اسلام اور نیشنلزم**

لاہور، البلاغ بک ایجنسی، ۱۹۲۹۔

"قومیت اسلام کا ایک بنیادی نظریہ ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ اسلام قومیت کے عناصر پر کس طرح عمل پیرا ہے اور یہ کس طرح معاصرانہ ضرورت بن جاتا ہے۔"

۲۱۔ **اسلام کا نظریۂ جنگ** مرتبۂ ابن الرائے

لاہور، بعثت ادب، ۱۹۶۵۔

"مولانا آزاد کی تقاریر کا مجموعہ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ استبداد اور ناانصافی کے خلاف جنگ یا جدوجہد اسلام میں حق بجانب ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن پاک کے حوالوں اور رسول اللہ کے اقوال کی مدد سے اپنے نظریہ کی حمایت کی ہے۔"

۲۲۔ **اسلامی مسائل۔**

دہلی، شہزاد بک ڈپو، ب ت

"اس مقالہ میں مولانا نے نیکی اور بدی کے فلسفہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ انھوں نے قرآن کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔"

۲۳۔ **اصحاب کہف** دہلی ستارۂ ہند بک ڈپو، ب ت۔

قرآن کے ایک واقعہ پر حاشیہ آرائی۔"

۲۴۔ **اعلانُ الحق** کلکتہ، عثمانیہ پریس، ۱۸۹۸

"رویت ہلال اور فتویٰ پر مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین نے دینی مباحث کو موضوع بنایا اور مولانا آزاد نے ترتیب دی ہے۔"

۳۶۔ **ام الکتاب : تفسیر سورۃ فاتحہ۔**

لاہور مکتبۂ احباب، ب ت۔

۳۷۔ **امر بالمعروف**

لاہور، الہلال بک ایجنسی، ۱۹۳۶ء

۳۸۔ **انبیائے کرام۔** مرتبۂ غلام رسول مہر۔

لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۷۲

"اسلام کے چند مشہور پیغمبروں کے سوانحی حالات اور ان کے عہد کے تاریخی حالات کا مفصل بیان و پس منظر"

۳۹ **انتخاب الہلال۔**

لاہور، ادبستان، ب ت۔

"الہلال کی تحریروں کا مجموعہ۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۱ء میں بھی شائع ہوا"

۴۰۔ **انتخاب تذکرہ** مرتبۂ محمود الٰہی۔

لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۸۔

"مولانا آزاد کی کتاب تذکرہ کا جامع اور منتخب انتخاب جس میں سیر حاصل مقدمہ اور نوٹ شامل ہیں"

۴۱۔ **انڈیا ونس فریڈم** بار ۲۔

مدراس، اورینٹ لونگ مینس، ۱۹۸۸۔ (انگریزی)

۳۰۔ **الحرب فی القرآن**
کلکتہ، الہلال، ۱۹۲۲

۳۱۔ **الحریت فی الاسلام** مرتبہ مشتاق احمد
میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۱۔
"اسلامی حکومت کے جمہوری ڈھانچہ اور یورپی حکومتوں کے ساتھ موازنہ پر سیر حاصل بحث۔"

۳۲۔ **الدین والسیاست۔**
بجنور، ملک کتب خانہ، ب ت
"دین و سیاست کے باہمی تعلق پر اسلامی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔"

۳۳۔ **السیدہ فاطمہ بنت عبداللہ**

۳۴۔ **الہلال کے تبصرے** مرتبہ محمود الٰہی
لکھنؤ، یوپی اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء
"مولانا آزاد کے اخبار الہلال کے مختلف شماروں میں شائع ان کے اداریوں کے انتخاب کا مجموعہ۔"

۳۵۔ **امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا فیصلہ اور مالیر کوٹلہ کا نزاع۔**
مالیر کوٹلہ، انجمن اہلِ حدیث، ۱۹۵۴۔
" مالیر کوٹلہ پنجاب میں مسجد اہلِ حدیث کے امام کے تقرر پر تنازعہ ہو گیا تھا۔ اس کے فیصلہ کے
لیے مولانا سے فتویٰ طلب کیا گیا۔ اس تنازعہ کا پورا واقعہ کتاب میں موجود ہے۔"

گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مکمل ترجمہ اور توضیح مولانا کے طبعزاد نظریات و تحریروں پر مشتمل ہے۔"

۴۷۔ **بیسک کنسیپٹس آف دی قرآن** ۔ مترجمہ سید عبداللطیف۔
حیدر آباد، اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۵۸ء۔ (انگریزی)
"اس میں مولانا کے نظریۂ قرآن کے بارے میں مختصر تاثرات شامل ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کے تعلق سے مطالعہ قرآن کے لیے اس میں جامع مقدمہ بھی ہے۔"

۴۸۔ **بنیادی تصوّرات قرآن** مترجمہ سید عبداللطیف۔
حیدر آباد، اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۶۰ء
"بیسک کنسیپٹس آف دی قرآن"، کا اُردو ترجمہ۔ اس میں مولانا نے اپنے تصوّر قرآن کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔"

۴۹۔ **پارلیمانی تقریر**
نئی دہلی، لوک سبھا سیکرٹریٹ، ۱۹۵۴ء
"ملک کی فرقہ وارانہ صورتِ حال پر پارلیمنٹ میں مولانا آزاد اور چند دوسرے ممبران پارلیمنٹ کی تقاریر کا مجموعہ۔"

۵۰ **پردہ قید کی علامت ہے یا آزادی کی ضمانت؟**
"پردہ جو مسلمان خواتین کے لیے ضروری ہے، پر مولانا آزاد کے نظریات۔"

"ہمایوں کبیر نے مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ لکھا ہے جو ۳۰ صفحات پر مشتمل مواد کو چھوڑ کر ۱۹۵۸ء میں شائع کیا گیا۔ ۳۰ سال کے بعد ۱۹۸۸ء میں کتاب کا مکمل متن اصل کتاب کی عکسی طباعت کے ساتھ شائع کیا گیا۔"

۴۲۔ **انسانیت کا مسئلہ۔**

کراچی، ادارۂ فروغ ادب، ۱۹۶۴ء

"مسیحیت اور اس کی تعلیمات پر مولانا کے خیالات کا مجموعہ۔"

۴۳۔ **انسانیت موت کے دروازے پر۔**

لاہور، شمیم بک ڈپو ۱۹۵۷۔

"بار ۲، ۱۹۵۸ ۔ چند اسلامی متقدمین کے سوانحی حالات ۔ (۱) عمر بن العاص ۔ (۲) حجاج بن یوسف (۳) حضرت خباب بن ارتؓ (۴) عبداللہ بن علی جیونؒ (۵) عبداللہ بن زبیرؓ (۶) عمر بن عبدالعزیزؓ۔"

۴۴ **اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان**

لاہور الہلال بک ایجنسی، ۱۹۳۵

"نیکی اور بدی کے درمیان مسلسل کشمکش کے موضوع پر قرآنی حوالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔"

۴۵ **بائیکاٹ** میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۱ء

۴۶ **باقیات ترجمان القرآن۔** مرتبہ غلام رسول مہر

دہلی، اشاعت الکتاب، ۱۹۶۲ء

"قرآن کی صورتوں کے ترجمہ، تشریح اور تفسیر جو ترجمان القرآن کی جلد سوئم میں پیش کی

۵۵- **تاریخی شخصیتیں**

دہلی، کتابی دُنیا، ب ت۔
"چند اہم شخصیتوں کے سوانحی خاکے مولانا آزاد کے قلم سے:
(۱) حکایت برق وخرمن، ص ۹ تا ۱۸۔
(۲) جمال الدین افغانی، ص ۱۹ تا ۳۰۔
(۳) روسو، ص ۳۱ تا ۶۴۔
(۴) نپولین، ص ۶۵ تا ۸۶۔
(۵) رستم بن رضا، ص ۸۷ تا ۱۰۰
(۶) مدحت پاشا، ص ۱۰۱ تا ۱۷۰
(۷) مصطفےٰ فاضل پاشا، ص ۱۷۱ تا ۲۰۰
(۸) سعد پاشا زغلول، ص ۲۰۱ تا ۲۳۸
(۹) والٹیئر، ص ۲۳۹ تا ۲۶۰۔"

۵۶- **تاریخی مقالات** مرتبہ خلیق احمد نظامی

دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۶۔
"مولانا آزاد کی منتخب تحریروں کا مجموعہ۔"

۵۷- **تازہ مضامین ابوالکلام آزاد** مرتبہ محمد مشتاق احمد

میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۱
"مولانا کے متعدد مضامین کا مجموعہ۔"

۵۱ پریسی ڈینشیل ایڈریس، اسپیشل سیشن آف دی انڈین نیشنل کانگریس ہیلڈ ایٹ دہلی اِن ستمبر ۱۹۲۳ء۔ علی گڑھ، جامعہ ملّیہ پریس ۱۹۲۳ء۔ (انگریزی)

"کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی، ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد کے خطبہ صدارت کا انگریزی مسودہ۔ انھوں نے تحریک آزادی کو مزید تیز تر بنانے کے لیے حکمتِ عملی کا خاکہ مرتب کیا۔ انھوں نے اس خطبہ میں ہندو سنگھٹن کے خلاف خیالات کا اظہار کیا اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اس سیشن میں سی آر داس، حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، سی راجگوپالا چاریہ، سردار پٹیل، راجندر پرساد وغیرہ نے شرکت کی۔"

۵۲۔ پریسی ڈینشیل ایڈریس انڈین نیشنل کانگریس ۸۲ سیشن رام گڑھ ۱۹۴۰ (انگریزی)

"مولانا آزاد کے اردو خطبہ کا انگریزی ترجمہ۔"

۵۳ پیش لفظ: مثنویاتِ میر بخطِ میر مرتبہ رام بابو سکسینہ۔ دہلی، دھومی مل دھرم داس، ۱۹۵۶ء

۵۴ پیشِ لفظ، پارسی، ایک یونانی ڈرامہ از ایسکلس (۴۷۳ ق م) ترجمہ آصف علی۔ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی

"مولانا آزاد نے اس کتاب پر اپنا پیشِ لفظ لکھا ہے۔"

ہر اہم کتاب ہے ۔ یہ نہ صرف سوانح حیات ہے بلکہ مذہب پر بھی اہم دستاویز ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا ایڈیشن مرزا فضل الدین احمد نے البلاغ پریس کلکتہ سے ۱۹۱۹ء میں شائع کیا تھا۔ مکتبہ میری لائبریری اور کتاب محل لاہور نے بھی ری پرنٹ شائع کیا۔"

۶۳۔ **تربیتِ عسکری اور قرآنِ حکیم۔**

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

۶۴۔ **ترجمان القرآن۔** مرتبہ مالک رام۔ نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ب ت۔

چار جلدیں۔

"مولانا نے قرآن مجید کی تفسیر، اور توضیح کی ہے اور ان کا مقدمہ شامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا پیش لفظ بھی ہے۔

ج ۱	اشاعت	۱۹۶۴	ج ۳	اشاعت	۱۹۶۸
ج ۲	اشاعت	۱۹۶۶	ج ۴	اشاعت	۱۹۷۰

۶۵۔ **ترجمان القرآن** مترجمہ سید عبداللطیف

جلد ۲ : البقرہ تا الانفعال۔

بمبئی، ایشیا پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۷ - (انگریزی)

"قرآن پاک کے آٹھویں پارہ کا انگریزی ترجمہ۔ مولانا کی ترجمان القرآن کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں کے مقدموں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔"

۶۶۔ **تصریحات آزاد**

دہلی، تاج اردو اکادمی، ب ت۔

"الہلال کی اشاعت کے دوران مولانا کے پاس مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی

۵۸ **تبرکاتِ آزاد۔** مرتبہ غلام رسول مہر
حیدر آباد، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۶۹ء
"مولانا آزاد کے ۹۷ خطوط اور ۸ مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین مذہب، سیاست، تاریخ، تعلیم اور اصلاح کے پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔"

۵۹۔ **تحریکِ آزادی۔**
دہلی کتاب خانہ، ب ت۔
سیاسی اور مذہبی پہلوؤں پر لکھے گئے مضامین بالخصوص تحریکِ آزادی کی تاریخ کا مجموعہ۔
یہ کتاب پہلے بھی چمن بکڈپو دہلی ۱۹۵۸ء میں اور مکتبۂ ماحول لاہور ۱۹۵۹ء میں شائع کر چکے ہیں۔"

۶۰۔ **تحریکِ نظمِ جماعت** مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری
لاہور نذیر سنز پبلیشرز ۱۹۷۸ء

۶۱۔ **تذکرہ۔** مرتبہ فضل الدین احمد
لاہور، انارکلی کتاب گھر (۱۹۱۹ء)
"اس کتاب میں مولانا آزاد کے خاندان کا شجرۂ نسب اور اسلام کے موضوع پر مستند حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔"

۶۲ **تذکرہ۔** مرتبہ مالک رام
دہلی، ساہتیہ اکادمی، بار ۳، ۱۹۵۸ء
"اس میں مولانا کے خاندان کی چند اہم شخصیتوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ یہ تاریخ کے موضوع

۷۲ ## تفسیر پارۂ لن تنالوا

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"قرآن کے چوتھے پارہ کا اُردو ترجمہ جو کہ ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔"

۷۳ ## تفسیر پارۂ لایحبُ اللہ

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"قرآن کے چھٹے پارہ کی تفسیر جو کہ ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔"

۷۴ ## تفسیر پارۂ وَاِذا سَمِعُوا

لاہور، شمیم بک ڈپو، ت ت۔

"قرآن کے ساتویں پارہ کا اردو ترجمہ جو کہ مولانا کی کتاب ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔"

۷۵ ## تفسیر پارۂ وَالمحصنٰت

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"قرآن کے پانچویں پارہ کا اردو ترجمہ جو کہ مولانا کے ترجمانُ القرآن سے ماخوذ ہے۔"

۷۶ ## تقریر بہ مقام مرزاپور اسکوئر، یکم جولائی ۱۹۲۱ء

(غیر مطبوعہ مسودہ)

"مولانا نے یہ تقریر مرزاپور اسکوئر کلکتہ میں یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو کی تھی۔ اس میں دو تقاریر مجلد ہیں۔ پہلی تقریر انھوں نے یکم جولائی کو کی تھی اور دوسری تقریر ۱۲ جولائی کی ہے۔ بی سی چٹرجی نے دونوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ پہلی تقریر تین افراد کے خلاف احتجاجی نوعیت کی ہیں۔ دوسری تقریر میں تحریک خلافت کی وضاحت کی گی۔"

طرف سے بھی بعض مذہبی اور سیاسی مسائل آتے تھے۔ مولانا نے ان مسائل پر جو جوابات دیے وہ اس کتاب میں ہیں۔"

٦٧ **تصورات قرآن** مرتبہ سید عبداللطیف

دہلی، تاز پبلیشنگ ہاؤس، ب ت۔

"قرآن کی سچی ترجمانی اور مبادیٔ قرآن سے بحث کی گئی ہے۔"

٦٨ **تعلیمی ترک موالات کا مقصد**

دہلی، سوراج پرنٹنگ ورکس، ١٩٢٠

٦٩ **تفسیر پارہ الف لام میم**

لاہور، شمیم بک ڈپو، ١٩٥٨۔

"قرآن کے پہلے پارہ کی تفسیر جو مولانا کے ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔"

٧٠ **تفسیر پارۂ تلک الرسل**

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"قرآن کے تیسرے پارہ کا اُردو ترجمہ جو کہ مولانا کی کتاب ترجمان القرآن میں شامل ہے"۔

٧١ **تفسیر پارۂ سیقول**

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"قرآن کے دوسرے پارہ کا اُردو ترجمہ جو کہ مولانا آزاد کی ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔"

۸۱ **جہاد اور اسلام۔**
نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء
"مولانا نے جہاد، اس کی معنویت اور اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ فلسفۂ قرآن اور تاریخ اسلام کے بارے میں مولانا کی معلومات کا بیّن ثبوت ہے۔"

۸۲ **چند اوراق مقدمۂ قرآن**
(کلکتہ، البلاغ پریس، ب ت)۔
"یہ صفحات البلاغ پریس سے شائع ہوئے مگر ترجمان القرآن میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ مولانا آزاد کے ذاتی ذخیرہ سے دستیاب ہوئے جن کو انھوں نے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کو عطا کر دیے تھے۔"

۸۳ **حضرت یوسف علیہ السلام** دہلی، چمن بک ڈپو، ب ت۔
"ایک پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام" کی سوانح عمری۔"

۸۴ **حقیقۃ الصلوٰۃ۔** بنارس، دار الکتب، ب ت۔
"ایک خطبہ جو مولانا آزاد نے اسلام کے بنیادی رکن نماز کے موضوع پر دیا۔"

۸۵ **خدا کی ہستی۔** مرتبہ محمد رفیق چودھری۔
دہلی، شاہین بک سنٹر، ۱۹۸۸ - (اردو)
"اس میں مولانا آزاد کے مذہبی افکار بالخصوص وجود خداوندی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔"

ہے۔ ان دونوں تقریروں کے نتیجہ میں حکومت نے مولانا کو گرفتار کر لیا تھا۔"

۷۷ **تقریظ، سرودِ زندگی۔**

دہلی، ناز پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۳۴ء

"اصغر حسین اصغر گونڈوی کے مجموعہ کلام پر مولانا آزاد نے تقریظی مضمون تحریر فرمایا ہے۔"

۷۸ **توحید و شہادت**

بمبئی، بک سنٹر، ۱۹۶۶۔

"الہلال اور البلاغ میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ۔"

۷۹ **ثورات الہند السیاسیہ**

قاہرہ، مطبأة المنار، ۱۹۲۲/۲۳۔ (عربی)

"کلکتہ کورٹ کے سامنے مولانا آزاد کی تقریر کا عربی ترجمہ۔"

۸۰ **جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد**

دہلی، مکتبہ ماحول، ۱۹۶۰۔

"اس کتاب میں مسجد میں کفار کے داخلہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اس میں قرآن کے اقتباسات اور احادیث کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اگر تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی غرض سے غیر مسلموں کا اسلامی معابدوں میں داخل ہونا ناگزیر ہو جائے تو ممانعت نہیں ہونی چاہیے۔ اس مختصر مقالہ سے حدیث و فقہ کے متعلق مولانا کی علمی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔"

۸۹- **خطباتِ ابوالکلام آزاد۔**
لاہور، المنار اکیڈمی ۔ ب ت ۔
"مشتملات : (۱) تقریر کلکتہ ۱۹۱۴ء (۲) پراونشیل خلافت کمیٹی آگرہ
(۳) جمعیتہ علمائے ہند لاہور (۴) (۵) پراونشیل خلافت کمیٹی بنگال، ۱۹۲۰ء۔
(۶) جنرل سیشن کلکتہ شہادت حسین ۱۹۲۱ء (۷) انڈین نیشنل کانگریس دہلی ۱۹۲۳ء
(۸) انڈین خلافت کانفرنس، کانپور، ۱۹۲۵ء - (۹) انڈین نیشنل کانگریس، رام گڑھ،
۱۹۴۰ء "

۹۰- **خطباتِ سیاسیہ اور مساجدِ اسلامیہ۔** میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ب ت۔
"مولانا نے احادیث کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ سیاسی مسائل مساجد کے خطبات کے ذریعہ بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔ سوراج پرنٹنگ ورکس دہلی نے بھی اس کو شائع کیا ہے۔"

۹۱- **خطبۂ صدارت :**
آل انڈیا خلافت کانفرنس، کانپور، ۱۹۲۵ء۔
"آل انڈیا خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۴؍ دسمبر ۱۹۲۵ء بہ مقام کانپور میں مولانا آزاد کا خطبۂ صدارت۔"

۹۲- **خطبۂ صدارت :**
انڈین نیشنل کانگریس، خصوصی اجلاس، ۱۵؍ ستمبر ۱۹۲۳ء، دہلی۔
"مولانا آزاد کا خطبۂ صدارت۔"

۹۳- **خطبۂ صدارت :**
انڈین نیشنل کانگریس، رام گڑھ سیشن، ۱۹۴۰ء۔
"انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس، مجلس استقبالیہ میں مولانا آزاد کا خطبۂ صدارت۔"

۸۶۔ **خطباتِ آزاد۔** لاہور، ادبستان، ب ت۔ مرتبۂ نصر اللہ خاں عزیز
مشتملات : مقدمہ مرتبۂ نصر اللہ خاں عزیز، ص ۴ تا ۸، خطباتِ اتحادِ اسلامی اجلاس عام کلکتہ، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء، ص ۹ تا ۳۵، صوبائی مجلس خلافتِ آگرہ، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۱ء ص ۳۵ تا ۶۸، خطبۂ تحریری جمعیۃ علمائے ہند، لاہور، ۱۸ر نومبر ۱۹۲۱، خطبۂ تقریری، ایضاً، ص ۶۹ تا ۱۴۹) اجلاس عام کلکتہ، شہادتِ حسین، ص ۱۱۳تا ۲۴۵ اجلاس خصوصی انڈین نیشنل کانگریس، دہلی، ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳، ص ۲۴۵ تا ۳۰۷، صوبائی مجلس، خلافت کانفرنس بنگال، ۲۸ر فروری ۱۹۲۰، ص ۴۹ تا ۲۱۱، آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور، ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۵ ص ۳۰۷ تا ۳۲۵، خطبۂ رام گڑھ کانگریس، مارچ ۱۹۴۰، ص ۳۳۵ تا ۳۲۳۔ اس کتاب میں ۱۹۴۰ تک کے سارے اہم خطبے یکجا مل سکتے ہیں۔"

۸۷۔ **خطباتِ آزاد۔**
دہلی، اردو کتاب گھر، ۱۹۵۹ء
"مشتملات: (۱) اتحادِ اسلام ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۱، ص ۲ تا ۵۔ (۲) خطبات مجلس خلافت، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۱ بمقام آگرہ، ص ۲۸ تا ۵۴۔ (۳) خطبہ صدارت بسلسلۂ جمعیۃ علمائے ہند منعقدۂ نومبر ۱۹۲۱ء بمقام لاہور، ص ۱۰۷ تا ۱۲۳۔ خطبۂ صدارت بسلسلہ آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء بمقام کانپور، ص ۱۷۲ تا ۱۹۲۔"

۸۸۔ **خطباتِ آزاد** مرتبۂ مالک رام۔
نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء
("مولانا آزاد کے خطبات کا مجموعہ۔")

روانہ ہوگیا جہاں اس نے نظریۂ معتزلہ کی کھل کر مخالفت کی۔ شیخ کو اس نظریہ کے معتقدین کے ساتھ مناظرہ کے لیے ایک خصوصی مباحثہ میں پیش کیا گیا۔ اس مناظرہ کی صدارت خود خلیفہ مامون الرشید نے کی۔ مناظرہ و مذکرہ ہوا جس میں شیخ عبدالعزیز کو فتح نصیب ہوئی۔ اس واقعہ کی تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں۔"

۹۹۔ دعوتِ عمل۔

میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۰ء

"الہلال یکم جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع شدہ مضمون۔ یہ سوراج پرنٹنگ ورکس دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔"

۱۰۰۔ ذکریٰ ۱۹۲۵ء

"سرورِ کائنات حضرت محمدؐ رسول اللہ کی سیرت۔"

۱۰۱۔ ذوالقرنین۔ لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت

"ترجمان القرآن میں سورہ کہف کی تفسیر کا اقتباس ہے۔"

۱۰۲۔ ذوالقرنین یا کوروشِ کبیر۔ مترجمہ بوستانی برہری

تہران، ۱۳۲۹۔ A.H.۔ (فارسی)

"مولانا کی شہرۂ آفاق کتاب ترجمان القرآن کے مضمون "سورۂ کہف" کے ذوالقرنین کا فارسی ترجمہ۔"

۱۰۳۔ ردِّ مرزائیت۔

لاہور، کتب خانہ دعوتِ اسلام، ۱۹۲۷ء۔

۹۴۔ **خطبۂ صدارت : جمعیتہ علمائے ہند** ۱۹۲۱ء لاہور۔
میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ۱۹۲۱ء
"مولانا آزاد کا غیر مطبوعہ خطبہ صدارت۔ اس میں انھوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف جدوجہد کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔"

۹۵۔ **خلافت اور جزیرۃ العرب۔** ترجمہ عبدالقادر بیگ۔ بمبئی
بمبئی سنٹرل خلافت کمیٹی، ۱۹۲۰ء (انگریزی)
"مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۸ر فروری ۱۹۲۰ء کو بنگال پراونشیل خلافت کانفرنس کے اجلاس میں خطبہ دیا۔"

۹۶ **داستانِ کربلا۔** مرتبہ محمد عبدالرحمٰن سعید۔
کراچی، نفیس اکادمی، ۱۹۵۶۔
"کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی شہادت کا واقعہ۔"

۹۷۔ **درسِ وفا۔** دہلی، عثمانیہ کتب خانہ، ب ت۔
"کہانیوں کا مجموعہ۔"

۹۸۔ **دعوتِ حق۔** دہلی، کتاب خانہ، ب ت۔
"عباسی خلیفہ مامون الرشید نے مآخذ قرآن کا تصور پیش کیا۔
اس تصور کے مطابق قرآن غیبی کتاب نہیں ہے۔ اس نے اس نظریہ کو دینی علماء اور بغداد کے عوام پر بھی تھوپنا چاہا۔ مکہ کے شیخ عبدالعزیز الکنانی نے اس کے بارے میں سنا تو اس نے بغداد کے عوام کو خلیفہ کی مطلق العنانیت سے نجات دلانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بغداد

صوفی تھے۔ سرمد کو بادشاہ اور اس کی متعصب عدالتِ علماء کے حکم سے پھانسی کی سزا دے دی تھی۔ یہ کتاب تنویر پبلیشرز لکھنؤ نے بھی شائع کی ہے۔"

۱۰۹۔ **شاہراہِ مقصود : سیاستِ ہند میں مسلمانوں کے لیے راہِ عمل**

دہلی، جید برقی پریس، ب ت۔

"پہلا ایڈیشن، کلکتہ، الہلال، ۱۹۱۲ء"

۱۱۰۔ **شخصیت ذوالقرنین المذاکرہ فی القرآن۔**

بغداد، دار البصری، ب ت۔ (عربی)

"ترجمان القرآن کے کچھ حصہ کا عربی ترجمہ جس میں ذوالقرنین کی شخصیت کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ذوالقرنین ایک عمدہ حکمران سمجھا جاتا تھا جس نے ہاروت اور ماروت کے مظالم سے عوام کو نجات دلائی۔ علماء میں ذوالقرنین کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں، مولانا نے قرآن کے ترجمان میں اس کی شخصیت کی شناخت کی ہے۔"

۱۱۱۔ **شہیدِ کربلا۔** بجنور، کتب خانہ نئی جنتری، ۱۹۳۰

"مولانا نے تاریخ اسلام کے سب سے اہم واقعہ، شہادتِ کربلا کا تجزیہ کیا ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزا کی شہادت کا تذکرہ ہے۔"

۱۱۲۔ **صبحِ امید۔** مرتبہ حافظ فیاض احمد

دہلی، سنگم کتاب گھر، ۱۹۵۹۔

"مولانا کی چند اہم تحریروں کا گلدستہ ہے۔"

۱۰۴۔ (رسالہ) عزیمت ودعوت۔
کلکتہ، پبلک لائبریری، ب ت۔
"مولانا آزادؒ کی معروف کتاب التذکرہ کے چند اوراق نازپبلیشنگ ہاؤس نے بھی شائع کیے ہیں۔"

۱۰۵۔ رسولِ رحمت: سیرتِ طیبہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالات۔
مرتبہ غلام رسول مہر۔ دہلی، اعتقاد، ۱۹۸۲ء
"نبی آخرالزماں محمدؐ رسول اللہ کی سیرتِ پاک پر مقالات کا مجموعہ۔"

۱۰۶ رسولِ عربی۔
لاہور، مکتبہ عظمت، ب ت۔
"پیغمبر اسلام محمدؐ کی سیرتِ طیبہ اور حسن کردار کا مطالعہ۔"

سبھاپتی کے بھاشن۔
رام گڑھ، کانگریس کمیٹی، ب ت۔ (ہندی)
"انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسِ رام گڑھ منعقدہ ۱۹۴۰ء کے موقع پر دیے گئے مولانا آزاد کے خطبہ صدارت کا ہندی ترجمہ۔"

۱۰۸۔ سرمد شہید۔
لاہور، ملک محمدالدین، ب ت۔
"ایک مضمون جو سرمدؒ کے بارے میں ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں ایک بزرگ

۱۱۸ **عزیمت و دعوت۔** دہلی، ناز پبلیشنگ ہاؤس، ب ت۔

"اسلام اور مسلمان حکمرانوں کی تاریخ۔ ان علماء کے رول پر بحث کی گئی ہے جو اپنے عہد کے حکمرانوں کی ایما پر فتوے جاری کرنے پر مجبور ہوئے اور مصلحین کے دلائل پر جنھوں نے حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ کتاب کلکتہ پبلک لائبریری نے بھی شائع کی ہے۔ یہ مولانا کی کتاب تذکرہ کے چند ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۱۹۔ **عظیم شخصیتیں۔**

لاہور، ادارۂ تعارف، ب ت۔

"بعض اہم شخصیتوں پر مولانا کے سوانحی خاکے۔"

۱۲۰۔ **عورتوں کی آزادی اور فرائض۔**

لاہور، شمیم بک ڈپو، ب ت۔

"خواتین کے فرائض اور معاشرہ میں ان کے مقام پر مولانا کے تاثرات و معتقدات۔ عورت بنی آدم کی خالق بھی ہے۔ وہ نسل کی افزائش، تحفظ اور تربیت کرتی ہے۔ یہ ایسی فطری جبلت ہے جو کچلی نہیں جا سکتی۔"

۱۲۱ **عیدین: عید الفطر، عید الاضحیٰ۔**

دہلی، جیّد پریس، ۱۹۵۶۔

"اسلامی تہواروں" عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲۲ **غبار خاطر:** مرتبہ مالک رام۔

نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۷۔

۱۱۳۔ **صدائے حق** ۔ مرتبہ مسعود الحسن ۔ دہلی، حالی پبلیشنگ ہاؤس، ب ت ۔
"مولانا آزاد کے خطبات کا مجموعہ، جو انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مذہبی روشنی میں مختلف مقامات پر دیے تھے ۔"

۱۱۴۔ **صدائے رفعت** ۔ مرتبہ مرزا جانباز ۔ دہلی، آزاد اکادمی، ب ت ۔
"مولانا آزاد کے مذہبی، تاریخی، سیاسی اور ادبی مضامین کا مجموعہ جو ان کی بے پناہ علمیت اور شاداب اسلوب نگارش کا بہترین نمونہ ہے ۔ یہ کتاب ملک پبلیشرز لائلپور سے بھی شائع ہو چکی ہے ۔"

۱۱۵۔ **طریقہ حج** ۔ دہلی، تاج پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۶ء
"کتاب میں اسلام میں حج بیت اللہ کی اہمیت اور حج کی ادائیگی کے لوازم پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔"

۱۱۶۔ **طنزیات آزاد** ۔
دہلی، تاج پبلیشنگ ہاؤس، ب ت ۔
"الہلال اور البلاغ میں شائع شدہ چند مضامین کا مجموعہ ۔ یہ کتاب خصوصی طور پر مولانا کی تحریروں میں طنز و مزاح کے پہلو کی نشاندہی کی غرض سے مرتب کی گئی ہے ۔ یہ کتاب نیا کتاب گھر لاہور سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکی ہے ۔"

۱۱۷ **عروج و زوال کا قرآنی دستور** ۔ لاہور، بزم اشاعت، ۱۹۶۴
" مشتملات : (۱) اُمت مسلمہ ۔ (۲) حقیقت اسلام (۳) وحدت اجتماعیہ (۴) مرکز قومیت ۔ (۵) جغرافیہ مرکز (۶) فکر وحدت اور فکر مرکزیت (۷) عروج و زوال کا فطری اصول (۸) عزم و استقامت (۹) تجدید و تاثیر (۱۰) کامیابی کی چار منزلیں ۔"

۱۲۷۔ **قرآن کا قانونِ عروج وزوال۔**

دہلی، دارالاشاعت، ۱۹۶۰۔

"اس میں اسلام کے اصولوں، تعلیمات اور مسلمانوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔"

۱۲۸۔ **قربانی** : دہلی، محبوب المطابع، ب ت۔

"فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو کے ایک ناول پر مبنی مولانا آزاد کا ایک مختصر ناول۔"

۱۲۹۔ **قولِ فیصل۔**

کلکتہ، البلاغ، پریس، ۱۹۲۲۔

"یہ مولانا آزاد کا وہ مشہور بیان ہے جس میں انھوں نے برصغیر کی جنگ آزادی کا حال بیان کیا ہے۔ عوامی جلسوں اور تقاریر پر پابندی کے باوجود مولانا آزاد نے خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے دوران ملک کے مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ ممتاز قومی رہنمایانِ وطن جیلوں میں بھیج دیے گئے اور مولانا آزاد بھی ۱۹۲۱ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے عدالت میں اپنا بیان دیا جو "قولِ فیصل" کے نام سے شائع ہوا۔"

۱۳۰۔ **کاروانِ خیال۔** مرتبہ محمد عبدالشاہد خاں شروانی۔

بجنور، مدینہ پریس، ۱۹۴۶ء

"نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے ہوئے ۴ ستمبر ۱۹۰۴ء تا ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء کے دوران خطوط کا مجموعہ۔"

۱۳۱۔ **کتاب التذکرہ۔** مترجمہ میر ولی الدین۔ مرتبہ ہمایوں کبیر۔

"ان خطوط کا مجموعہ جو اگست ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۵ء کے دوران مولانا نے قلعہ احمد نگر میں اپنی نظر بندی کے زمانہ میں تحریر فرمائے۔ یہ خطوط انھوں نے نواب صدر یار جنگ (حبیب الرحمن خاں شروانی) کو لکھے جو کبھی مکتوب الیہ کو موصول نہیں ہوئے۔"

۱۲۳۔ **غبار خاطر:** مترجمہ مدن لال جین

دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۵۹۔ (ہندی)

"مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنی گرفتاری کے دوران ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء کے زمانہ میں تحریر کیے۔"

۱۲۴۔ **عیسائیت کا مسئلہ:** کراچی، ادارۂ فروغ ادب۔ ۱۹۶۴ء

"مولانا آزاد کے مذہب عیسائیت کے معتقدات و نظریات کے بارے میں خیالات۔"

۱۲۵۔ **فلسفہ: اصول و مبادی کی روشنی میں۔** مترجمہ محمد وارث کامل۔

دہلی، نیو تاج پبلیشرز، ب ت۔

"ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی: ایسٹرن اینڈ ویسٹرن کے اردو ترجمہ پر مولانا آزاد کا پیش لفظ۔ اس میں مولانا آزاد پر جواہر لال نہرو کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔"

۱۲۶۔ **فیصلہ مقدمہ جامع مسجد، کلکتہ۔**

کلکتہ، ٹرسٹیز جامع مسجد، ب ت۔

"ناخدا مسجد کلکتہ کے وقف کی مالی بدعنوانیوں کا معاملہ پیش کیا گیا ہے۔ بالآخر یہ قضیہ کلکتہ ہائی کورٹ سے خارج ہوا اور مولانا کے سامنے آخری تصفیہ کے لیے پیش کیا گیا۔"

۱۳۶۔ **مجموعۂ مضامین ابوالکلام آزاد**

مرتبہ مشتاق احمد۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت، ب ت۔

"مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ۔"

۱۳۷۔ **مضامین آزاد۔**

مرتبہ عبداللہ بٹ لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۴۴

"مولانا کے مضامین کا ایک مجموعہ۔"

۱۳۸۔ **مضامینِ ابوالکلام۔**

کراچی، دارالاشاعت، ب ت۔

"مولانا کے چند مضامین کا مجموعہ۔"

۱۳۹۔ **مضامین ابوالکلام آزاد۔ ۲ جلدیں۔**

دہلی، ہندوستانی پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۴۴۔ (اُردو)

ج ۱ : مرتبہ سفارش حسین

ج ۲ : بدرالحسن

"مختلف موضوعات پر بالخصوص اسلامی فلسفہ و تاریخ اور اردو ادب پر مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ۔"

۱۴۰۔ **مضامینِ البلاغ** مرتبہ محمود الحسن صدیقی۔ مرتبہ محمود الحسن صدیقی۔

دہلی، ہندوستان پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۴۹۔

"البلاغ میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ۔ آئینہ ادب میں ۱۹۸۱ء میں بھی ری پرنٹ شائع

حیدر آباد، مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۶۱۔
"مولانا آزاد کی کتاب تذکرہ جس کا ترجمہ بڑی شاداب زبان میں متعلقہ حواشی و توضیحات کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے؟"

۱۳۲۔ **مارٹرڈم آف حسین۔** مترجمہ محمد اقبال صدیقی
دہلی، نور پبلیکیشنز، ۱۹۸۵ (انگریزی)
"حضرت امام حسینؑ کے شہادت کے واقعہ کا تفصیلی بیان اور واقعہ کربلا کے کچھ اور واقعات"

۱۳۳۔ **مسلمان اور کانگریس** لاہور، آزاد بک ڈپو، ب ت۔
"مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت کے مسئلہ پر مولانا کے خیالات و تاثرات"

۱۳۴۔ **مسلمان عورت۔**
لاہور، ایم ثناء اللہ خان، ۱۹۵۶۔
"فرید واجد آفندی کی عربی تصنیف.. المراۃ المسلمہ، کا اردو ترجمہ۔ مصنف نے اس کتاب میں مصر کی موجودہ سوسائٹی میں خواتین کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ترجمہ مولانا کی ادبی صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے اور ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے"

۱۳۵۔ **مسئلہ خلافت۔**
دہلی، حالی پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱۔
"پراونشیل خلافت کانفرنس کا خطبہ صدارت۔ یہ مسئلہ خلافت پر جامع بحث کو دعوت دیتا ہے۔ اس میں خلافت کی معنویت، تاریخ اور پس منظر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ خلافت پر تحقیق کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے"

"مولانا آزاد کے ادبی و مذہبی مضامین کا مجموعہ اور الہلال کے قارئین کے خطوط کے جوابات مضامین شامل ہیں۔"

۱۴۶۔ **ملفوظاتِ آزاد۔** مرتبہ محمد اجمل خاں۔
دہلی، حالی پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۵۹ء۔
"دینِ اسلام کی روشنی میں دیے گئے بعض استفسارات کے جوابات۔"

۱۴۷۔ **مقالاتِ آزاد۔** مرتبہ عبداللہ بٹ۔
لاہور، قومی کتاب خانہ، ۱۹۴۴ء
"مولانا کے مختلف مضامین و مقالات کا مجموعہ۔"

۱۴۸۔ **مقالاتِ ابوالکلام آزاد۔**
دہلی، چمن بک ڈپو، ب ت۔
"مولانا کی تحریروں کا مجموعہ جس میں انھوں نے مسلمانوں کی آزادی، ان کے فرائض اور دینی ذمّے داریوں کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں دارالاشاعت کراچی نے اسکا ری پرنٹ شائع کیا۔"

۱۴۹۔ **مقالاتِ الہلال**
لاہور، ادبستان، ب ت۔
"مولانا کے مقالات کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً الہلال میں شائع ہوئے۔ ادارہ اشاعت القرآن دہلی نے ری پرنٹ شائع کیا۔"

۱۵۰۔ **مقامِ جمال الدّین افغانی** ۱۹۴۸۔
"مسلم دانشور و فلسفی جمال الدّین افغانی کے سوانحی حالات اور اس کے زمانہ کے اسلامی ممالک کے حالات کا نقشہ۔"

ہو چکا ہے۔"

۱۴۱۔ **مضامین الہلال** مرتبہ محمد رفیق۔

دہلی، ادارہ اشاعت القرآن، ب ت۔

"الہلال میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ۔ یہ اخبار مولانا نے ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے نکالا تھا۔ یہی مضامین ادبستان لاہور نے بھی شائع کیے۔"

۱۴۲۔ **مضامین لسان الصدق** مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔

لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۶ء

"مولانا کے سب سے پہلے اخبار "لسان الصدق (جو کلکتہ سے ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا) میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ۔ ان مضامین کے اسلوب بیان اور لسانی چٹخارے نے نہ صرف قارئین کو بلکہ مولانا آزاد کے معاصرین کو بھی متاثر کیا۔"

۱۴۳۔ **مکاتیب ابوالکلام**

لاہور، ادبستان، ب ت۔

"مولانا آزاد کے مکتوبات کا مجموعہ۔"

۱۴۴۔ **مکاتیب ابوالکلام آزاد۔** مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری

کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۸۔

"۱۹۰۰ تا ۱۹۵۷ء کے دوران تحریر شدہ مولانا کے خطوط۔"

۱۴۵۔ **مکالمات ابوالکلام آزاد**

لاہور، مکتبہ احباب، ب ت۔

"چند خطوط کا مجموعہ جن میں مولانا نے ترجمان القرآن کی پہلی جلد کی پہلی اشاعت کے بعد اپنے عقیدہ کے بارے میں مسلمانوں میں شکوک و شبہات کو دور کرنے کے سلسلے میں وضاحتی مضمون لکھے"

۱۵۷۔ **نقشِ آزاد۔** مرتبہ غلام رسول مہر۔

لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۸ء

"غلام رسول مہر کے نام مولانا کے خطوط کا مجموعہ اور مرزا غالب پر مولانا کے اثرات۔"

نگارشاتِ آزاد۔ دہلی، نیو تاج آفس، ۱۹۶۰۔

"مذہب، تاریخ اسلام اور اخلاقیات پر مضامین کا مجموعہ۔"

نوادر ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ ظہیر احمد خاں

علی گڑھ، سرسید بکڈپو، ۱۹۶۲۔

"مولانا آزاد کی چند تحریروں کا مجموعہ۔"

۱۶۰۔ **نیشنل تحریک**

"۱۹۳۹ء کے دوران لکھا ہوا غیر مطبوعہ مسودہ جو انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری میں دستیاب ہے۔"

۱۶۱۔ **ولادتِ نبوی۔** دہلی، چمن بکڈپو، ۱۹۶۲ء

"کتاب میں نبی آخرالزماں کی ولادت کی اہمیت اور اس سرزمین جو کہ اس دور میں پسماندہ علاقہ تصور کیا جاتا تھا، کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ وہ رحمت اللعالمین تھے اور ان کا پیغام نہ صرف اپنی امت کے لیے تھا بلکہ وہ پوری انسانیت کے خیر خواہ تھے۔"

۱۵۱۔ **مولانا آزاد کا نظریۂ صحافت۔** مرتبۂ قطب اللہ
لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی،
"مولانا آزاد کے طرز نگارش، طرزِ صحافت اور تصورِ صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۱۵۲۔ **مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی خطبہ۔** دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء
"مولانا آزاد نے تقسیم ہند کے وقت ۱۹۴۷ء میں ایک تاریخی خطبہ دہلی کی جامع مسجد میں دیا تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں سے ہجرت وطن نہ کرنے کی تلقین کی تھی۔"

۱۵۳۔ **مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام** دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۵۔
"مولانا آزاد کی ایک تقریر۔"

۱۵۴۔ **مولانا ابوالکلام آزاد کا غیر مطبوعہ کلام** مرتبۂ ابوسلمان شاہجہانپوری
کراچی۔ ۱۹۶۶ء
"مولانا ابوالکلام آزاد کے غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ۔"

۱۵۵۔ **مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابِ آزاد۔**
مرتبۂ اجمل خاں۔ دہلی
سنگم کتاب گھر، ۱۹۶۶ء
"مولانا کے نام نو (۹) عدد خطوط اور مکتوب الیہ کے جوابات کا مجموعہ۔"

۱۵۶۔ **میرا عقیدہ۔** مرتبۂ غلام رسول مہر
کراچی، مکتبۂ ماحول، ۱۹۵۹ء

(ب) رسائل

مولانا ابوالکلام آزاد کے زیرِ ادارت یا اشتراکِ ادارت میں نکلنے والے رسائل

۱۶۲۔ ہماری آزادی : ایک تاریخ جو آپ بیتی بھی ہے۔
مترجمہ محمد مجیب۔
بمبئی، اورینٹ لونگ مینس۔ ۱۹۶۱ء۔
" مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ۔

۱۶۳۔ ہندوستان پر حملہ اور مسلمانوں کے فرائض۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء

۱۶۴- احسن الاخبار (کلکتہ) ۱۹۰۷ء

۱۶۵- البلاغ (کلکتہ) ۱۹۱۵/۱۶-

۱۶۶- الجامعہ (کلکتہ) ۱۹۲۳/۲۴-
"مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے اشتراک سے"

۱۶۷- الہلال (کلکتہ) ۱۹۱۲-۱۴ء

۱۶۸- الہلال (ثانی) کلکتہ ۱۹۲۷ء

۱۶۹- المصباح (کلکتہ) ۱۹۰۰

۱۷۰- الندوہ (لکھنو) ۱۹۰۵/۰۶

۱۷۱- پیغام (کلکتہ) ۱۹۲۱

۱۷۲- پیام (کلکتہ) ۱۹۲۷

۱۷۳- خدنگِ نظر (لکھنؤ) ۱۹۰۰

۱۷۴- دارالسلطنت (کلکتہ) ۱۹۰۷

۱۷۵- لسان الصدق
(کلکتہ) ۱۹۰۳/۰۵

۱۷۶- نیرنگِ عالم (کلکتہ) ۱۸۹۹

۱۷۷- وکیل (امرتسر) ۱۹۰۶/۰۸

حصّہ دوم

مولانا آزاد پر لکھی ہوئی کتابوں کی فہرست

۱۷۸- آزاد (جگن ناتھ) ابوالکلام آزاد- لکھنؤ فروغ اردو ۱۹۵۸-
"سوانح حیات"

۱۷۹- ابوالحسن علی ندوی - مولانا ابوالکلام آزاد-
"پرانے چراغ، جلد دوم، لکھنؤ، مکتبۂ فردوس، ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۶ء سے ماخوذ"

۱۸۰- ابوسلمان شاہجہاں پوری ابوالکلام آزاد بحیثیت مفسر و محدث
کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق، ۱۹۸۴ء
"مولانا آزاد کی اسلام کے موضوع پر معرکتہ آرا گرفت سے بحث کرتی ہے۔ اس میدان میں مولانا کے مقام کا تعین کرتی ہے۔"

۱۸۱- ابوسلمان شاہجہاں پوری
ابوالکلام و عبدالماجد : ادبی معرکہ۔
کراچی۔ ادارہ تصنیف و تحقیق، ۱۹۸۷ء
"اردو میں الفاظ اور محاوروں کے صحیح استعمال پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی میں ایک ادبی معرکہ ہوا تھا جو الہلال و البلاغ میں ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی ادبی معرکہ کا تنقیدی جائزہ کتاب میں موجود ہے۔"

۱۸۶۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری
مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین۔
"مولانا ابوالکلام آزاد کا ان کے ہمعصر علماء اور رہنماؤں کے ساتھ تقابلی مطالعہ۔"

۱۸۷۔ احمد امین
زعیما الاصلاح فی العصر الحدیث۔
بیروت، دار الکتاب الجدید، ب ت۔ (عربی)

۱۸۸۔ احمد حسن کمال
مولانا ابوالکلام آزاد نے برصغیر پاک و ہند و بنگلادیش کے بارے میں کیا کہا تھا؟
مُلتان، مکتبۂ افکارِ نو ۱۹۷۳ء
"برصغیر کے بارے میں مولانا آزاد کے نظریات و خیالات۔"

۱۸۹۔ اسد علی (سیّد)
مولانا ابوالکلام آزاد۔ نئی دہلی، چلڈرن بک سوسائٹی، ۱۹۷۲ء۔ (ہندی)
"مولانا آزاد کی سوانح حیات بچوں کے مطالعہ کے لیے۔"

۱۹۰۔ اسلام علی
مولانا آزاد کی شخصیت۔
لاہور، ادبیات، ۱۹۶۴۔
"سوانح عمری"

۱۹۱۔ امداد صابری
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق، ۱۹۸۶ء

۱۸۲- ابو سلمان شاھجہاں پوری
اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصّہ
کراچی، ادارۂ تصنیف وتحقیق، ب ت
"اس میں دو موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ (۱) مولانا کی ادبی صلاحیت اور (۲) اردو زبان وادب کی ترقی میں مولانا کا حصّہ۔

۱۸۳- ابو سلمان الھندی
امام الہند کراچی، مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۲ء
مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات اور کارناموں کا مفصل مطالعہ ابو سلمان شاہجہانپوری کے نام میں بھی اندراجات ملاحظہ کرسکتے ہیں۔"

۱۸۴- ابو سلمان شاھجہانپوری (الھندی)
مولانا ابوالکلام آزاد : لاہور، NP، ۱۹۶۷
"سوانحی خاکہ"

۱۸۵- ابو سلمان شاھجہانپوری
مولانا ابوالکلام آزاد : ایک مطالعہ، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء۔
"مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی ادبی، مذہبی اور سیاسی تصنیفات پر ہندستان اور پاکستان کے ممتاز دانشوروں کے مقالات کا مجموعہ۔"

۱۹۶۔ بٹ (عبداللہ) مُرتب

ابوالکلام آزاد لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۴۳ء

"مولانا کی ادبی، سیاسی اور مذہبی مصروفیات کے بارے میں ممتاز ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ۔ آل پنجاب مسلم فیڈریشن نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اُن کے یوم پیدائش پر یہ مجموعہ شائع کیا۔"

۱۹۷۔ بزمی (ابوسعید)

مولانا ابوالکلام آزاد تنقید اور تبصرے کی نگاہ میں

دہلی ناز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۵۔

"مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ۔ اقبال اکیڈمی، لاہور نے بھی شائع کیا۔"

۱۹۸۔ بھٹاچاریہ (شانتی رنجن)، مرتب

مولانا ابوالکلام آزاد کے پاسپورٹ کی خفیہ فائل

نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷۔

"کتاب میں مولانا کا سوانحی خاکہ اور ان کی کتاب ھماری آزادی کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصہ میں مولانا آزاد کے پاسپورٹ کے سلسلے میں مرتب خفیہ فائل کے مشتملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۱۹۹۔ بیدار (عابد رضا)

مولانا ابوالکلام آزاد۔ رام پور، انسٹی ٹیوشن آف اورینٹل ریسرچ، ۱۹۶۸۔

"مولانا آزاد کی حیات اور بالخصوص ان کے فلسفہ و خیالات کا تجزیہ۔ کتاب میں ان کی مطبوعات کا مفصل جائزہ بھی ہے۔"

۲۰۰۔ پنّی (شیر بہادر)

مولانا ابوالکلام آزاد: مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور افکار کا مطالعہ۔

کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق، ۱۹۸۶ء

"یہ کتاب ان کے ذاتی مطالعہ آزاد پر مشتمل ہے۔ چند تاریخی خطبے مثلاً خطبہ رام گڑھ (۱۹۴۰) خطبہ

"مولانا امداد صابری نے جو کہ مولانا آزاد کے قریبی ساتھی تھے، مولانا آزاد کی سوانح عمری لکھی ہے اس میں انھوں نے مولانا کی علمیت، دانشوری، اور ان کی تحریروں کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔"

۱۹۲۔ انصاری (اثر بن یحییٰ)
مولانا آزاد : ایک سیاسی ڈائری۔
دھولیہ، عالیہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۲۔
"مولانا آزاد کی سوانح حیات تاریخ وار پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مولانا آزاد کی ولادت (۱۸۸۸) سے ان کی وفات (۱۹۵۸) کے دوران کے ۷۰ سالوں کا احاطہ کیا ہے۔"

۱۹۳۔ ائیر (سُبرامنیا)
رول آف مولانا ابوالکلام آزاد اِن انڈین پالی ٹکس
حیدرآباد، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۶۸ء

۱۹۴۔ بالجون (جے ایم ایس)
ماڈرن اردو قرآن: انٹرپریٹیشن ۱۹۶۰ - ۱۸۸۰۔
لیڈن، بریل، ۱۹۶۱ - (انگریزی)
"مولانا کی کتاب ترجمان القرآن پر سیر حاصل تبصرہ"

۱۹۵۔ بٹ (عبداللہ) مُرتّب
آسپیکٹس آف ابوالکلام آزاد: ایسیز آن ہز لٹریری، پولیٹیکل اینڈ ریلیجئیس ایکٹی وٹیز۔
کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق، ب ت (انگریزی)
"مولانا آزاد کے قریبی رفقا، مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو، ارونا آصف علی، مہادیو ڈیسائی اور راجگوپالا چاریہ نے ان کی حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ان مضمون نگاروں کے سوانحی خاکے بھی موجود ہیں۔"

۲۰۵۔ حسن محمد پہلوان

ابوالکلام آزاد حیدرآباد، مکتبہ اتحاد و ترقی۔ ۱۹۵۸ء

"مولانا آزاد کی مختصر سوانح حیات"

۲۰۶۔ خالد ترمذی

یادگار آزاد لاہور، NP، ۱۹۰۸

"ہند و پاک کے شعرا کا منظوم خراج عقیدت"

۲۰۷۔ خالدی، محمد یونس

روحِ آزاد لکھنؤ، ابوالکلام اکادمی، ۱۹۶۰۔

۲۰۸۔ خالدی (محمد یونس)

نقوش ابوالکلام آزاد لکھنؤ، مولانا آزاد میموریل کمیٹی، ۱۹۷۸۔

مولانا کی تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ"

۲۰۹۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) مرتب

مولانا ابوالکلام آزاد کی یادیں (پٹنہ) مرتب، ۱۹۸۸ء (ہندی)

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام مولانا آزاد کی سیرت اور کارہائے نمایاں پر ایک کتاب"

۲۱۰۔ خلیق انجم، مرتب

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے

دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۶۔

"اردو اکادمی دہلی نے ۲۵ تا ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو خلیق انجم صاحب کی صدارت میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک سمینار کرایا تھا۔ شرکا نے مولانا کے نجی حالات کے علاوہ ان کی تصانیف پر تنقیدی مضامین سپرد قلم کیے"

جامع مسجد دہلی (۱۹۴۷ء) اور خطبہ پارلیمنٹ (۱۹۵۴ء) آخر میں شامل ہیں۔"

۲۰۱ تاراچند

مولانا ابوالکلام آزاد اِن ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ۔ جلد ۳

نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۷۲ - (انگریزی)

"مولانا آزاد کا تحریک آزادی میں جو رول رہا ہے، اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔"

۲۰۲۔ جاوید وششٹ، مرتب

مولانا آزاد فکر و نظر کے آئینے میں۔

فرید آباد، ہریانہ اردو اکادمی، ۱۹۸۷

"مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت کی صدسالہ تقریبات منانے کے لیے ہریانہ اردو اکادمی نے ایک سیمی نار ۱۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو نوح (میوات) میں منعقد کیا۔ مولانا کی مذہبی، سیاسی اور ادبی تصانیف کے مختلف پہلوؤں کو بالخصوص ان کے افکار و کردار کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یٰسین میوڈگری کالج نوح کے ایک مشاعرہ کی رپورٹ بھی آخر میں درج ہے۔"

۲۰۳۔ جھا (وِمل جگدیش)

مولانا ابوالکلام آزاد: الہ آباد، چھتری ہتکاری پستک میلا، ۱۹۸۰ (ہندی)

"اسکول کے طلبہ کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی ہندی میں سوانح حیات۔"

۲۰۴۔ چوپڑہ (پی این)

مولانا ابوالکلام آزاد: ان فلفلڈ ڈریمز

نئی دہلی، انٹر پرنٹ، ۱۹۹۰ (انگریزی)

"مولانا آزاد کی حیات اور کارناموں پر مفصل تبصرہ بالخصوص جنگ آزادی میں ان کے رول پر زور دیا گیا ہے۔"

۲۱۵۔ رضی الدین احمد۔
نقد ابوالکلام
تروپتی، سری وینکٹیشور یونی ورسٹی، ۱۹۶۸۔
"مولانا آزاد کا مفصل مطالعہ۔ اس میں مصنف نے مولانا کا تقابل میر تقی میر، مرزا غالب۔ سر سید احمد خاں اور سر محمد اقبال کے ساتھ کیا ہے۔"

۲۱۶۔ رے، ایمیلینڈو۔
ان کنسس ٹینسیز ان آزاد۔
ہاوڑہ، بنگاورتی گرنتھالیہ، ۱۹۶۸۔ (انگریزی)۔
"مولانا اور ان کے فلسفہ حیات کا تنقیدی جائزہ۔"

۲۱۷۔ ریاض الکریم، مرتب
مسلم اینڈ دی کانگریس
کلکتہ، برینڈر لائبریری، ۱۹۴۱۔ (انگریزی)

۲۱۸۔ زیدی، علی جواد
انوار ابوالکلام
سری نگر ثقافتی سب کمیٹی۔ ۱۹۵۹!
"ایک دن کے سیمی نار کے مضامین۔"

۲۱۹۔ سالک (عبدالمجید)
گروتھ آف مسلم جرنل ازم: اِن اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ
حصہ ۳ جز ۲۔

۲۱۱۔ ڈوگلاس . (ایان ہنڈرسن)

ابوالکلام آزاد: این اینٹیلکوچول اینڈ ریلجیئس بایوگرافی۔

مرتبہ گیل منوٹ اینڈ کرسچین ڈبلیو ٹرال - دہلی آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۸ (انگریزی)

"کتاب میں مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی، ان کے مذہبی افکار، ذہنی نشوونما، سیاسی سرگرمیوں اور قومی رہنما کی حیثیت سے تحریک آزادی میں ان کے رول کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان کے سوانح کو تین مخصوص حصوں میں (۱۸۸۸ تا ۱۹۱۰، ۱۹۱۱ تا ۱۹۲۲ اور ۱۹۲۳ تا ۱۹۵۶) تقسیم کیا گیا ہے۔"

۲۱۲۔ ڈیسائی (مہادیو)

مولانا ابوالکلام آزاد: اے بائیوگرافیکل میمائر۔ بار ۲ -

آگرہ، شیولال اگروال، ۱۹۴۶ - (انگریزی)

"مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ۔ مہادیو ڈیسائی تحریک آزادی میں مولانا کے قریبی رفیق تھے۔"

۲۱۳ راجپوت (اے بی)

مولانا ابوالکلام آزاد۔ لاہور، لوئن پریس، ۱۹۴۶ -

"مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ جس میں مصنّف نے مولانا کا تقابل قیصر روما اور پال سے کیا ہے جو عہدِ حاضر اور عہدِ مستقبل کی شخصیت تصور کیے جاتے ہیں۔"

۲۱۴۔ رخسانہ جلالی (کے)

ابوالکلام آزاد: پرتیچے وسندیش

لکھنؤ، مولانا آزاد میموریل اکادمی، ۱۹۸۰ - (ہندی)

"اسکولوں کے طلبہ کے لیے مولانا آزاد کی سوانح حیات۔"

۲۲۴ سیّدین (کے جی)۔

مولانا آزادس کنٹری بیوشن ٹوایجوکیشن

بڑودہ، مہاراجہ سیاجی راؤیونیورسٹی، ۱۹۶۱ - (انگریزی)

"مولانا پر دو خطبے : (۱) ایجوکیشنل سسٹم اور (۲) پالیسیز اینڈ پروگرامز۔ دونوں خطبے مہاراجہ سیاجی راؤ میموریل لیکچرز کے تحت دیے گئے۔"

۲۲۵ شاہد (ایم اے)

مولانا آزاد اوران کے ناقد

کراچی، ماڈرن پبلیشرز، ۱۹۸۱ -

"مولانا آزاد کے موضوع پر لکھی ہوئی تنقیدی کتابوں کا تجزیہ۔"

۲۲۶۔ شیدا ریواڑوی (عبدالرحمٰن)

مولانا ابوالکلام آزاد کی سرگرم زندگی کا مرقع۔

میرٹھ، کتب خانہ سعیدیہ، ۱۹۴۰ء

"مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ۔"

۲۲۷۔ صدیقی (عتیق) مرتب

آئینہ ابوالکلام آزاد: مجموعہ مقالات۔

دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶ -

"مولانا آزاد کی شخصیت پر ممتاز ادیبوں اور رہنماؤں کے مضامین کا مجموعہ۔ آخر میں مولانا صاحب کی تحریروں کا انتخاب بھی شامل ہے۔"

کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۳ء
"مولانا آزاد بحیثیت صحافی"

۲۲۰۔ سالک (عبدالمجید)
یارانِ کہن
لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۵۵۔

۲۲۱۔ **سپاسنامہ:** ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات، حکومتِ ہند۔ حیدرآباد، دائرۃ المعارف، ۱۹۵۲۔
"ایک تہنیتی مضمون"

۲۲۲ سعید احمد اکبرآبادی۔
مولانا ابوالکلام آزاد: سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے۔
مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق، ۱۹۸۶۔
"ایک سوانحی خاکہ اور ۱۳ دیگر مقالوں میں ممتاز ادیبوں نے مولانا آزاد کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے"

۲۲۳۔ سیدین (کے جی)۔
دی ہیومنسٹ ٹریڈیشن ان انڈین ایجوکیشنل تھاٹ۔
بمبئی، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۶۔ (انگریزی)
"مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ پر ناقدانہ نگاہ"

۲۳۳۔ عبدالوحید خاں۔

تقسیم ہند

لاہور، مکتبۂ ایوانِ ادب، ۱۹۵۹۔

"یہ کتاب مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کے مصنّف نے جنگ آزادی کی تاریخ کے تمام حقائق کی روشنی میں محمد علی جناح کے رول اور تشکیل پاکستان پر اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔"

۲۳۴۔ عبدالودود، مرتب۔

مولانا ابوالکلام آزاد: تحریک آزادی و یکجہتی۔

دہلی، کتاب والا، ۱۹۸۳۔

۲۳۵۔ عبدالقوی دسنوی

ابوالکلام آزاد دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۷۔

"مولانا آزاد کی ایک سوانح"

۲۳۶۔ عبدالقوی دسنوی۔

مطالعہ غبارِ خاطر۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۱۔

"غبارِ خاطر مولانا کا فقید المثال مجموعہ ہے۔ ان خطوط کے معنی، پس منظر اور عالمانہ قدر و قیمت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور مصنّف نے اپنے خطوط میں ممتاز مُصنّفوں مثلاً غالب، سرسید، حالی اور شبلی کے حوالے دیے ہیں۔"

۲۳۷۔ عبدالمنعم النّاصر۔

ابوالکلام آزاد ۲ جلدیں۔ قاہرہ، المصر المجلس الشئون الاسلامیہ، ۱۹۷۳۔ (عربی)

۲۲۸- صدیقی (عتیق احمد)

افکارِ آزاد۔

دہلی، نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ڈیموکریٹک سوشلزم، ۱۹۶۹ -

"انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار کی روداد"

۲۲۹- صدیقی (عتیق)۔

غالب اور ابوالکلام۔

دہلی، مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۹-

"مولانا ابوالکلام آزاد اور مرزا غالب کا تقابلی جائزہ"

۲۳۰- عبدالرحمٰن سعید، مرتب۔

داستانِ کربلا کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۵۶،

"واقعہ کربلا پر مولانا آزاد کے خیالات"

۲۳۱- عبدالرزاق ملیح آبادی۔

ذکرِ آزاد : مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال

کلکتہ، دفترِ آزاد ہند، ۱۹۶۰ -

"مولانا آزاد کی حیات اور کارناموں کے بارے میں مصنف کے تاثرات"

۲۳۲- عبدالمغنی

مولانا ابوالکلام آزاد

نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ -

"مولانا آزاد کی سوانح حیات اور ان کے افکار۔ خاص طور پر ان کے مذہبی گفتار و کردار اور قرآن کی تفسیر کا احاطہ کیا گیا ہے"

۲۴۲۔ عرش ملسیانی
ابوالکلام آزاد: سوانح حیات۔
پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۷۴۔
"مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری"

۲۴۳۔ عزیز (کے کے)
دی انڈین خلافت موومنٹ ۱۹۳۳۔ 1915: اے ڈاکومنٹری ریکارڈ۔
کراچی، پاک پبلیشرز، ۱۹۷۲۔ (انگریزی)

۲۴۴۔ عثمانی مسعود الحسن
ابوالکلام آزاد: احوال و آثار۔
لکھنؤ
مولانا آزاد میموریل اکیڈمی 1977
"مولانا آزاد کی شخصیت سے متعلق مختلف مضامین"

۲۴۵۔ عظمت اللہ ملیح آبادی۔
سوانح حیات مولانا ابوالکلام آزاد
دہلی، انصاری پریس، ۱۹۴۰
"مولانا آزاد کی سوانح حیات بشمول الہلال کی منتخب تحریریں اور مولانا کی منتخب تقریریں"

۲۴۶۔ عمری (محمد شعیب)
اسلامی احکام و فقہ میں ترمیم مولانا آزاد کی نظر میں۔
بنگلور،
"اسلامی فقہ پر مولانا کی تصریحات"

۲۳۸۔ عبدالماجد دریابادی ۔

اُردو کا ادیبِ اعظم : مولانا ابوالکلام آزاد کا حسنِ انشا اور مرقعِ سیرت پر ایک نظر ۔

کراچی ، ادارہ تصنیف و تالیف ، ۱۹۸۶ ۔

"مولانا آزاد کی سوانح عمری اور مصنف کے ساتھ ان کی مراسلت ۔ کتاب میں مصنف کی مولانا کے متعلق چند تحریریں بھی شامل ہیں جو صدق جدید اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئی ہیں ۔"

۲۳۹۔ عبدالغفار (قاضی محمد)

آثارِ ابوالکلام آزاد : ایک نفسیاتی مطالعہ ۔

دہلی ، آزاد کتاب گھر ، ۱۹۶۳ ۔

"مولانا آزاد کا شخصی خاکہ ۔ مولانا کی خصوصیات اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے ۔"

۲۴۰۔ عبیدہ (غلام رسول)

ایجوکیشنل آئڈیاز آف مولانا ابوالکلام آزاد ۔

نئی دہلی ، اسٹرلنگ پبلیشرز ، ۱۹۷۳ ۔ (انگریزی)

"مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات اور مذہب پر مبنی روایتی طریق و سائنس اور ٹیکنولوجی پر مبنی جدید رجحانات کے درمیان مفاہمت کی مخصوص فلاسفی کا مفصّل تجزیہ ۔"

عرش ملسیانی ۔

۲۴۱۔ **ابوالکلام آزاد ۔**

نئی دہلی ، پبلی کیشنز ڈویژن ، ۱۹۷۶ (انگریزی)

"مولانا ابوالکلام آزاد کی انگریزی سوانح عمری ۔"

۲۵۲- فضل الحق خیر آبادی۔ مترجمہ محمد عبدالشاہد خاں شروانی

الثورات الہندیہ

بجنور، اخبار مدینہ، ۱۹۴۷- (عربی)

"عربی میں تحریک آزادی کے بارے میں مولانا آزاد کی کتاب قول فیصل کا ترجمہ۔"

۲۵۳- قاسمی (اخلاق حسین)

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

لاہور، سنّی پبلی کیشنز، ۱۹۸۸-

"کتاب میں مولانا آزاد کے دینی نظریات اور فقہ و شریعت کے بارے میں تفہیمات کو پیش کیا گیا ہے۔"

۲۵۴- قیصر جمال۔

مولانا آزاد کے کارنامے۔

لکھنؤ، کریم بکڈپو، ۱۹۴۵-

"مولانا آزاد کے سوانحی حالات اور ان کے افکار"

۲۵۵- کبیر، ہمایوں، مرتّب

ابوالکلام آزاد۔

نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۵۸-

"مولانا آزاد کا مطالعہ"

۲۵۶- کبیر (ہمایوں) مرتب

مولانا آزاد: اے ہومیج

دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۵۸- (انگریزی)

۲۴۷۔ غفران احمد۔

ابوالکلام آزاد۔

دہلی، فیضان بک سپلائرس، ۱۹۸۵۔

"مولانا آزاد کی سوانح حیات بچوں کے لیے۔"

۲۴۸۔ فاروقی (آئی ایچ آزاد)

دی ترجمان القرآن۔

نئی دہلی، وکاس، ۱۹۸۲۔ (انگریزی)

"قرآن کی تفہیم کے لیے مولانا آزاد کے نظریات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔"

۲۴۹۔ فاروقی (برہان احمد)

دی مجدّدیز کنسیپشن آف توحید۔

لاہور، اشرف، ۱۹۴۰۔ (انگریزی)

۲۵۰۔ فاروقی (محمد عبدالرزاق)

ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصوّرات۔

گلبرگہ، انجمن حیات نو، ۱۹۸۵ء

"مولانا کا بحیثیت ماہر تعلیم جائزہ لیا گیا ہے۔"

۲۵۱۔ فدا حسین۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔

الہ آباد، فدا حسین خاں، ۱۹۵۸۔

"مولانا آزاد کی سوانح حیات۔"

۲۵۹۔ گاندھی (راج موہن)

ایٹ لائیوز : اے اسٹڈی آف دی ہندو مسلم این کاونٹر۔

نئی دہلی، رولی بکس انٹرنیشنل ، ۱۹۸۶ - (انگریزی)

"مولانا کی سوانح حیات"

۲۶۰ مالک رام۔

تذکرۂ معاصرین ۔ ۴ جلدیں ۔

نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ، ۱۹۷۲ تا ۱۹۷۸ء

۲۶۱۔ مجیب (محمد)

دی تذکرہ : اے بیاگرافی اِن سمبلز اِن آزاد میموریل والیوم۔

مرتبہ ہمایوں کبیر

بمبئی، ایشیا پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۵۹ (انگریزی)

۲۶۲۔ مسیح الحسن (سید)

حواشیٔ ابوالکلام آزاد ۔

دہلی ، اردو اکادمی، ۱۹۸۸۔

"مولانا آزاد کے کتب خانہ کی کتب پر مولانا آزاد کے قلم سے حاشیہ آرائی۔ یہ کتابیں عربی، انگریزی، فارسی اور اردو کی ہیں۔ یہ کتابیں آزاد بھون لائبریری میں محفوظ مولانا کے ذاتی ذخیرہ کے تحت موجود ہیں، انھیں پر مولانا کے حواشی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تمام مواد عنوانات مضامین مثلاً فلسفہ و مذہب، ادب و یادداشتیں، تاریخ و جغرافیہ میں منقسم ہیں۔ ہر عنوان مضمون میں کتاب متعلقہ کی تفصیلات، اس کے پس منظر اور مخصوص حصوں پر مولانا کے حاشیے، کتاب کے کونے میں درج ہیں۔"

۲۵۷۔ کبیر (ہمایوں)

مولانا ابوالکلام آزاد۔ اے میموریل والیوم۔

بمبئی، ایشیا پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۹ء

مشتملات:

"۱۔ نہرو: پاسنگ آف اے گریٹ مین ص ۱ تا ۴۔
۲۔ رادھا کرشنن: دی سرچ اینڈ دی اٹین منٹ ص ۵ تا ۷
۳۔ مسلیگ ہن: مائی مٹینگز ود مولانا آزاد ص ۲۲ تا ۲۳۔
۴۔ کرپلانی: دی وائس آف ریزن، ص ۳۰ تا ۳۶۔
۵۔ سیّد محمود: اے ریس پلینڈینٹ پرسنلٹی۔ ص ۳۷ تا ۵۱۔
۶۔ حبیب: دی ریولیوشنری مولانا، ص ۷۹ تا ۱۰۰۔
۷۔ عبداللطیف: این اَنفنشڈ اسٹرپیس۔ ص ۱۱۶ تا ۱۳۳۔
۸۔ مجیب: دی تذکرہ: اے بیاگرافی ان سمبلز، ص ۱۳۱ تا ۱۵۲۔
۹۔ فیضی: دی ری انٹرپرٹیشین آف اسلام ص ۱۵۳ تا ۱۸۱۔
۱۰۔ میکڈونلڈ: مولانا آزاد اینڈ دی اسپیپروز ص ۱۸۲۔ ۱۸۱۔
۱۱۔ راجگوپالاچاری: ٹولیمک ایرر ص ۱۹۴ تا ۱۹۵۔
۱۲۔ چاگلہ: دی کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا، ص ۱۹۶ تا ۲۰۰
۱۳۔ تاراچند: انڈیا اینڈ دی ویسٹ۔ ص ۲۲۱ تا ۲۴۰۔ وغیرہ"

۲۵۸۔ کمار (ایچ ایل)

اپوسل آف یونیٹی: بیاگرافیکل اسٹڈی آف مولانا ابوالکلام آزاد۔

لاہور، ہیرو پبلی کیشنز، ۱۹۴۴۔ (انگریزی)

"اسکولی بچّوں کے لیے مولانا آزاد کی مختصر سوانح عمری"

۱۸ اٹھ ڈیتھ اینی ورسری ۔ ۲ر فروری ۱۹۷۶ ۔
لکھنؤ ، مولانا آزاد میموریل اکیڈمی، ۱۹۷۶ء ۔
"ایک ترقی پسند دانشور کی حیثیت سے مولانا آزاد کا تنقیدی مطالعہ"

۲۶۸۔ معین شاکر۔

آزاد، اسلام اور نیشنلزم

نئی دہلی، قلمکار پرکاشن ، ب ت ۔ (انگریزی)
"مولانا آزاد کے مذہبی و سیاسی افکار و فلسفہ کا تنقیدی جائزہ"

۲۶۹۔ معین شاکر۔

خلافت ٹو پارٹیشن

نئی دہلی ، قلمکار پرکاشن ، ۱۹۷۰ ۔ (انگریزی)
" خلافت کی تحریک سے لے کر تقسیم ہند تک کی قومی تحریک آزادی کا مطالعہ بشمول تذکرہ مولانا آزاد"

۲۷۰۔ منولٹ (گیل)

دی خلافت مومنٹ

نیویارک، کولمبیا یونی ورسٹی پریس ، ۱۹۸۲ ۔
"تحریک خلافت میں مولانا آزاد کے رول کا تذکرہ"

۲۷۱۔ نظامی (خلیق احمد)

مولانا آزاد البم

دہلی ، ادارۂ ادبیات دلی ، ۱۹۸۸ ۔ (اردو/انگریزی)
" مولانا کی صدسالہ تقریبات پر ایک البم شائع کی گئی ۔ یہ تصاویر، فوٹوؤں،

۲۶۳۔ منظور احمد (ملک زادہ)

غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ

لکھنؤ، مکتبۂ دین و ادب / ۱۹۷۶۔

"مولانا آزاد کی کتاب غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ"

۲۶۴۔ منظور احمد (ملک زادہ)۔

مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینہ میں

لکھنؤ، NP، ۱۹۷۲۔

"الہلال میں مولانا کی تحریروں کا ادبی جائزہ"

۲۶۵۔ منظور احمد (ملک زادہ)

مولانا ابوالکلام آزاد: فکروفن۔

لکھنؤ، نسیم بکڈپو، ۱۹۶۹ء

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تنقیدی جائزہ۔ ۱۹۷۸ء میں ری پرنٹ شائع ہوا"

۲۶۶۔ مدنی (حسین احمد)

نقشِ حیات۔ ۲ حصے۔

دیوبند، مکتبہ دینیات، ۵۳۔ ۱۹۳۳۔

"حصہ ا (۱۹۳۳)، حصہ ۲ (۱۹۵۳) میں علاحدہ سے مولانا آزاد کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر"

۲۶۷۔ مشیر الحق۔

مولانا ابوالکلام آزاد، اے ریوے لیوشنری عالم اِن مولانا آزاد :

حصّہ دوم

رسائل وجرائد سے ماخوذ مضامین واداریے

اسکیچوں، ڈایاگراموں اور مولانا کے اقوال وتحریرات دوسرے ادیبوں کے مضامین سے ماخوذ تراشے جو مولانا آزاد اور ان کے خاندان کے بہت قریب تھے، کا خوبصورت گلدستہ ہے۔"

۲۷۲۔ نظامی ظفر احمد۔
مولانا آزاد کی کہانی۔
نئی دہلی، مکتبہ پیام تعلیم، ۱۹۸۸۔
"بچوں کے لیے مولانا آزاد کی سوانح حیات۔"

۲۷۳۔ نواتی دیو۔
مولانا ابوالکلام آزاد۔
حیدر آباد سندھ، قومی ساہتیہ دل، ب ت۔ (سندھی)
"سندھی زبان میں مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ۔"

۲۷۴۔ ہارڈی پیٹر
پارٹنرز ان فریڈم اینڈ ٹرو مسلمز : دی پولیٹیکل تھوٹس آف سم مسلم
اسکالرز ان برٹش انڈیا ۱۹۴۷ - ۱۹۱۲
اسکنڈی نیویا اسکنڈی نیوین انسٹی ٹیوٹ آف لٹریچر، ۱۹۷۱۔ (انگریزی)
"مولانا آزاد کی سیاسی وقومی خدمات کا تذکرہ۔"

۲۷۵۔ ہان، ارنیسٹ ایچ
مولانا ابوالکلام آزادس کنسیپٹ آف ریلی جن اینڈ ریلی جیئس بلیف اکارڈنگ ٹو ہز ترجمان القرآن۔ (انگریزی)
"غیر مطبوعہ مسودہ، ایس ٹی ایم تھیسس، مانٹریل، میکگل یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۵۔ (انگریزی)

۲۷۶۔ آج کل (دہلی) (ماہنامہ) (اردو)

مولانا آزاد نمبر، جلد۔ ۴۷ (۴) نومبر ۱۹۸۸ء

۲۷۷۔ آج کل (دہلی) (ماہنامہ) (اردو)

ابوالکلام نمبر۔ ج ۱۷ (۱)، اگست ۱۹۵۸۔

۲۷۸۔ آر۔ وی راجیولاوڈ آزادس رول۔ ٹریبیون (چنڈی گڑھ)

۱۳ر نومبر ۱۹۸۸۔ (انگریزی)

"وگیان بھون میں مولانا آزاد کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں شری وینکٹ رمن اور شری راجیو گاندھی نے اپنی تقاریر میں مولانا آزاد کو ایک زبردست سیکولر نواز بتایا تھا، اس کے بارے میں پریس رپورٹ"

۲۷۹۔ آزاد (جگن ناتھ)

مولانا آزاد کا شعری ذوق۔ قومی راج (بمبئی) ۱۳ر (۱۴) ۱۰ر ستمبر ۱۹۸۷ ص ۱۸۔ ۱۳

"مولانا آزاد کی شاعری پر مختلف حوالوں کے ذریعہ تبصرہ"

۲۸۰۔ ابوالحسن علی ندوی

مولانا آزاد۔ قومی آواز (دہلی) ۲۱ر فروری ۱۹۸۸۔ ایک صفحہ۔

"مضمون نگار نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر کیا ہے اور مولانا کی شخصیت، کردار اور ادبی مرتبہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے"

۲۸۱۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔

الہلال (کلکتہ)، تاریخ خصائص و مقاصد اور فن کی روشنی میں۔

۲۸۶۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔
ہندوستان میں تاریخ ودعوت اسلام کا ایک باب : مولانا آزاد
اور تحریک نظم جماعت۔
برہان (دہلی)،
(۳) ۶۵، ستمبر ۱۹۷۰، ص ۱۵۳ تا ۱۷۷۔
"مصنف نے مولانا کی اسلام بالخصوص اتحاد قومیت اور اتحاد قیادت کی تعلیم کے حوالے
سے بحث کی ہے۔"

۲۸۷۔ اخلاق حسین قاسمی۔
وحی نبوت کے تصور میں : سرسید اور مولانا آزاد کا اختلاف۔
برہان (دہلی)، (۳) ۱۰۰، ستمبر ۱۹۸۷، ص ۱۷۷ تا ۱۸۰۔
"ترجمان القرآن پر مضمون نگار کا تبصرہ۔ اس میں مولانا آزاد اور سرسید احمد خاں
کے اختلافاتِ رائے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔"

۲۸۸۔ اردو ادب (علی گڑھ) (کوارٹرلی) (اردو)
"آزاد نمبر، جلد ۸، ۱۹۸۹۔"

۲۸۹۔ اسٹیٹسمین
پٹیل ٹرنڈا اگینسٹ گاندھی جی : آزاد اسٹیٹسمین
(دہلی)، ۸ر نومبر ۱۹۸۸ (انگریزی)۔
"انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات والے مواد کی اشاعت کے متعلق پریس رپورٹ۔"

۲۹۰۔ اصلاحی (ضیاالدین)۔
مولانا ابوالکلام آزاد اور قومی جدوجہد۔ معارف (اعظم گڑھ)، (۴)

۲۸۱۔ جامعہ (دہلی)۔ (۲) ۵۸ فروری ۱۹۸۸ ص ۱۰۰ تا ۱۱۴۔
"اخبار الہلال کی اشاعت کا مقصد و تاریخ۔"

۲۸۲۔ ابو سلمان شاہجہانپوری
مولانا ابوالکلام آزاد۔ ندائے ملت (لکھنؤ) ۴۲ (۴۱) ار نومبر ۱۹۸۷ ص ۳، ۴۔
"مولانا کی صحافتی زندگی پر ایک نظر۔"

۲۸۳۔ ابو سلمان شاہجہانپوری۔
مولانا ابوالکلام آزاد پر پہلی کتاب۔ معارف (اعظم گڑھ)، (۴) ۹۹،
اپریل (۱۹۶۷)، ص ۲۰۵ تا ۲۹۵۔
"امام الاحرار" اور "مولانا ابوالکلام آزاد پر تبصرہ۔"

۲۸۴۔ ابو سلمان شاہجہانپوری۔
نقوش امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان میں۔ اردو ادب (دہلی) ۱۹۶۴۔
ص ۱۴۸ تا ۱۵۹۔
"مضمون نگار نے بتایا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد مولانا آزاد کی اہمیت کا اندازہ پاکستان میں بالکل نہیں تھا لیکن ۱۹۶۴ء میں جب مولانا کے بارے میں متعدد مضامین شائع ہوئے تو پاکستان میں ان کے علم و فضل کی قدر و قیمت پہچانی گئی۔"

۲۸۵ ابو سلمان شاہجہانپوری۔
نقوش امام الہند اور رسالے۔ (اردو ادب (دہلی) ۱۹۶۷
ص ۵ تا ۳۲۔

"مولانا آزاد پر تحقیق کرنے کے لیے ایک اہم ماخذ۔"

۲۹۵- انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی)

آزاد پیپرس پین فل ڈس کلوزرس : ایکسٹریکٹس نئی دہلی، انڈیا ٹوڈے، ۱۹۸۸ - (انگریزی)

"انڈیا ٹوڈے مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۸ پر مولانا آزاد کی کتاب کے مشہور تیس صفحات پر تبصرہ"

۲۹۶- انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

برتھ سینٹی نری سیلی بریشن آن نومبر ۱۱، انڈین ایکسپریس (دہلی)، ۶ر نومبر ۱۹۸۸ - (انگریزی)

"۱۱ر نومبر کو وگیان بھون میں آزاد کی ولادت کی صدسالہ تقریبات منعقد ہونے کے بارے میں ایک پریس رپورٹ"

۲۹۷- انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

ریمارکس اگینسٹ نہرو ان آزاد پیپرس۔ انڈین ایکسپریس (دہلی)، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۸ - (انگریزی)

"انڈیا ونس فریڈم کے تیس ۳۰ صفحات کے ناشر کا بیان"

۲۹۸- انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

کریٹیکل ریفرنس آف پٹیل ان آزاد پیپرز۔ انڈین ایکسپریس (دہلی) ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ - (انگریزی)

"رابندر ناتھ رائے، ہمایوں کبیر کے اسٹاف میں تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے ہی انڈیا ونس فریڈم کے مسودہ کو ٹائپ کیا تھا۔ پریس کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے تیس صفحات کے مشتملات کے انکشاف کرنے کی کوشش کی"

۱۴۳، اپریل ۱۹۸۹، ص ۳۰۲ تا ۳۱۳ -
"جنگ آزادی میں مولانا آزاد کی خدمات کا جائزہ۔"

۲۹۱- اقبال مسعود-
پارٹیشننگ بلیم: پرسنل ویو پوائنٹ۔ انڈین ایکسپریس (دہلی) ۲۰، نومبر
۱۹۸۸- (انگریزی)
"برطانوی حکومت کے گھناؤنے رول کی وجہ سے تقسیم ہند کے ناگزیر حالات پر
اظہار خیال۔"

۲۹۲- الجمعیۃ (دہلی) (روزانہ) (اُردو)
"آزاد نمبر، ۴ر دسمبر ۱۹۵۸۔"

۲۹۳- اُمید ادیبی-
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ قومی راج (بمبئی) (۲۳) ۹،
۲۵ر دسمبر ۱۹۸۲، ص ۱۲ تا ۱۶-
"مولانا آزاد کی سوانح حیات۔"

۲۹۴- انجنیئر (اصغر علی)
تھیولوجیکل کریٹیویٹی آف ابوالکلام آزاد۔
انڈین لٹریچر (دہلی) (۴) XXXI، جولائی- اگست ۱۹۸۸، ص ۱۰ تا ۲۹۔
"مولانا آزاد کی سالگرہ منانے کے لیے ساہتیہ اکادمی نے اگست ۸۸ء میں ایک
سیمی نار کیا تھا اس سیمی نار کا یہ ایک مقالہ ہے۔ مضمون نگار نے اس میں مولانا کی دینی
خلاقیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔"

۳۰۴ **ایشیا** (دہلی) (ہفتہ وار) (اردو)
"آزاد ایڈیشن، ۳ر مارچ ۱۹۶۱ ۔"

۳۰۵۔ **برنی ڈاؤٹس آزادس آتھرشپ** ۔ ہندوستان ٹائمز (دہلی)،
۲۸ر نومبر ۱۹۸۸۔ (انگریزی)
"ایران سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ مولانا آزاد صد سالہ تقریبات ولادت کے افتتاحی جلسہ میں دیے گئے مسٹر ایس ایم ایچ برنی، چیرمین، مائنرٹیز کمیشن کے خطبہ کی پریس رپورٹ۔"

۳۰۶ **پرتاپ** "تیس صفحات کی اشاعت مولانا نے نہیں روکی تھی" پرتاپ (دہلی)
۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۸۔
"مولانا کے سکریٹری ایم۔ این مسعود کا وضاحتی بیان۔"

۳۰۷۔ **پرتاپ** (نئی دہلی)
مولانا آزاد کی کتاب اردو سے ترجمہ نہیں بلکہ اوریجنل تھی۔ پرتاپ (دہلی)، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۸۔
"انڈیا ونس فریڈم میں تیس سال بعد تیس صفحات کی شمولیت پر رائے کا پریس انٹرویو۔"

۳۰۸۔ **پرتاپ**
مولانا کتنے سچّے تھے اور کتنے... پرتاپ (دہلی)، ۲۴ر تا ۲۸ر نومبر ۱۹۸۸ ۔
"تازہ انکشافات کی روشنی میں مولانا آزاد کے بارے میں ایک مخصوص اخبار کی رائے۔"

۳۰۹ **پرتاپ** **مولانا کے الزامات** ۔ پرتاپ (دہلی)، ۱۲ر نومبر ۱۹۸۸۔ (اردو)۔

۲۹۹۔ انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

گورنمنٹ آسکڈ ٹو ٹیک اوور آزاد برتھ پلیس۔ انڈین ایکسپریس (دہلی)، ۲۵ر نومبر ۱۹۸۸۔ (انگریزی)

"ممبران پارلیمنٹ نے مولانا آزاد کی جائے پیدائش پر اظہار تشویش کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ اس کو نیشنل یادگار قرار دیا جائے اور اس کو حکومت اپنے اختیار میں لے لے۔"

۳۰۰ انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

لیگ بڈ ٹو سلی کانگریس امیج۔ انڈین ایکسپریس، (دہلی)، ر نومبر ۱۹۸۸۔ (انگریزی)

"انڈیا ونس فریڈم میں تیس صفحات کی اشاعت کے بارے میں پریس رپورٹ۔"

۳۰۱۔ انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

مولانا آزاد ایسے کمپٹیشن۔ انڈین ایکسپریس (دہلی)، ۱۱ر نومبر ۱۹۸۸، (انگریزی)

"آئی سی سی آر کے زیر اہتمام مولانا آزاد مضمون نگاری کے مقابلہ کے سلسلے میں اعلان کی رپورٹ۔"

۳۰۲۔ انڈین ایکسپریس (نئی دہلی)

نہروز اسٹیٹ منٹس کنٹری بیوٹیڈ ٹو پارٹیشن۔ انڈین ایکسپریس (دہلی)، ۱۵ر نومبر ۱۹۸۸۔ (انگریزی)

۳۰۳ **ایوان اردو** (دہلی) (ماہنامہ) (اردو)
"آزاد نمبر جلد ۳ (۸) ۱۹۸۸۔"

۲۹ر نومبر ۱۹۸۸ء
"مصنف نے انڈیا ونس فریڈم کے مشکوک مصنف کے نظریے سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ملک کی تقسیم ناگزیر تھی جس کی تمام ذمے داری برطانوی حکومت کی ہے۔"

۳۱۶۔ چٹان (لاہور) (ہفتہ وار) (اردو)
"آزاد نمبر، جلد ۱۸، ۱۵ر فروری ۱۹۶۵"

۳۱۷۔ چیمپئینڈ یونیٹی: ٹائمز آف انڈیا (دہلی) ۱۵ر نومبر ۱۹۸۸
(انگریزی)
"مولانا آزاد کی صدسالہ تقریبات منعقدہ وگیان بھون کی رسم افتتاح کی پریس رپورٹیں۔"

۳۱۸۔ حسن نجمی۔
مولانا آزاد پر سہ روزہ سیمینار۔ ہماری زبان (دہلی) (۲۲) ۴۴
۱۵ر نومبر ۱۹۸۰، ص ۸ تا ۱۰۔
"اردو اکادمی دلی کے زیر اہتمام منعقدہ ۳ روزہ سیمینار۔"

۳۱۹ حسین امین۔
مولانا آزاد اور لکھنو کا خمیرہ۔ قومی آواز (دہلی)، (۴۳)
۲۱ر فروری ۱۹۸۸، ص ۳۔
"مولانا آزاد کا محبوب شوق پان چبانا تھا۔ اس مضمون میں یہی بتایا گیا ہے۔"

۳۲۰۔ حسین امین۔
ہسٹورین ریفیوٹس آزادس کنٹینشن۔ ہندوستان ٹائمز،

"انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کے مضمون پر اخبار کا اداریہ"

۳۱۰۔ پندرہویں صدی (دہلی) (ماہنامہ) (اُردو)

"آزاد نمبر، جلد ۹ (۱) جنوری ۱۹۸۹ء"

۳۱۱۔ ٹائمز آف انڈیا۔ (نئی دہلی)

مولانا کا مزار۔ ٹائمز آف انڈیا، (دہلی) ۲۷ راکتوبر ۱۹۸۸ء

(انگریزی)

"آرکیٹیکٹ حبیب الرحمٰن نے جامع مسجد دہلی کے قریب واقع مزار مولانا آزاد کی زبوں حالی پر اظہارِ خیال کیا۔"

۳۱۲۔ جامعہ (دہلی) (ماہانہ) (اُردو)

"آزاد نمبر، جلد ۴۸ (۳) مارچ ۱۹۶۳ء"

۳۱۳۔ جمہور (علی گڑھ) (پندرہ روزہ) (اُردو)

"آزاد نمبر، جلد (۵ اور ۶)

۱۶ر فروری ۱۹۶۰، (۱۵ شمارے ماہانہ)"

۳۱۴۔ جن ستّا (نئی دہلی)

سات نومبر کو کھلے گا ۳۰ پیجوں کا رہسیہ۔ جن ستّا (دہلی)

۲۵ راکتوبر ۱۹۸۸ - (ہندی)

"۳۰ صفحات کے بارے میں انکشاف کی اطلاع۔"

۳۱۵۔ جوہر (جے ایس)۔ تقسیم کا ذمّے دار کون؟ قومی آواز (دہلی)،

مضمون میں مصنّف نے اپنے شبہات اور نتائج کے جواز پیش کیے ہیں۔"

۳۲۵۔ دتّا (وی این)۔
ایونٹس لیڈنگ ٹو پارٹیشن۔ ٹائمز آف انڈیا۔ ۱۲ اور ۱۲ دسمبر
۱۹۸۸۔ (انگریزی)

۳۲۶۔ دتّا (وی این)۔
تیس صفحات کا فیصلہ خود آزاد کا تھا۔ (دہلی) (۲۲) ۴۴ ۱۵ /نومبر ۱۹۸۰ء
ص ۸ تا ۱۰۔
"کتاب انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کی اشاعت کے لیے فیصلہ کے متعلق ایک بیان۔"

۳۲۷۔ ذاکر حُسین
مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت۔
جامعہ (دہلی)، ۸۵ (۲) فروری ۱۹۸۸، ص ۱۱ تا ۱۴
"مولانا آزاد کے ساتھ اپنے روابط کی روشنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا کی زندگی کے
مختلف پہلوؤں، پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ذاکر حسین کے سابقہ مطبوعہ مضمون کی تلخیص ہے۔"

۳۲۸۔ ذکی ایم قاسم۔
مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو۔ قومی آواز (دہلی) ۲۴ /فروری
۱۹۸۶ ؛ ص ۳ تا ۶۔
"اُردو زبان کی حمایت میں مولانا کی کوششیں۔"

۳۲۹۔ رشید الدّین خاں۔
مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ - ۱۹۸۸) مین اسٹریم (دہلی)، سالانہ،
نمبر ۸، اکتوبر ۱۹۸۸، ص ۳۷ تا ۳۸ اور ۱۸۰ (انگریزی)

(دہلی) ، ۱۵ر نومبر ۱۹۸۸ ۔
"انڈیا ونس فریڈم کے ۳۰ صفحات کے بارے میں اخباری رپورٹ ۔"

۳۲۱۔ خالد محمود ۔
مولانا آزاد بحیثیت صحافی ۔ ندائے ملّت (لکھنؤ)
(۱۸) ۴۳ ، ۱۵ر مئی ۱۹۸۸ ۔ ص ۲۱ تا ۲۲ ۔
"مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات ۔ خاص طور پر ان کی صحافیانہ خوبیوں کا تذکرہ ہے۔"

۳۲۲۔ دتّا (انورادھا)
دی آزاد پیپرز ۔ السٹریٹڈ ویکلی (بمبئی) ۱۳ - ۶ مارچ
۱۹۸۸ ، ص ۸ تا ۱۷ ۔ (انگریزی)
"مصنّف نے مولانا آزاد کے تیس ۳۰ صفحات کے شدید تنازعہ پر اظہار خیال کیا ہے۔"

۳۲۳۔ دتّا (وی این)
آزاد : فائنل لک ایٹ فائنل فیز ۔ ٹریبیون (چنڈی گڑھ)
۲۷ر نومبر ۱۹۸۸ ۔ (انگریزی)
"مولانا کے متعلق جامع مضمون کا تیسرا حصّہ ۔" سابقہ حصّے ۳۱ر جولائی اور ۷ر اگست کے ٹریبیون میں شائع ہوئے تھے ۔ یہ مضامین انڈیا ونس فریڈم کے بارے میں تنازعہ پر روشنی ڈالتے ہیں ۔"

۳۲۴۔ دتّا (وی این)
آزاد پیپرز ۔ ٹائمز آف انڈیا ۔ (دہلی) ۲۴ر اکتوبر
۱۹۸۸ ۔ (انگریزی)
"انڈیا ونس فریڈم" کے مصنّف کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ اِس

۳۳۳۔ سلیمان صابر۔
مولانا آزاد: شخصیت، ادب اور صحافت۔ قومی آواز (دہلی)،
۵ر مارچ ۱۹۸۶، ص ۳۔
"مولانا آزاد کی ادبی و صحافتی خدمات کا تذکرہ۔"

۳۳۴۔ شاہراہ (دہلی) (ماہنامہ) (اردو)
"آزاد نمبر، فروری۔ مارچ ۱۹۵۹۔"

۳۳۵۔ شرما (شنکر دیال)
مولانا آزاد۔ ذہانت کا منبع۔ قومی آواز (دہلی)،
۸ر فروری ۱۹۸۹۔
"کتاب مولانا آزاد کی کہانی کی رسم اجراء پر نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے مولانا آزاد کی شخصیت اور نظریۂ حیات پر تقریر فرمائی۔"

۳۳۶۔ شروانی (ریاض الرحمٰن)۔
مولانا آزاد کی ادبی حیثیت کا تجزیہ۔ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)،
۱۹۵۹، ص ۱۰۴ تا ۱۱۸۔
"مولانا آزاد کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ۔"

۳۳۷۔ شہاب الدین دسنوی۔
انجمن اسلام: تحریک۔ آج کل، (دہلی)، اکتوبر ۱۹۸۱،
ص ۱۵، ۲۲، ۴۵۔

۳۳۸۔ شیخ (ایم ایچ)۔
مولانا آزاد: صفِ اوّل کے سیاستدان۔ قومی راج۔

"ایک عظیم مجاہدِ وطن مولانا ابوالکلام آزاد کا خاکہ۔ مولانا کی سوانح اور نظریات کے چار اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ (۱) ہندو مسلم اتحاد (۲) آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے لیے تحریک خلافت (۳) ترکِ موالات اور مذہبی تقاضہ کے طور پر برطانوی اشیاء کا مسلمانوں کے ذریعہ بائیکاٹ (۴) ایک مخلوط قومیت کی تعمیر مسلمانوں کی ذمّے داری کی حیثیت سے۔"

۳۳۰۔ رضوی (خورشید مصطفیٰ)
مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت۔ قومی آواز (دہلی)، (خصوصی نمبر)، ۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ء۔
"اس مضمون میں مولانا آزاد کی جنگِ آزادی میں شمولیت اور اُن کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"

۳۳۱۔ رفیع اللہ۔
اسلامی قانون مولانا آزاد کی نظر میں۔ برہان (دہلی)، (۲) ۴۵ اگست ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۷ تا ۱۲۲۔
"شریعت اور قانون کے مابین جو خطِ امتیاز ہے اور مولانا کا نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔"

۳۳۲۔ سرور (اے اے)
لٹریری کنٹری بیوشن آف مولانا آزاد۔ انڈین لٹریچر (دہلی) (۴) XXXI، جولائی۔ اگست ۱۹۸۸ء، ص ۵ تا ۱۶۔ (انگریزی)
"مولانا آزاد کی صد سالہ تقریبات منانے کے لیے ساہتیہ اکادمی نے اگست ۱۹۸۸ء میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس مضمون میں مولانا کی ابتدائی نگارشات کے علاوہ جو کہ عربی سے بیحد متاثر تھیں بعد کی تقریروں اور تحریروں کا جو بہت سادہ اور سلیس زبان میں تھیں، جائزہ لیا ہے۔"

۲۰ نومبر ۱۹۸۸ء۔
"مولانا کی انفرادی شخصیت کی خوبیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔"

۳۴۵۔ عالم (ایم)۔
مولانا ابوالکلام آزاد : ایک ہمہ گیر شخصیت۔
دلّی (دہلی)، اپریل۔ستمبر ۱۹۸۸، ص ۱۲ تا ۱۵
"مولانا آزاد کا سوانحی خاکہ۔"

۳۴۶۔ عبداللہ (یو)۔
دی آزاد پیپرز۔ مسٹری ان ریویلڈ ہندو (دہلی)،
۲۷ نومبر ۱۹۸۸ء۔ (انگریزی)
"مولانا کی کتاب انڈیا ونس فریڈم، اشاعت ۱۹۸۸ء کے مکمل متن پر مفصّل رائے زنی۔"

۳۴۷۔ عبداللہ (یو)
غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال۔ بُرہان۔ (دہلی) (۴) ۴۴۔
اپریل ۱۹۶۰، ص ۲۲۹ تا ۲۵۶۔
"مولانا آزاد کی دونوں کتابوں کا جامع مطالعہ۔"

۳۴۸۔ عبدالقوی دسنوی۔
مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار پیغام۔
آج کل (دہلی) (۵) ۴۳، دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۵۰ تا ۵۸۔
"مولانا بحیثیت صحافی اور ان کا رسالہ پیغام۔"

۳۴۹۔ عبداللطیف اعظمی۔
ابوالکلام آزاد: تاریخی غلطیاں۔ آج کل (دہلی) (۳) ۹۴،

۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ ، ص ۷۷ تا ۷۸ ۔
"مولانا آزاد کی خدمات اور صحافت کا تجزیہ۔"

۳۳۹۔ صبا (حیدرآباد) (ماہنامہ) (اردو)
"آزاد نمبر، جلد ۵ (۲ اور ۳) ۱۹۵۹۔

۳۴۰۔ صباح الدین عمر۔
مولانا آزاد کو رسوا کرنے کی سازش۔ ہماری زبان
(دہلی) ، ۴۷ (۶) ، ۸ فروری ۱۹۸۸ ، ص ۳ ۔
"ملک زادہ منظور احمد کی دو کتابوں (۱) مولانا ابوالکلام آزاد : فکر و فن اور (۲) مولانا آزاد الہلال کے آئینے میں کے تبصروں اور مولانا کی تقریروں کا تنقیدی جائزہ۔"

۳۴۱۔ صبح (دہلی) (کوارٹرلی) (اردو)
"مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ ۱۹۷۰۔"

۳۴۲۔ صدیقی (رشید احمد)
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ علی گڑھ میگزین (علیگڑھ)، ۱۹۵۹،
ص ۱ تا ۱۴ ۔
"ایک سوانح حیات۔"

۳۴۳ صدیقی (عتیق)
الہلال کا انڈیکس۔ اُردو ادب (دہلی) ۲، ۱۹۶۱ ص ۱۳۲-۱۴۸

۳۴۴۔ صدیقی (عشرت علی)
مولانا آزاد : تاریخی شخصیت۔ قومی آواز (دهلی)،

۳۵۴ عثمانی (نجم جاوید)۔
مولانا ابوالکلام آزاد۔ قومی آواز (دہلی)، ۲۰ر نومبر ۱۹۸۸۔
" ہندوستانی سیاست میں مولانا کی شخصیت اور خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔"

۳۵۵۔ علوی (توصیف)
مولانا ابوالکلام آزاد : ایک عہد آفرین شخصیت
قومی آواز (دہلی) ۵ر جنوری ۱۹۸۹۔

۳۵۶۔ غفران احمد۔
مولانا ابوالکلام آزاد۔ سب رس۔ (۳) ۴۴، مارچ ۱۹۸۴،
ص ۲۵ تا ۳۱۔
" مولانا کی شخصیت پر تنقیدی مضمون۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور غلام رسول مہر کے خیالات
بھی اس مضمون کا حصہ ہیں۔
" صبح امید کے مارچ کے شمارہ میں یہ دوبارہ شائع ہو چکا ہے۔"

۳۵۷۔ فاروقی (خواجہ احمد)
حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ مبصر، (۹) ۹،
اگست ۱۹۸۱، ص ۹ تا ۱۷۔
" مولانا کی علمیت اور دانشوری کے متعلق ایک مضمون۔"

۳۵۸۔ فاروقی (ضیاءالحسن)
افکار آزاد کی معنویت : آزاد ھند کے مسلمانوں کے لیے۔
اسلام اور عصر جدید (دہلی)، (۱) ۱۸، جنوری ۱۹۸۶۔ ص ۵ تا ۱۲۔
"مسلمانوں کے فلسفہ کا مطالعہ جو بقول مصنف آج بھی ملت اسلامی کے لیے قابل تقلید ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۷ ، ص ۱۵ - ۱۸ - ۲۳ -
"عبدالقوی دسنوی کی کتاب ابوالکلام آزاد پر تبصرہ"

۳۵۰۔ عبداللطیف اعظمی۔
مولانا آزاد کا صد سالہ یوم پیدائش۔ ہماری زبان (دہلی)،
(۴۲) ۴۶ ، یکم نومبر ۱۹۸۷ ، ص ۸
"مولانا کی طرز نگارش پر اظہار خیال اور ان نکات کی نشان دہی جن پر ابھی کام کرنے کی ضرورت ہے"

۳۵۱۔ عبداللطیف اعظمی۔
مولانا ابوالکلام آزاد - جامعہ (دہلی) (۳) ۸۰ مارچ ۱۹۸۳۔ ص ۳۰ تا ۳۴ -
"مولانا آزاد کے سوانح کا تجزیہ"

۳۵۲۔ عبداللطیف اعظمی
مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کے باہمی تعلقات اُن کے خطوط کی روشنی میں۔ جامعہ (دہلی) ۱۹۴۹ (۶) دسمبر ۱۹۶۳۔
ص ۳۱۴ - ۳۲۹

۳۵۳۔ عبداللطیف اعظمی
مولانا ابوالکلام آزاد پر بے بنیاد الزامات - زبان وادب (پٹنہ)، (۲)
۱۲، اپریل - جون ۱۹۸۶ ، ص ۲۴ تا ۳۶ -
"نثار احمد فاروقی کے مضمون شائع ہماری زبان (دہلی) ۱۵ راپریل ۱۹۸۶ کے جواب میں"

۳۶۴۔ فرنٹ لائن (مدراس)

آزاد پیپرس، ٹربلڈ لیگیسی۔ فرنٹ لائن (مدراس)۔ (۵) ۵، ۱۸۔

۵ مارچ ۱۹۸۸ - ص ۱۱۳ تا ۱۱۶ - (انگریزی)۔

" مولانا آزاد کی خود نوشت انڈیا ونس فریڈم کے غیر مطبوعہ حصّوں کے متعلق اختلافات پر حسن سرور کی رپورٹ۔"

۳۶۵۔ فرینک (پٹ سوبر)

اے رپورٹ بائی پاروتھی مینن۔ فرنٹ لائن (مدراس) (۵)

۵، ۵ تا ۱۸ مارچ ۱۹۸۸، ص ۱۱۶ تا ۱۲۰

" مولانا آزاد کی متنازعہ تصنیف انڈیا ونس فریڈم کے تیس ۳۰ صفحات کے بارے میں"

۳۶۶۔ قطبُ اللہ

مولانا آزاد اکیڈمی۔ قومی آواز (دہلی)، ۲۱ر فروری

۱۹۸۸ء ص ۳۔

" مولانا آزاد کی تصانیف کی تعریف اور آزاد میموریل اکادمی کا افتتاح"

۳۶۷۔ قومی آواز

ایوان اردو کا آزاد نمبر قومی آواز (دہلی) ۱۶ر اپریل ۱۹۸۸۔

" آزاد نمبر پر ایک تبصرہ۔"

۳۶۸۔ قومی آواز نئی دہلی)

تیس صفحات کی اشاعت خود مولانا آزاد کی ہدایت پر روکی گئی تھی۔

قومی آواز (دہلی)، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۸۔

" رائے کا بیان جس میں کہا گیا تھا کہ ۳۰ صفحات کی اشاعت روک دی جائے، خود مولانا آزاد

یہ مضمون جامعہ کے فروری ۱۹۸۶ء اور فروری ۸۸ء کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔"

۳۵۹۔ فاروقی (ضیاءالحسن)
شذرات : مولانا آزاد ۔ جامعہ (دہلی) (۲) ۸۳ ، فروری ۱۹۸۶ء،
ص ۳ تا ۶۔
"اس کتاب میں مولانا کی ادبی خدمات اور تاریخ ہند میں ان کے رول کے ساتھ ساتھ مولانا کے خیالات بھی شامل ہیں۔"

۳۶۰۔ فاروقی (عمادالحسن آزاد)
علامہ اقبال اور مولانا آزاد : خطبات اور ترجمان القرآن کی روشنی میں۔
جامعہ (دہلی) ، (۲) ۸۵ ، فروری ۱۹۸۸ ، ص۔ ۷۷ تا ۹۷ ۔
"اقبال اور آزاد کا بحیثیت فلسفی ایک تقابلی جائزہ اور ان کی تقاریر اور ترجمان القرآن کی روشنی میں اسلامیات کے دونوں علماء کا موازنہ۔"

۳۶۱۔ فاروقی (نثار احمد)
مولانا ابوالکلام آزاد : ایک دانشور ۔ قومی آواز (دہلی) ، ۱۶ر نومبر ۱۹۸۸۔
"مولانا آزاد کی زندگی اور علمی کارناموں کا مختصر خاکہ۔"

۳۶۲۔ فاروقی (نثار احمد)
مولانا آزاد کا خاندانی پس منظر۔ ہماری زبان (دہلی) ، (۱۰) ۴۰،
۱۰ر اپریل ۱۹۸۶، ص ۱۔۳۔
"مولانا کے خاندان کے حالات اور اسلاف کا شجرہ۔"

۳۶۳۔ فخرالدین عارف۔
قومی ایکتا کے علمبردار مولانا ابوالکلام آزاد زبان وادب
(پٹنہ) ۔ ۱ (۱۳) ، جنوری ۔ مارچ ۱۹۸۷۔ ص ۱۳ تا ۱۶۔

۳۷۳۔ گوپال سنگھ
این اَن سیملی کنٹروورسی۔ ہندوستان ٹائمز (دہلی) ۲۰ر نومبر ۱۹۸۸ (انگریزی)
"مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کی حالیہ اشاعت پر تنازعہ پر حاشیہ آرائی۔"

۳۷۴۔ ماتھر (گریش)
دی میسیج آف مولانا۔ لنک (دہلی) ۲۸ر فروری ۱۹۸۸، ۸۹، (انگریزی)
"مصنف نے بتایا ہے کہ ہماری جنگ آزادی کس طرح ختم ہوئی اور ملک کے بٹوارہ کے کیا حالات تھے؟"

۳۷۵۔ ماحول (کراچی) (ہفتہ وار) (اردو)
"آزاد نمبر، جلد ۶ (۱۷)، ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۰۔"

۳۷۶۔ مالک رام۔
مولانا ابوالکلام آزاد: پہلے بیس سال۔ تحریر (۱) ۲، ۱۹۶۸، ص ۷۵ تا ۹۷۔
"مولانا آزاد کی زندگی کے ابتدائی بیس سالوں کے حالات۔"

۳۷۷۔ محمد حسن۔
ابوالکلام آزاد اور ہم۔ قومی آواز (دہلی) (۱۰۸) ۸ ۱۹ر اپریل ۱۹۸۸، ص ۳۔
"زندگی کے لیے قابل عمل مولانا کے فلسفہ اور نظریہ کا تجزیاتی مطالعہ۔"

کا فیصلہ تھا۔"

۳۶۹۔ قومی آواز (نئی دہلی)
سربہ مہر پیکٹوں سے مولانا آزاد کے ۳۰ صفحات غائب :
ہمایوں کبیر نے آزاد مسودے میں تغیر و تبدل کر کے نیا مسودہ تیار کیا تھا : جنتا دور میں چرن سنگھ کی ہدایت پر رد و بدل کی گئی تھی۔ قومی آواز (دہلی)، ۱۷/ نومبر ۱۹۸۸ء۔

"انڈیا ونس فریڈم کے ۳۰ صفحات کی اشاعت کے بارے میں چند حقائق کی طرف نشاندہی۔"

۳۷۰۔ قیصر (محمد یوسف)
مولانا ابوالکلام آزاد اور بھوپال۔ آجکل (دہلی)، دسمبر ۱۹۵۸ء۔

۳۷۱۔ کرشنا کانت۔
وھین مولانا آزاد لائٹڈ ٹو دی مہاتما۔ دھلی ریکارڈر
(دہلی)، (۶) ۹، اگست ۱۹۸۸، ص ۴ تا ۶۔ (انگریزی)
"اس میں مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی کے اختلافات کا تذکرہ ہے۔ مہاتما گاندھی کے دوسرے رفقا کے ساتھ بھی مولانا کے اختلافات تھے۔ سدھیر گھوش نے اپنی کتاب گاندھیز ایمی سری میں لکھا ہے کہ مولانا نے کابینہ مشن میں کانگریسی مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلے میں جو بھی لکھا، وہ گاندھی جی کے منشا کے بغیر تھا۔"

۳۷۲۔ کمالی (ایس اے)
ابوالکلام آزاد ز کمینٹری آن دی قرآن۔ مسلم ورلڈ
(ہرٹ فورڈ) (۱) ۴۹، جنوری ۱۹۵۹۔ ص ۵ تا ۱۸۔ (انگریزی)
"مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کا تنقیدی جائزہ۔"

۳۸۳- معارف
شذرات - معارف (اعظم گڑھ)، ۱۹ر نومبر ۱۹۸۸ -
" ۱۹۸۸ء میں مولانا آزاد کی صدسالہ تقریبات ولادت پر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔"

۳۸۴- معین شاکر
غبار خاطر میں مولانا آزاد کی شخصیت - اواز (دہلی)
۴۸ (۱۲) ۱۶ر جون ۱۹۸۳ - ص - ۱۱ - ۱۳
غبارِ خاطر کا تجزیہ

۳۸۵- مکھوپادھیائے (نیلانگن) -
آزاد مزار ریمینس نیگلیکٹیڈ - سنڈے میل، (دہلی)
۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۸ -
" مولانا آزاد کے مزار کے معمار حبیب الرحمٰن نے مزار کی حالت زار کو ۱۵ سال کے بعد دیکھنے پر یہ مضمون لکھا۔"

۳۸۶- ملک حفیظ -
ابوالکلام آزاد ز تھیوری آف نیشنلزم - مسلم ورلڈ،
(ہارٹ فورڈ)، ۵۳ (۱)، جنوری ۱۹۶۳، ص ۳۳ تا ۴۰ (انگریزی)

۳۸۷- ملکانی (کے آر)
ہو واز ٹو بلیم فار پارٹیشن؟ انڈین ایکسپریس (دہلی)
۲۰ر نومبر ۱۹۸۸ (انگریزی)
" نہرو پر لگائے گئے الزامات کا تنقیدی جائزہ اور ان پیچیدہ حالات کا بیان جن کے نتیجہ میں ملک کا بٹوارہ ہوا۔"

۳۷۸۔ مسعود (ایم این)
مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکریٹری۔ قومی آواز (دہلی)
(۱۰۶) ۸، ۱۷ اپریل ۱۹۸۸، ص ۱۲۔
"صدسالہ تقریبات کے لیے تیار کی جانے والی ڈاکومنٹری فلم کو مولانا آزاد کے سیکریٹری
ایم این مسعود نے انٹرویو تھا۔ یہ انٹرویو وہی ہے۔"

۳۷۹۔ مسیح الحسن۔
مولانا آزاد کے قلمی حواشی زیرِ مطالعہ کتابوں پر۔ اسلام اور عصرِ جدید
(دہلی) ۲ رجولائی ۱۹۷۴ء۔ ص۔ ۶۲۔ ۷۰

۳۸۰۔ مُشیرالحسن۔
دی مسلم ماس کونٹیکٹ کیمپین: این اٹیمپٹ ایٹ پولیٹیکل موبلائزیشن
ایکونومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی (بمبئی)
(۵۲) ۲۱، ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶، ص ۲۲-۳ - ۸۲ - (انگریزی)

۳۸۱۔ مظہر حسن۔
مولانا ابوالکلام آزاد: آواز (دہلی)، ۱۶ رنومبر ۱۹۸۶،
ص ۱۱۔
"قومی اتحاد، مقصدِ حیات اور تعلیمی فلسفہ کے حصول میں مولانا کی کوششوں پر مضمون میں
بحث کی گئی ہے۔"

۳۸۲۔ معارف (اعظم گڑھ) (ماہانہ) (اُردو)
"ابوالکلام آزاد نمبر، ۱۹۵۳"

۳۹۳۔ نوبھارت ٹائمز (نئی دہلی)
۷؍ نومبر کو رہسیہ کھلے گا۔ نو بھارت ٹائمز (دہلی)
۲۵؍ اکتوبر ۱۹۸۸۔ (ہندی)
"ایک خبر، ۳۰ صفحات ۷؍ نومبر ۱۹۸۸ کو مشتہر کیے جائیں گے"

۳۹۴۔ نیا دور (لکھنؤ) (ماہنامہ)
"آزاد خصوصی نمبر ۱۴، ۱۵؍ اگست ۱۹۵۹"

۳۹۵۔ نئی دُنیا (دہلی) (روزنامہ) امامُ الہند نمبر ۲۸؍ نومبر، ۱۹۵۸ء

۳۹۶۔ نیشنل ھیرلڈ
آزاد کریٹیکل نو نہرو۔ نیشنل ہیرلڈ (نئی دہلی) ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۸۸۔
(انگریزی)

۳۹۷۔ نیشنل ھیرلڈ۔ (نئی دہلی)
آزاد ایمبا ڈیڈ سیکولرزم۔ نیشنل ہیرلڈ (دہلی) ۱۲؍ نومبر ۱۹۸۸ء
(انگریزی)

۳۹۸۔ وتس (اوینندرا)
دُکھ کی بات میں مزہ۔ نوبھارت ٹائمز (دہلی)
۲۰؍ نومبر ۱۹۸۸ء۔ (ہندی)
"مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم پر ایک تبصرہ"

۳۹۹ ھندوستان ٹائمز (نئی دہلی)
لیگ اسپریڈ لائنز: آزاد۔ ھندوستان ٹائمز (دہلی)،

۳۸۸۔ مہر (غلام رسول)
مولانا ابوالکلام آزاد : مہر کے خطوط شروانی کے نام۔ جامعہ (دہلی)
۲ر فروری ۱۹۲۸ء
"غلام رسول مہر اور شروانی کے درمیان مولانا آزاد کے سلسلے میں خط و کتابت۔"

۳۸۹۔ میسینو (لیو)
مولانا آزاد سے میری ملاقات۔ جامعہ (دہلی)
"لیو میسینو ایشیائی زبانوں کا فرانسیسی اسکالر تھا اور وہ تصوف کا ممتاز اسکالر بھی تھا۔
مولانا آزاد پر اس کے خیالات و تاثرات۔"

۳۹۰۔ نشیط یحییٰ
مولانا آزاد کا مطالعہ کلامۃ الشعرا۔ ہماری زبان (دہلی)
(۱۳) ۴۵، یکم اپریل ۱۹۸۶، ص ۷۔
"مصنف نے اس مضمون میں شعر فہمی کے سلسلے میں ان کے بے مثال حافظہ کی تعریف کی ہے۔"

۳۹۱۔ نقوی (گلزار احمد)
اسلام اور نیشنل ازم: میکنگ آف مولانا۔ پیٹریاٹ (دہلی)
۱۵ر نومبر ۱۹۸۹ء (انگریزی)
"مولانا کی سوانح، اور ان کی شخصیت میں اسلامی و قومی نظریات کا حسین امتزاج۔"

۳۹۲۔ نقوی (گلزار احمد)
مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیت۔ پندرہویں صدی ہجری (دہلی)،
(۹) ا، جنوری ۱۹۸۹، ص ۲۳ تا ۲۴۔
"مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیتوں سے بحث کی گئی ہے۔"

۷ر نومبر ۱۹۸۸ء (انگریزی)
"کتاب انڈیا ونس فریڈم کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی رپورٹ معہ متنازعہ تیس صفحات "

۴۰۔ ہندوستان ٹائمز (نئی دہلی)
ہسٹورین ریفیوٹس آزادس کن ٹینشن ہندوستان ٹائمز (دہلی)
۱۵ر نومبر ۱۹۸۸ء (انگریزی)
"متنازعہ تیس صفحات کے متعلق ایک خبر"